ارضِ اقبال

آفاقیت کے آئینے میں

ڈاکٹر نصیر احمد اسد

ڈاکٹر نصیر احمد اسد

پی ایچ ڈی اردو، یونیورسٹی آف سرگودھا

صدر پنجاب لٹریری فورم پنجاب

مدیر اعلیٰ ''نقش فریادی''

مصنف کی مطبوعات

تاریخ ادبیات سیالکوٹ (ادبی تاریخ)

ارض اقبال آفاقیت کے آئینے میں (تحقیقی مقالات)

کیف دوام (شعری مجموعہ)

کوہساروں کی آگ (ناولٹ)

''ارض اقبال آفاقیت کے آئینے میں'' ڈاکٹر نصیر احمد اسد کے تحقیقی مقالات کا مجموعہ ہے جو ہائر ایجوکیشن کمیشن اسلام آباد، پاکستان کے منظور شدہ ریسرچ جرنلز میں شائع ہو چکے ہیں۔ یہ تحقیقی و تنقیدی مقالات ان کی محنت شاقہ، اردو ادب پر گہری نظر اور خصوصی لگن کے آئینہ دار ہیں۔ ان مقالات میں مستقبل کے ایک محقق اور نقاد کا عکس جھلک رہا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ ادب سے ان کا گہرا شغف بہت جلد انہیں ادبی دنیا کے بام عروج پر پہنچا دے گا۔ میں انہیں ان تحقیقی مضامین کی اشاعت پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

ڈاکٹر عبدالرؤف پاریکھ

ڈائریکٹر جنرل ادارہ فروغ قومی زبان

اسلام آباد، پاکستان

9 786277 680091

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

ارضِ اقبال
آفاقیت کے آئینے میں

ڈاکٹر نصیر احمد اسد

2023

ASIAN RESEARCH INDEX

سلسلہ اشاعت: 117
تاریخ اشاعت: مئی 2023
قیمت: =/1000 روپے

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں:

نام کتاب: ارضِ اقبال آفاقیت کے آئینے میں
مصنف: ڈاکٹر نصیر احمد اسد
کمپوزنگ: کومل شہزادی
تزئین: علی حسن زیدی
پروف: ڈاکٹر عبدالمنان چیمہ
اہتمام: پنجاب لٹریری فورم، پنجاب
ISBN: 9786277680091
ARI ID: 1688388584597

Licensed under a Creative Commons Attribution 4.0 International License.

اِنتساب

ماہر تعلیم

اپنی رفیقہ حیات

آسیہ خانم

اور

پیارے بیٹوں

عمر، حارث، حسن، احمد

کے نام

فہرست

✍}۔	پہلی بات	(ڈاکٹر نصیر احمد اسد)	📖06
✍}۔	چند باتیں	(ڈاکٹر غلام عباس گوندل)	📖07
✍}۔	حرفِ آغاز	(ڈاکٹر یوسف خشک)	📖08
✍}۔	حرفِ تمنا	(ڈاکٹر سید عامر سہیل)	📖09
✍}۔	حرفے چند	(ڈاکٹر محمد افضل صفی)	📖10

---

1)۔	سیالکوٹ میں اردو شاعری کا ارتقاء (۱۹۴۷ء تا ۲۰۱۰)	📖11
2)۔	سیالکوٹ میں صوفیانہ شاعری کی روایت	📖40
3)۔	اثر صہبائی کی ادبی خدمات	📖57
4)۔	آسی ضیائی رامپوری بطور اقبال شناس	📖71
5)۔	اقبال شناسی کے تناظر میں فیض اور جابر علی سید کا اختصاصی مطالعہ	📖85
6)۔	امین حزیں سیالکوٹی۔ اقبالؒ کا ایک معنوی شاگرد	📖96

7)۔ ڈاکٹر عبدالحمید عرفانی کی اقبال شناسی پر ایک نظر 111
8)۔ ریاض حسین چودھری۔ایک نعت گو شاعر 120
9)۔ طفیل ہوشیار پوری کی قومی و مذہبی شاعری پر ایک نظر 132
10)۔ علامہ اقبال اور دیگر ادبی مشاہیر کی رثائی شاعری 142
11)۔ سیالکوٹ میں اردو غزل (اقبال سے صابر ظفر تک) 153
12)۔ مولانا ظفر علی خان کی ادبی خدمات 178
13)۔ مولوی ابراہیم میرؒ سیالکوٹی کی ادبی خدمات 190
14)۔ مولوی فیروز الدین ڈسکوی کی ادبی خدمات 202
15)۔ علامہ اقبال اور دیگر ادبی مشاہیر کی شاعری میں نعتیہ عناصر 214

❖⑤❖⑤❖⑤❖

پہلی بات

سیالکوٹ ایک تاریخی اور ادبی خطہ رہا ہے۔ اس کی تاریخ پانچ ہزار سال پر محیط ہے۔ سیالکوٹ تاریخی، جغرافیائی، ثقافتی، سماجی، تہذیبی، علمی اور ادبی لحاظ سے دوسرے عالمی ادبی شہروں سے کم نہیں۔ سیالکوٹ کو اقبال و فیض کے مولد ہونے کا بھی لازوال فخر حاصل ہے۔ بقول گوپی چند نارنگ:

''بیسویں صدی کے اردو ادب کو سیالکوٹ کھا گیا نصف اوّل اقبال اور نصف دوم فیض''۔

سیالکوٹ کی مٹی بڑی زرخیز اور مردم خیز ہے۔ سرزمین سیالکوٹ نے علم و ادب اور فنونِ لطیفہ کے میدانوں میں گراں قدر خدمات سرانجام دی ہیں۔ داغ دہلوی اور اقبال کے کئی شاگرد سیالکوٹ کے رہنے والے تھے۔ اقبال و فیض کے علاوہ ارض اقبال میں متعدد مشاہیر پیدا ہوئے جن کے شعری و نثری سرمائے میں آفاقی موضوعات، اصناف اور اسالیب موجود ہیں۔ اس طرح خطہء سیالکوٹ کا تخلیقی ادب عالمی ادب کے ہم پلہ ہے۔ راقم الحروف نے اپنی تخلیق بعنوان ''ارضِ اقبال۔ آفاقیت کے آئینے میں'' سیالکوٹ سے منسلک مختلف شعرا و ادبا کی ادبی خدمات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ یہ تحقیقی و تنقیدی جائزہ ادبی خدمات کے علاوہ ادبی رجحانات، ادبی اصناف، اسالیب اور اقبال شناسی کے حوالے سے بھی ہے۔

یہ تصنیف پندرہ مقالات پر مشتمل ہے۔ جس میں حوالہ جات، حواشی اور تعلیقات کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ یہ مقالات ہائر ایجوکیشن کمیشن اسلام آباد، پاکستان کے منظور شدہ ریسرچ جرنلز میں شائع ہو چکے ہیں۔

ڈاکٹر نصیر احمد اسد

سیالکوٹ، پنجاب، پاکستان

چند باتیں

ڈاکٹر نصیر احمد اسد کی تصنیف ''**ارضِ اقبال آفاقیت کے آئینے میں**''، تحقیقی وتنقیدی دونوں پہلو لیے ہوئے ہے۔ تقابلی مطالعے، اسلوبیاتی جائزے، تجزیے اور دیگر تحقیقی موضوعات جہاں اُردو ادب کے منظر نامے کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں، وہاں دوسری زبانوں کے منتخب موضوعات پر سیر حاصل گفتگو سے اردو زبان و ادب کو ایک معنوی وسعت عطا کرتے ہیں۔ سارے مضامین اپنی نوعیت میں تنقیدی ہوتے ہوئے بھی تحقیقی ہیں۔

یہ جو کہا جاتا ہے کہ ''ہر نقاد کے لئے ضروری ہے کہ اس کے اندر ایک محقق بھی ہو، اور ہر محقق کے اندر ایک نقاد ہو''، یہ بات ڈاکٹر نصیر احمد اسد پر پوری اترتی ہے۔ ان کے مضامین میں یہ دونوں ذائقے موجود ہیں اور اس خوبصورتی کے ساتھ کہ یہ احساس نہیں ہوتا کہ تنقید کہاں رک کر تحقیق میں اور تحقیق تنقید میں بدل جاتی ہے۔

ان کی تحریر میں تحقیقی اور تنقیدی دونوں کے اسالیب کا امتزاج موجود ہے۔ اپنے موضوعات کے تنوع کی وجہ سے یہ تخلیق اُردو قاری کے لیے بڑی معنوی وفکری وسعت لیے ہوئے ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر غلام عباس گوندل
ماہر لسانیات، ڈین فیکلٹی آف آرٹس اینڈ ہیومینیٹیز،
یونیورسٹی آف سرگودھا

حرفِ آغاز

ڈاکٹر نصیر احمد اسد کی تصنیف ''**ارضِ اقبال آفاقیت کے آئینے میں**'' کے مقالات جہاں ان کے تحقیقی ذوق کے آئینہ دار ہیں وہیں ان کی تنقیدی بصیرت کے بھی گواہ ہیں۔انہوں نے بنیادی مآخذ سے استفادہ کرتے ہوئے زیرِنظر موضوعات کا نہایت تفصیل کے ساتھ جائزہ لیا ہے۔

ایک بہت بڑی خوبی جو ان مضامین میں از اوّل تا آخر موجود ہے وہ یہ کہ اُنہوں نے محض مشاہیر ادب وتحقیق کی آرا اور فیصلوں کو نقل نہیں کیا بلکہ اپنا نقطہ نظر پیش کیا ہے۔ان کا یہ طالب علمانہ انداز ان کے ان مضامین کو انفرادی رنگ کا حامل بناتا ہے۔تاہم یہ کم خوبی کی بات نہیں کہ زیرِنظر موضوع پر ریسرچ سکالرز کا اپنا نقطہ نظر سامنے آتا ہے۔ان مضامین میں حواشی،حوالہ جات اور تعلیقات کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔اس کے علاوہ مواد،زبان و بیان اور پیش کش کے اعتبار سے یہ مضامین لائق مطالعہ اور قابل تحسین ہیں۔

تحقیقی وتنقیدی دنیا میں ڈاکٹر نصیر احمد اسد پہلی بار''**ارضِ اقبال آفاقیت کے آئینے میں**'' کے ساتھ داخل ہو رہا ہے۔ان کی یہ تازہ کاری،ذوق وشوق اور سعی وکاوش خوش آئند ہے۔ان کے علمی انہماک اور وفورِشوق کے باعث امید کی جاسکتی ہے کہ وہ آئندہ میدان ادب وتحقیق میں اپنے کام کے معیار کو مزید بلندیوں سے ہم کنار کریں گے۔

ڈاکٹر یوسف خشک

چیئرمین اکادمی ادبیات اسلام آباد،پاکستان

حرفِ تمنا

''ارضِ اقبال آفاقیت کے آئینے میں'' ڈاکٹر نصیر احمد اسد کے تحقیقی وتنقیدی مضامین کا اولین تخلیقی مجموعہ ہے۔ اسے ابتدائی کاوش کے نقطہ نظر ہی سے دیکھتے ہیں تو ان کی محنت ولگن اور ادبی ذوق وشوق کی داد دینی پڑتی ہے کہ انہوں نے جس تن دہی سے اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا ہے اسے مدنظر رکھتے ہوئے یہ بات پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ خوب سے خوب کرنے کی جستجو ان کی فطرتِ ثانیہ ہے۔

اس کام کے حوالے سے ایک بات خاص طور پر یہ محسوس ہوئی کہ ان میں سیکھنے کا رویّہ قابل رشک حد تک پایا جاتا ہے اور وہ اپنے آپ کو بہت کچھ سمجھنے کے خبط سے پاک ہیں اور یہ صرف ادب ہی سے خاص نہیں بلکہ زندگی کا کوئی بھی شعبہ ہو ترقی کی بنیاد یہی رویہ ہے۔ چنانچہ جس انداز سے وہ سفر شوق طے کر رہے ہیں امید ہے کہ ایک دن یہ نام ادبی حوالہ ہوگا۔

ان کے مقالات میں تنقیدی اور تقابلی مطالعہ اپنے تہذیبی وثقافتی پس منظر سے اُبھرتا ہے اور وہ افراد اور رویّوں ہر دو میں اشتراکات اور اختلافات اور مستقبل کے امکانات کو اپنی روایت میں شناخت کرتے اور قدر کا تعیّن کرتے ہیں۔

ڈاکٹر سید عامر سہیل

چیئرمین شعبہ اردو، اسلامیہ یونیورسٹی، بہاولپور

حرفے چند

''ارضِ اقبال آفاقیت کے آئینے میں'' ڈاکٹر نصیر احمد اسد کے مختلف تحقیقی وتنقیدی نوعیت کے مضامین پر مشتمل کتاب ہے۔ بیشتر مضامین مختلف تحقیقی وتنقیدی رسائل کی زینت بن چکے ہیں۔ اُنھوں نے جن جن شخصیات پر قلم اٹھایا ہے، ان کے بارے میں معلومات کا ایک ذخیرہ جمع کر دیا ہے۔ جہاں جہاں ضرورت محسوس کی ہے اپنی ناقدانہ رائے کا اظہار بھی بڑی خوب صورتی سے کیا ہے۔

مَیں نے ڈاکٹر نصیر احمد اسد کے مزاج میں ایک خاص بات محسوس کی ہے کہ وہ اپنے کام سے نہایت مخلص ہیں اور اپنی دُھن میں علمی خدمات میں ہمہ وقت مصروف نظر آتے ہیں۔ ان کے اسلوب کی سادگی اور روانی بات کو بوجھل نہیں ہونے دیتی۔ ان مضامین کے مطالعہ سے قاری نہ صرف مختلف شخصیات سے متعارف ہوتا ہے بلکہ ان کی علمی خدمات سے بھی ایک حد تک مستفید ہوتا ہے۔

''مولوی فیروز الدین ڈسکوی'' اور ''مولوی ابراہیم میر سیالکوٹی'' والے مضامین میں مذکورہ شخصیات سے متعلق عمدہ معلومات جمع کی گئی ہیں۔ ان شخصیات کے تعارف کے ساتھ ساتھ ان کی علمی خدمات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اسی طرح ''سیالکوٹ میں اردو شاعری کا ارتقا'' اور ''ریاض حسین چودھری ایک نعت گو شاعر'' میں ناقدانہ انداز نظر سے کام لیا گیا ہے۔ دیگر مضامین بھی اپنی نوعیت کے خوب صورت مضامین ہیں۔ الغرض مذکورہ کتاب ان کی تحقیقی وتنقیدی بصیرت کی آئینہ دار ہے۔

ڈاکٹر محمد افضل صفی

صدر شعبہ اردو گورنمنٹ گریجوایٹ کالج، کروڑ لعل عیسن، ضلع لیہ

سیالکوٹ میں اردو شاعری کا ارتقاء (۱۹۴۷ء تا ۲۰۱۰)

سیالکوٹ ایک تاریخی اور ادبی خطہ رہا ہے۔ اس کی تاریخ پانچ ہزار سال پر محیط ہے ۔ یہ خطہ جغرافیائی لحاظ سے اس مقام پر واقع ہے جہاں کئی آبی گذرگاہیں ہیں۔ کشمیر اور پنجاب کے دیگر تجارتی شہروں سے اس کا قریبی رابطہ ہے۔ سیالکوٹ تاریخی، ثقافتی، سماجی، تہذیبی، علمی اور ادبی لحاظ سے لاہور اور دوسرے ادبی، ثقافتی، تہذیبی، تاریخی اور علمی شہروں سے کسی طور پر بھی کم نہیں۔ اس شہر کی ثقافت توانائی اور رنگارنگی لیے ہوئے ہے۔ یہاں کے میلے ٹھیلے، روایتی تہوار اور دیگر ثقافتی سرگرمیاں اس خطے کو ہمیشہ ممتاز کرتی رہی ہیں۔

سیالکوٹ کو اقبال و فیض کے مولد ہونے کا لازوال فخر حاصل ہے۔ یہ ایک صنعتی شہر ہے۔ اس کی آبادی تقریباً تیس لاکھ سے زیادہ نفوس پر مشتمل ہے سرزمین سیالکوٹ صدیوں کی انسانی تہذیب و تمدن اور ادب و ثقافت کا عظیم الشان گہوارہ ہے۔ اس دھرتی کے تاریخی آثار مدت سے مورخین و ماہرین آثار قدیمہ کی دلچسپی کا سامان بھی رہے ہیں۔ یہاں کی تہذیب ٹیکسلا اور موہنجوڈارو کی تہذیبوں کے ہم پلہ ہے۔

> سیالکوٹ کی مٹی بڑی زرخیز اور مردم خیز ہے۔ سرزمین سیالکوٹ نے علم و ادب اور فنون لطیفہ کے میدانوں میں گراں قدر خدمات سرانجام دی ہیں۔ اس خطے کے باشندوں نے پاکستان کی صنعتی و اقتصادی ترقی کے ساتھ ساتھ علم و فن کی خدمت بھی جاری رکھی۔ ماضی میں ملا کمال کشمیری، ملا عبدالحکیم سیالکوٹی، امین حزیں سیالکوٹی، اثر صہبائی، مرزا ریاض اور غلام الثقلین نقوی نے علمی و ادبی حوالے سے سیالکوٹ کا نام روشن کیا۔ مولوی میر حسن، مولوی ابراہیم میر، ڈاکٹر جمشید راٹھور اور یوسف سلیم چشتی نے علم کی پیاس بجھائی۔ (1)

ڈاکٹر وحید قریشی سیالکوٹ کے ادبی ماحول کے بارے میں رقمطراز ہیں۔

> ”دینی کے علاوہ ادبی لحاظ سے بھی سیالکوٹ کی شعری روایت اہمیت رکھتی ہے۔ داغ دہلوی کے کئی شاگرد سیالکوٹ کے رہنے والے تھے۔ یہ شہر کشمیر سے

آنے والی آبادی کا بھی مرکز ہوا۔ جموں بھی یہاں سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ سری نگر کی طرف جانے والے راستے بھی جہلم کے بعد گجرات کے آس پاس سے نکلتے تھے۔ اس لیے ان علاقوں کی ادبی سرگرمیوں کی دھمک سیالکوٹ میں صاف سنائی دیتی تھی۔ اقبال، محمد الدین فوق، امین حزیں، اثر صہبائی، عبدالحمید عرفانی ایک مستحکم شعری روایت کے امانت دار تھے۔ پسرور میں عبدالطیف تپش نے جوت جگائی تھی اس میں فاخر ہریانوی اور محمد ضیا احمد کا نام اس کے علاوہ ہے۔ طفیل ہوشیار پوری کے بھائی یعقوب کے قیام کی وجہ سے طفیل ہوشیار پوری کا مسکن بھی سیالکوٹ ہی بنا رہا۔ پھر اصغر سودائی اور مجید تاثیر کے نام آتے ہیں۔ اس سے اگلی نسل میں جابر علی سید اور کرشن موہن اور محمد خان کلیم کی شعری تربیت گاہ یہی سیالکوٹ کی نگری تھی۔ اُنیسویں صدی کے اوائل سے بیسویں صدی کے آخر تک سیالکوٹ تجارتی مرکز ہی نہیں تھا بلکہ ادب کا بھی اہم مرکز رہا۔ یہاں کے شاعروں نے اُردو دنیا ہی میں نام پیدا نہیں کیا بلکہ نثر نگاروں نے بھی عربی، فارسی اور اُردو کی علمی روایت کو زندہ رکھا۔''(2)

دیگر فنون کے ساتھ ساتھ شاعری میں بھی سیالکوٹ کسی شہر سے پیچھے نہیں رہا۔ اقبال کے ہم عصر شاعر شجر طہرانی کا تعلق بھی سیالکوٹ سے تھا۔ آپ کی شاعری پر غالب، داغ اور اقبال کے اثرات کو دیکھا جا سکتا ہے۔ جب آپ میڈیکل کالج لکھنو میں طالب علم تھے تو اُسی دور میں آپ کو حضرت داغ دہلوی کی شاگردی کا شرف حاصل ہوا۔ اس دور میں انہوں نے باقاعدہ ادبی زندگی کا آغاز کیا۔ شجر اپنا کلام داغ دہلوی کو دکھایا کرتے تھے۔(3) شجر نے 80 سال متحرک ادبی زندگی گذاری اور تقریباً ایک لاکھ شعر کہے۔ آج ان کے رشتہ داروں کے پاس ۲۲ مسودے محفوظ ہیں لیکن ان کے اکثر مسودے نایاب ہیں اور گُم ہو گئے ہیں۔ شجر کا پہلا مجموعہ ''صبر جمیل'' (مثنوی) ۱۸ اگست ۱۹۲۸ء کو شائع ہوا۔ دوسرا شعری مجموعہ ''زبان فطرت'' نظموں پر مشتمل ہے۔ یہ مجموعہ ۱۹۲۹ء کو شائع ہوا۔ شجر نے اس مجموعے میں خاور گل، نسیم و بہار، شام و سحر، روز و شب، نور و ظلمات کے تعلق اور الفاظ سے واقعات عالم اور فنا و بقا کے مسائل کو دلچسپ اور دلآویز پیرائے میں حل فرمایا ہے۔ ''جہاں گرد'' شجر کا تیسرا شعری مجموعہ ہے جو توحید و رسالت، اخلاقیات، نفسیات، تجلیات، شخصیات، اعمال، وطنیت اور عید کے تحت ترتیب دیا گیا ہے۔ شجر محبت سے بھرپور دل کے مالک تھے۔ وہ احترام انسانیت کے قائل تھے ان کی شاعری میں انسانی محبت کے نمونے جا بجا بکھرے پڑے ہیں۔ پروفیسر یوسف نیران کی انسان نوازی

اور محبت کے بارے میں کہتے ہیں:

''ان کا خلوص اور انسانیت کا مہمان منصب ان کی شاعری کی جان ہے۔ اونچا فنکار نفیس انسان ہوتا ہے۔ اس کی چھاتی میں انسانیت کا دودھ رواں دواں ہوتا ہے۔ شجر صاحب اعلیٰ فنکار ہیں۔ وہ انسانیت کی قدروں کو عام کرنا چاہتے ہیں۔''(4)

غالب، مومن اور ذوق کے بعد دبستان دہلی کے جس شاعر نے اپنے معاصرین اور بعد میں آنے والے شعرا کی ایک بڑی تعداد کو اپنے فن اور شاعری سے متاثر کیا وہ مرزا داغ دہلوی ہے۔ داغ دہلوی کا رنگ تغزل اور اسلوب اس قدر مقبول ہوا کہ پورے ہندوستان کے نوجوان شعرا اس کی طرف کھنچے چلے آئے۔ شجر کے پھوپھی زاد کے داغ کے ساتھ مراسم تھے۔ داغ کے حضور حاضر ہو کر شجر اپنا کلام سنایا کرتے تھے ایک شعر داغ نے پسند بھی کیا اور اپنا شاگرد بنالیا۔ شجر نے دو سال داغ سے اصلاح لی۔(5)

ہر مخلص اور باشعور شاگرد اپنے اُستاد سے محبت کرتا ہے۔ شجر نے اُستاد داغ کو بڑے مخلصانہ الفاظ میں نذرانہ عقیدت پیش کیا ہے۔ شجر لکھتے ہیں:

نغمے چھیڑے ہیں بلبلوں نے پھر
پھر بہاروں پہ داغ آئے ہیں
یوں فضائیں غزل سرا ہیں شجر
جیسے جنت سے داغ آئے ہیں

داغ کا کوئی بھی شاگرد ان کے رنگ، اسلوب اور شاعری سے بچ نہ سکا۔ اقبال جیسا صاحب طرز اور صاحب اسلوب شاعر بھی داغ کے اثر سے بچ نہ سکا۔ شجر کی بھی متعدد غزلیں اپنے اُستاد کے رنگ میں بھیگی ہوئی ہیں۔ ان غزلوں میں داغ کا عکس نظر آتا ہے۔ شجر نے داغ کی زمینوں میں غزلیں لکھی ہیں۔ ان غزلوں کا لب ولہجہ اور زبان داغ کی زبان سے لگا کھاتی ہے۔ صنائع بدائع اور تشبیہ واستعارات کے استعمال نے اُن کی شاعری کے حسن کو دوبالا کر دیا ہے۔ شجر کی تشبیہ زندگی سے مربوط ہے اور استعارے بھی ہمارے سامنے کے ہیں۔ غیر مانوس تشبیہ اور استعارات سے گریز کیا گیا ہے شجر کی شاعری میں ضرب المثل، تلمیحات اور محاورات کا بھرپور استعمال ملتا ہے۔ شجر نے غزل میں مشکل اور لمبی ردیفوں سے غزل کو سنوارا ہے۔ شجر کے مسودے ''نوائے سروش'' میں ایک غزل دو قافیوں میں موجود ہے۔

مولانا ظفر علی خان کو بھی شجر کی طرح حیدر آباد میں داغ دہلوی کی صحبت میسر آئی لیکن علامہ شبلی نعمانی کی نصیحت پر داغ کا رنگ اختیار نہ کیا۔ شعر و شاعری کے ساتھ ساتھ آپ ایک بے باک اور نڈر صحافی بھی تھے آپ نے ''زمیندار'' اور ''ستارہ صبح'' کے علاوہ بہت زیادہ اخبارات و رسائل نکالے جن کی شہرت سارے برصغیر میں پھیلی۔ ظفر علی خان کا پہلا مجموعہ ''بہارستان'' کے نام سے 1934ء میں شائع ہوا۔((6اس میں اُن کا ابتدائی اُردو اور فارسی کلام ہے۔ ترتیب کے اعتبار سے یہ مجموعہ حسب ذیل طریقہ پر مرتب کیا گیا ہے۔۔

حمد باری تعالیٰ، نعت، اسلام، اسلامی روایات، ستارہ صبح کے دور کی نظمیں، نوحے اور مرثیے۔

دوسرا مجموعہ نگارستان ہے۔ اس مجموعہ کلام میں سیاسی و فلسفیانہ شاعری طنزیہ نگاری اور صحافتی شاعری کے ساتھ ساتھ ادبی مرصع کاری کے شاہکار بھی نظر آتے ہیں۔ تیسرے مجموعے'' چمنستان'' میں اہم ترین نظمیں اور قطعات ہیں جن کی اہمیت سیاسی، اسلامی اور معاشرتی لحاظ سے ہے۔(7)

چوتھا مجموعہ کلام ''خیالستان'' ہے جو سیاسی و ادبی غزلوں کے علاوہ نعت پر مشتمل ہے۔ پانچواں مجموعہ ''حبسیات'' نظر بندی اور اسیری کے دوران مکمل ہوا۔ اس مجموعہ میں حمد، نعت، اخلاق، سلف صالحین، اخلاق مرتضوی، انسان کی آزادی، اسلامی تصور، صلیب و ہلال کی آویزش، ایمان کی شناخت، برطانوی سیاست پر چوٹیں جیسے'' آزادی کابل''، ''تخت یا تختہ''، ''کلیسا سے عیسوی'' اور'' گاندھی'' اہم نظمیں وقطعات ہیں۔ چھٹا مجموعہ ''ارمغان قادیاں'' ہے جو قادیانیت کے خلاف نظموں پر مشتمل ہے۔

مسلم قومیت کے جس شعور کو حالی، شبلی اور اکبر نے واضح کیا ظفر علی خان اور اقبال کی شاعری اس شعور، احساس کی نمائندگی اپنے اپنے انداز میں کرتی ہے۔ اسلامیان ہند جہاں اپنے اور دوسرے ہم وطنوں کے ساتھ آزادی کی جدوجہد میں حصہ لے رہے تھے وہاں ان کے جذبات عالم اسلام کی دھڑکنوں سے بھی ہم آہنگ تھے۔ وہ یہ احساس رکھتے تھے کہ ان کے کچھ اپنے ملی خصائص ہیں جو انہیں برصغیر میں صدیوں تک رہنے اور اس سرزمین کو اپنی مادر وطن سمجھنے کے باوجود ایک عالمگیر نظام اخوت سے بھی وابستہ کیے ہوئے ہیں۔ دھرتی پوجا ان کے عقیدے اور مسلک کے بھی خلاف تھی۔ یہی جذبہ و احساس مولانا حالی کے ہاں مرثیے کی شکل میں اقبال کے ہاں فکر کے رنگ میں اور ظفر علی خاں کے ہاں رجز کے انداز میں ظاہر ہوا ہے۔ ظفر علی خان کی

نظم ''مسلم کی شان'' میں مسلم قومیت کی اسی مقامی اور آفاقی حیثیت کو واضح کیا گیا ہے۔

اقبال اور ظفر علی خان کے شعری دبستان کی یہ خاص اہمیت ہے کہ ان بڑے شاعروں نے اپنی شاعری میں سیاسی، تہذیبی، معاشرتی اور معاشی مسائل کو موضوعِ سخن بنانے کے ساتھ ساتھ غیر معتدل رومانی رجحانات پر تنقید کر کے ادب اور زندگی کے رشتوں کو جوڑنے کی کوشش کی ہے۔ اقبال کی طرح ظفر علی خان نے بھی اس نقطہ نظر کو ''سخنورانِ عہد سے خطاب'' میں بیان کیا ہے۔

شعر و ادب میں طنز یا ہجو سے مراد کسی بے ہنگم حالت یا مضحک کیفیت کو ایسے فن کارانہ پیرائے میں پیش کرنا ہے جس سے پڑھنے سننے والوں کے جذبہ تفریح کو تحریک ہو۔ سماجی اداروں جماعتوں میں انگریزی تہذیب، آریہ سماج، اہل طریقت اور قادیانی فرقہ ظفر علی خان کی طنز کا ہدف بنے رہے۔ افراد کی مدح و ذم بھی ان کا خاص موضوع رہا ہے۔ ظفر کی طنز کی اس لپیٹ میں گاندھی جی، جواہر لال نہرو، ابوالکلام آزاد، محمد علی جناح، علی برادران، علامہ اقبال، عطا اللہ شاہ بخاری اور سر محمد شفیع کے علاوہ متعدد شخصیات آئی ہیں۔ ظفر علی خان کا طنز و ظرافت کا وہی انداز ہے جو اکبر کا مخصوص رنگ ہے۔

فنی لحاظ سے ظفر علی خان نے غزل اور قطعے کی ہیئت کو زیادہ تر اختیار کیا ہے۔ جس میں مطلع مقطع اور ردیف و قافیے کا التزام غزل، قطعے یا قصیدے کی طرح ہے۔ ظفر علی خان کی بے کیف غزلوں کو حسن و عشق کے معاملات سے کوئی طبعی مناسبت نہ تھی کیونکہ وہ کوچہ ہوا و ہوس سے دور رہے۔ کوئی موضوع ہو کوئی اسلوب وہ ہر جگہ قادر الکلام تھے۔ اُن کے ہاں آمد ہی آمد ہے آورد کو دخل نہیں۔ وہ بدیہہ گو شاعر تھے۔ قافیہ ردیف پر انہیں بڑی قدرت تھی مگر وہ محض قافیہ پیمائی نہیں کرتے۔ تشبیہ، استعارہ، تلمیح، تمثیل وغیرہ شعری ضائع بدائع ان کے ہاں التزاماً نہیں آتے بلکہ بحرِ اس سخن کی روانی میں خود بخود بہتے چلے آتے ہیں۔ انہیں خود بھی اپنے فن پر دعوی ہے۔

مبّرا ہے کلام آورد کے اسقام سے میرا
مرے اشعار کی آمد میں دریا کی روانی ہے

ظفر علی خان کا شعری اسلوب ان کی صحافت اور خطابت سے بہت متاثر ہے۔ صحافت اور خطابت کے ان تقاضوں نے ظفر علی خان میں بدیہہ گوئی کے وصف کو خوب اُجاگر کیا جس کے لیے وہ اُردو شاعری کی تاریخ میں اپنا کوئی ثانی نہیں رکھتے۔ سنگلاخ زمینوں، مشکل قوافی سے عہدہ برآ ہونے کے علاوہ بندش الفاظ، روزمرے اور محاورے کا جس فنی مہارت سے التزام کیا اس کی

مثال میدان سخن میں کم ہی ملے گی۔ اظہار خیال کے لیے ظفر علی خان جہاں نئے نئے الفاظ لائے ہیں، نئی نئی تراکیب وضع کی ہیں۔ نئے نئے استعارے اور تشبیہات دریافت کی ہیں وہاں محاورات کے استعمال میں بھی بڑی جدت دکھائی ہے۔ تمام محاوروں کو نئے اور انوکھے طریقوں سے باندھ کر ان میں جاذبیت اور دلکشی پیدا کی ہے۔

امین حزیں سیالکوٹی کو مولوی میر حسن جیسے اُستاد اور عربی و فارسی کے عالم سے مادر علمی حضرت اقبالؒ میں اکتساب فیض کا موقع ملا۔ اُن کی تربیت نے اُن کے شعور کو اجاگر کیا اور ان کی باطنی صلاحیتوں کو چار چاند لگا دیئے۔ امین حزیں کی پہلی غزل لکھنو کے ''پیام یار'' رسالے میں چھپی۔ ابتدا میں شعر گوئی میں مولانا ظفر علی خان اور مولانا جوہر کے رنگ سے متاثر تھے۔ بعد ازاں حضرت اقبال کو پسند کرنے لگے اور یہ رنگ کچھ ایسا بھایا کہ پھر کسی اور کا نقش نہ جم سکا۔ اُردو، عربی، ہندی، سنسکرت، انگریزی، پشتو اور دیگر علاقائی زبانوں پر انہیں عبور حاصل تھا۔ اُن کے کلام کو گل و بلبل، لیلیٰ و مجنوں، واامق و عذرا اور شب ہجراں کے افسانہ ہائے دراز سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ خدائے بزرگ و برتر کی عظمت اور رسولؐ کی عقیدت کا ان کی زندگی اور شاعری پر گہرا اثر تھا۔ ''امین حزیں کا کلام مقبول ادبی رسائل'' پیام یار''، ''مخزن''، 'ساقی'' اور ''ہمایوں'' میں چھپتا رہا۔ (8)

امین حزیں کے تین شعری مجموعے '' گلبانگ حیات''، '' نوائے سروش'' اور '' سرود سرمدی''، الفیصل ناشران وتاجران لاہور سے شائع ہو چکے ہیں۔ امین حزیں کی شاعری کے آٹھ مسودے ابھی تک شائع نہیں ہو سکے جو اُن کے عزیز و اقارب کے پاس موجود ہیں۔ امین حزیں ایک مشاق اور قادرالکلام سخن ور تھے۔ انہوں نے تقریباً ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی۔ اُن کی نظموں میں مفکرانہ انداز، بلندی نظر، وحدت فکر اور رفعت تخیل کا عمدہ تناسب و توازن ملتا ہے۔ آپ نے زیادہ تر اخلاقی، قومی اور ملی موضوعات کو اپنی شاعری میں پیش کیا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ حسن، خودی، عقل و عشق، تصور ابلیس اور فلسفہ ایقان کو بھی اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ امین حزیں کی شاعری کا ایک بہت بڑا اہم موضوع ''عورت'' ہے۔ خصوصاً نظموں میں آپ نے عورت کے متعلق اپنے خیالات و افکار کا اظہار تفصیلاً کیا ہے۔ اقبال کی طرح امین حزیں کے فلسفہ حیات اور کائنات میں تصور خودی کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ آپ کا تصور عشق و عقل بھی اقبال کی طرح ہے۔ خودی اور تصور عشق و عقل کے حوالے سے اُن کی

نظمیں ''خودی خدائے خودی کے حضور میں'' اور ''عشق باقی باقی'' ملاحظہ کی جاسکتی ہیں۔

ہر بڑے شاعر کی طرح امین حزیں بھی فطرت کے شائق ہیں۔ان کی نظر قدرت کے مختلف مناظر کو پسند کرتی ہے اور اُن کے حسن سے متاثر ہوتی ہے۔بقول حبیب کیفوی:

> ''امین حزیں کی زندگی کی تینتیس بہاریں کشمیر اور گلگت کی گل بیز وگل ریز وادیوں میں بسر ہوئی تھیں۔فطرت کے دلآویز مناظر ہر وقت اُن کے سامنے رہے تھے اور وہ اُن سے لطف اندوز بھی ہوتے رہے تھے۔اس لیے یہ ممکن نہ تھا کہ رنگین نظاروں کی عکاسی نہ کرتے۔''(9)

اُن کی بہت سی نظموں میں حسین مناظر کی دلکش تصویر کشی موجود ہے۔''کوہستان قراقرم کی ایک وادی''، کشمیر کی صبح بہار'' اور ''حسن کی رُت'' داد طلب نظمیں ہیں۔ان نظموں کے علاوہ ''گلبانگ حیات'' اور ''سرود سرمدی'' میں شامل ان کی متعدد نظمیں فطرت سے اُن کے لگاؤ اور دل بستگی کی غماز ہیں۔

امین حزیں کی شاعری میں خصوصاً انسان اور مردِ مومن کا ذکر جا بجا ملتا ہے۔کبھی وہ مقام مردِ مومن طے کرتے نظر آتے ہیں تو کبھی انسان کا شاندار مستقبل دکھاتے ہیں۔''مقام مردِ مومن'' امین حزیں کی ایک شاہکار نظم ہے۔جس میں وہ مختلف استعاروں مثلاً رند، مے، جام اور عنقا جیسی تراکیب استعمال کرتے ہوئے مردِ مومن کے مقام کا تعین کرتے ہیں۔

اقبال کی طرح امین حزیں کے نزدیک بھی بدی یا شر انسانی فطرت کا جزو لاینفک ہے۔ یہ ایک ایسی محرک قوت ہے جو انسان کو جہدِ حیات میں عمل پر اُکساتی ہے۔دنیا میں شر کی نمائندگی ابلیس کرتا ہے۔ابلیس اُن کی نظموں کا ایک متحرک کردار ہے۔اس حوالے سے اُن کی نظمیں ''یقین'' اور ''شکوہ شیطان'' ملاحظہ کی جاسکتی ہیں۔امین حزیں کی نظموں میں بے شمار ایسی نظمیں موجود ہیں جو قومی وملی نظموں کے زمرے میں شامل ہوتی ہیں۔ڈاکٹر انور سدید کے بقول:

> ''اقبال کی نظموں کی مقبولیت سے متاثر ہو کر متعدد شعرا نے غزل کے ساتھ ساتھ نظم نگاری کی طرف توجہ دی۔شوق قدوائی، بے نظیر شاہ وارثی، امجد حیدر آبادی، تاجور نجیب آبادی، ہری چند اختر، اثر صہبائی، طالب بنارسی، اوج گیاوی چند اور امین حزیں ایسے شاعر ہیں جنہوں نے مناظرِ فطرت، تہذیبی زندگی اور قومی مسائل پر اچھی نظمیں پیش کیں''۔(10)

امین حزیں کی طبیعت پر غالب رنگ اقبال کا تھا مگر اس کے باوجود انہوں نے بعد میں

اپنے لیے اقلیم سخن میں نئی راہیں بھی تلاش کیں اور نئے افکار سے بھی اپنے اشعار کو مزین کیا جس سے اُن کے شاعرانہ کمال اور ناموری میں اضافہ ہوا۔

نمونہ کلام ملاحظہ ہو:

تڑپ تڑپ کے گزاری تو کیا! گزر تو گئی!
ہوئی نہ جیت تو کیا! اپنی شرط ہر تو گئی!
سکون مل نہ سکا گو پہنچ کے منزل پر
وہ آئے دن کی مگر زحمت سفر تو گئی! (11)

امین حزیں سیالکوٹی کے ایک ہم عصر شاعر سید صادق حسین تھے۔ اُن کا ایک مجموعہ کلام ''برگ سبز'' کے نام سے ۱۹۷۷ء کو شائع ہوا۔ اُن کا ایک شعر جس کی وجہ سے انہیں شہرت ملی، بعض حضرات علامہ اقبالؒ سے منسوب کرتے ہیں۔ یہ شعر اُن کے شعری مجموعے ''برگ سبز'' کی ایک غزل میں موجود ہے۔ شعر ملاحظہ ہو:

تندی باد مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب
یہ تو چلتی ہے تجھے اُونچا اُڑانے کے لیے (12)

خواجہ عبدالسمیع پال نے اثر صہبائی کے نام سے شہرت پائی جو امین حزیں سیالکوٹی کے حقیقی بھائی تھے۔ اثر صہبائی برصغیر کے صف اول کے شعرا میں سے تھے جن کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف اکثر ناقدین نے کیا ہے۔ شروع میں شعری اظہار کے لیے انہوں نے رباعیات اور قطعات کو وسیلہ بنایا اور ان اصناف سخن پر اتنا عبور حاصل کر لیا کہ وہ خیام العصر مشہور ہو گئے۔ اپنی رباعیات اور قطعات میں انہوں نے انسانی مسائل اور فلسفیانہ نکات کو عمدگی اور خوبی سے بیان کیا ہے۔ اُن کی رباعیات اور قطعات کے مجموعے ''جام طہور'' اور ''جام صہبائی'' کے ناموں سے شائع ہو چکے ہیں۔ ''خمستان'' ان کی غزلوں، نظموں اور رباعیات کا پہلا مجموعہ ہے۔ جس کا پہلا ایڈیشن 1933ء میں آزاد بک ڈپو سیالکوٹ سے شائع ہوا۔ اس مجموعے میں ''راحت کدہ'' بھی شامل تھا لیکن بعد میں ''راحت کدہ'' علیحدہ شعری کلام کی صورت میں شائع کیا گیا ہے۔ پانچواں شعری مجموعہ ''روح صہبائی'' کے نام سے راج محل پبلشرز جموں سے شائع ہوا۔ ''بام رفعت'' اُن کا چھٹا شعری مجموعہ ہے۔ ابھی اُن کے کلام کے کئی مجموعے مسودوں کی صورت میں ہیں جنہیں وہ اپنی زندگی میں طبع نہ کرا سکے (13)

اثر صہبائی کے ابتدائی کلام میں ایک خاص انداز اور بڑا لطیف جذبہ کارفرما ہے۔ پاکیزگی جذبات اُن کے کلام کا ایسا جوہر ہے جو اُن کے کلام کا حسن بن گیا ہے۔ کیف و سرور ان کا مستقل موضوع رہا ہے۔ جس شراب سے حافظ و خیام کے خمکدے روشن تھے ایسی صہبائے رنگین کی کیفیت ان کے بیشتر کلام پر طاری ہے۔ ان کے کلام میں حسن و عشق کے لطیف جذبات کے علاوہ فکر و نظر کی کارفرمائی بھی ہے۔

اثر صہبائی کی رفیقہ حیات راحت اُن سے انتیس سال کی عمر میں بچھڑ گئیں جس کا اثر اُن کی زندگی و دماغ اور اعصاب پر ساری عمر رہا۔ اس کسک نے اُن کی شاعری میں سوز و گداز پیدا کیا۔ ان کی اکثر نظموں میں یہ تاثرات نظر آتے ہیں۔

کشمیر صہبائی کا آبائی وطن تھا اور ملازمت کے دوران آپ نے عمر کا بیشتر حصہ بھی وہاں گذارا۔ قیام کشمیر کے دوران تحریک آزادی کشمیر زوروں پر تھی۔ کشمیری مسلمانوں پر ظلم و استبداد کے پہاڑ توڑے جا رہے تھے۔ مسلمانوں کی بے چارگی اور مظلومیت کا صہبائی کو گہرا احساس تھا۔ سرمایہ داری، سرمایہ دارانہ نظام حکومت اور غیر ملکی تسلط سے انہیں شدید نفرت تھی۔ اس حوالے سے اُن کی نظم ''عزائم'' ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔ اثر صہبائی نے اپنی متعدد نظموں میں کشمیر کی بہاروں، روح پرور فضاؤں، موسموں اور قدرتی حسن کی منظر کشی بھی پیش کی۔ مناظر قدرت کا یہ دلدادہ شاعر جب تک کشمیر میں مقیم رہا، کشمیر کی بہاروں اور خزاؤں کے گیت گاتا رہا۔(14)

اثر صہبائی نے اپنے آپ کو ملی شاعری کے لیے بھی وقف کیا اور قائد اعظم کی وفات کے بعد یہ صدا بلند کی کہ:

میرے وطن کو ہے اک مرد آہن کی تلاش

''سرود سفر'' نظم اُن کی قومی شاعری کا ایک نمونہ ہے۔ اثر صہبائی کی زندگی کا آخری دور مدحت رسولؐ سے شروع ہو کر اس پر ختم ہو جاتا ہے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو:

وہ میر قافلۂ رہروان جادۂ عشق
وہ صدر محفل ہستی محمد عربی
اسی کے فیض سے ذرے بھی برق پارے ہیں
اسی کے عشق میں سرشار چاند تارے ہیں(15)

فاخر ہریانوی نے شاعری کا آغاز چودہ برس کی عمر میں کیا۔ شاعری میں وہ حفیظ

جالندھری کی معاونت کے بہت معترف ہیں۔آپ کہتے تھے کہ وہ میرے اُستاد ہیں اور میری شعری تربیت میں اُن کا خاصہ حصہ ہے۔

فاخر کا کہنا ہے:

''حفیظ جالندھری نے نظم گوئی کی طرف مائل کیا۔فاخر تخلص بھی حفیظ کا تجویز کردہ ہی''۔(16)

فاخر بنیادی طور پر نظم گو شاعر ہیں۔اُن کا اپنا دور بھی نظم گو شاعروں کا دور تھا۔اس لیے بھی اس دور میں فاخر کو مقبولیت حاصل تھی۔فاخر بہت اچھے شاعر ہیں لیکن نقادوں کی توجہ ان کی طرف مبذول نہ ہوسکی۔اپنے دور میں اُن کا نام خاصا نمایاں تھا۔فاخر کی شاعری میں سب سے زیادہ فطرت سے لگاؤ کا اظہار ہوتا ہے ۔اگر انہیں شاعر فطرت کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ان کی رومانویت کے بارے میں احمد ندیم قاسمی کہتے ہیں:

''فاخر ہریانوی یقیناً رومانیت کے نمائندے ہیں۔انسانی مسائل ہوں یا مناظر فطرت اُن کا نقطہ نظر ہمیشہ رومانوی ہی رہا ہے''(17)

فاخر کے کلام کے بارے میں پروفیسر حمید احمد خان نے اُن کے شعری مجموعے ''موج صبا'' کے تعارف میں لکھا ہے:

''قارئین کا وہ طبقہ جو فاخر کی منظومات سے پہلی دفعہ روشناس ہو رہا ہے۔شاعر کے تخیل کی طراوت اور پُرخلوص گفتار پر ایک خوشگوار استعجاب محسوس کرے گا'' (18)

پُرخلوص گفتار اور تخیل کی طراوت کا احساس اُس وقت ہوتا ہے جب وہ مناظر فطرت کا بیان کرتے ہیں۔مناظر کے بیان سے فاخر کو بہت دلچسپی ہے۔اس حوالے سے اُن کی نظم ''شام'' ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔اس نظم میں انہوں نے شام کے منظر کے حسن کو بڑے خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔

ڈاکٹر محمد صادق اپنی کتاب "A History of Urdu Literature" میں فاخر کے بارے میں رقمطراز ہیں:

"Fakher Haryanvi who was well known in the twenties in very little known today even in the academic circle. Fakhir writes of the every day occurrences of village life especially of its humorous aspects...when he calls the sights that lay stored in his

memory, he becomes suddenly alive, each picture being described truthfully in language that is stricklingly fresh and avocative."(19)

. فاخر کا کلام معصومیت اور بچوں سے پیار سے بھرا ہوا ہے۔ بچپن کے زمانے کی بے فکری اور حسن کو فاخر نے اپنی نظم ''چند بچوں کو دیکھ کر'' کا موضوع بنایا ہے۔ فاخر ان معصوموں کی دنیا میں کھو جانے کی آرزو کرتے ہیں۔ بچوں کے حوالے سے اُن کی ایک شاہکار نظم ''معصوموں کی دنیا'' بھی ہے جس میں بچے حسن کی معصوم تصویریں نظر آتے ہیں۔ جو بچپن کے حسین ایام کاٹ رہے ہیں اور فکر دنیا سے آزاد ہیں۔ رومانی شاعر اختر شیرانی نے اپنی شاعری میں عورت کے روپ کو اُبھارنے میں خاص کردار ادا کیا ہے۔ فاخر ہریانوی کے ہاں بھی عورت کے بارے میں اس قسم کے خیالات کا پتہ چلتا ہے۔ فاخر کی ایک نظم ''عورت'' اُن کے شعری مجموعے ''موج صبا'' میں شامل ہے۔ اس نظم میں عورت کی نفسیاتی کیفیات کا جائزہ لیا گیا ہے کہ عورت جب محبت کرتی ہے تو نفع و نقصان کے خوف سے بالاتر ہو کر کرتی ہے۔ اسے وفاداری سے غرض ہوتی ہے جذبے کی شدت کے بل بوتے پر وہ دہکتی ہوئی آگ میں بھی کود سکتی ہے۔ ''عورت اور جوگی''، ''عذرا''، ''آخری ملاقات'' اور ''شہر حسن'' بھی فاخر کی شاہکار نظمیں ہیں جو عورت کے حسن و جمال کی ترجمانی کرتی ہیں۔ فاخر کے کلام میں حمدیہ لہجے کا بھی احساس ہوتا ہے اور یہ پاکیزگی خیال کا احساس دلاتا ہے۔ احمد ندیم قاسمی اس حوالے سے کہتے ہیں۔

''فاخر ہریانوی کے ہاں رومانویت کے علاوہ اگر اور کوئی جھلک ہے تو وہ اخلاقیات کی ہے۔ شاید اس کا سبب یہ ہے کہ وہ ایک معلم تھے۔''(20)

نمونہ کلام ملاحظہ ہو:

ہے طلسم جزر و مد سے بے خبر سینہ ترا
صاف ہے روئے سحر کی طرح آئینہ ترا
بہہ رہا ہے اس طرح پانی خرام ساز سے
ہلکے ہلکے جس طرح پیدا ہوں نغمے ساز سے (21)

خواجہ عبدالحمید عرفانی سکول کے زمانے میں مولانا حالی اور مرزا غالب سے حد درجہ متاثر تھے۔ عرفانی کی قومی موضوعات پر لکھی گئی نظموں میں حالی کا انداز نظر آتا ہے۔ انہوں نے غالب کی زمینوں میں بھی غزلیں کہی ہیں۔ ڈاکٹر عرفانی کی ''کلیات عرفانی'' میں غزلیات، مانو

لاگ کے تراجم، مکالمے اور قومی نظموں کے متفرق اشعار شامل ہیں۔ ڈاکٹر عرفانی کی اکثر غزلیں چھوٹی بحروں میں ہیں۔ اُن کی غزل میں عارفانہ رنگ غالب نظر آتا ہے اس حوالے سے رخشہ نسیم لکھتی ہیں:

''اُن (عرفانی) کے کلام میں جگہ جگہ عارفانہ رنگ غالب نظر آتا ہے۔ کلام میں اتنی تاثیر ہے کہ ہر شخص کے دل کی گہرائیوں میں اتر جاتا ہے۔''(22)

عرفانی کی غزلیات میں سوز و گداز، غنائیت، موسیقیت، تکرار لفظی اور فارسیت کا غلبہ بھی نظر آتا ہے۔ اُن کا کمال یہ ہے کہ وہ فارسی تراکیب کو اُردو روزمرہ سے اس طرح پیوست کرتے ہیں کہ بیگانگی اور اجنبیت کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ بحیثیت مجموعی عرفانی کی غزل میں درد کا صوفیانہ رنگ، میر کا سوز و گداز، اصغر کا نشاطیہ انداز، غالب کی جدت پسندی اور اقبال کی فلسفہ طرازی کا رنگ واضح طور پر جھلکتا ہے۔ عرفانی زود گو شاعر ہیں۔ اس کا ثبوت اُن کا فارسی کلام ہے۔ ایرانی تو انہیں بہترین فارسی شعرا میں شمار کرتے ہیں۔ انہیں اردو شاعری پر زیادہ توجہ دینے کا موقع نہ مل سکا۔ اُن کے اردو کلام سے پتہ چلتا ہے کہ اگر وہ پختگی کے دور میں شعر کہنا ترک نہ کرتے تو ان کا شمار صف اول کے شعرا میں ہوتا۔

نمونہ کلام ملاحظہ ہو:

ساقی نوید رونق فصل بہار کیا
نا حق نمک چھڑکتا ہے زخموں پہ یار کیا
اپنے تصورات کی دنیا وہی رہی
پھر انقلاب گردش لیل و نہار کیا(23)

عظیم شاعر فیض احمد فیض کی شاعری میں شہرت نہ صرف ملکی سطح پر ہے۔ بلکہ ترقی پسند تحریک سے تعلق اور عالمگیر فکر کی وجہ سے فیض دیگر ممالک میں بھی جانے پہچانے جاتے ہیں۔ اُن کی شاعری کا جائزہ لیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ وہ مارکسزم کے فلسفہ، مقاصد اور معتقدات کے اندھے مقلد نہیں تھے۔ انہوں نے ترقی پسند تحریک کی نظریاتی وابستگی سے کبھی منہ نہ موڑا۔ فیض اپنے سینے میں دردمند دل رکھتے تھے اور انسانوں پر مظالم، استحصالی رویوں کو بڑے دکھ کے ساتھ محسوس کرتے تھے۔ فیض معاشرے میں ایسا انقلاب برپا کرنے کے خواہش مند تھے جو استحصالی نظام کو بدل کر رکھ دے۔ وہ غیر طبقاتی نظام کے قائل تھے۔ ترقی پسند شاعر ہونے کے

باوجود اپنی شاعری کو انقلابی نعروں سے بچاتے ہوئے فیض نے اسے رومانی پیرایہ میں خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی شاعری دوامی ہے۔ فیض نے غزل میں کلاسیکی انداز کو قائم رکھا اور نئے مضامین بھی پیش کیے۔

فیض ایک منفرد لہجے اور جمالیاتی و رومانی انداز کا شاعر ہے۔ وہ بیسویں صدی کا ایسا انقلابی شاعر ہے جس کے ہاتھوں پر رومانیت اور سماجیت کے چراغ فروزاں ہیں۔ اُن کے غنائی لہجے میں اتنی تاثیر تھی کہ انہیں ہیئتی تجربوں کی ضرورت بالکل محسوس نہ ہوئی۔ فیض کے ہاں رومان اور انقلاب ان کی فکر کی دوئی نہیں بلکہ یکجائی کی دلیل ہے۔ فیض نے اپنی شاعری میں وطن کی محبت، مظلوم انسانوں سے محبت کا ذکر خالص اور رومانی لہجے میں کیا ہے۔ اُن کے ہاں جس محبوب کا ذکر ملتا ہے اس کی ایک ہتھیلی پر حنا اور دوسری ہتھیلی پر لہو کی چمک نظر آتی ہے۔ فیض کی شاعری کا بڑا موضوع محبت اور زندگی کی اجتماعی جدوجہد کی واردات ہے فرماتے ہیں۔

مقام فیض کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

فیض نے اپنی شاعری میں علامتوں کے انفرادی اور اجتماعی مفہوم کو اکٹھا کر دیا ہے۔ آپ نے استحصالی طبقے کے لیے واعظ، شیخ، محتسب، ناصح، مدعی، عدو، اہل ستم، صیاد، گل چیں، اہل ہوس، اغیار، رہزن، فقیہہ شہر، اہل حرم، قاتل اور جلاد جیسی علامتیں استعمال کی ہیں۔ پرانی علامتوں کو نئے مفاہیم عطا کیے اور کئی نئی علامتیں بھی تخلیق کی ہیں۔ جمالیاتی سحر کا سماں پیدا کرنے کے لیے سحر لہو، دیدۂ تر، فصل گل، مے خانہ اور صبح سخن جیسی علامتیں تخلیق کی ہیں۔ فیض نے اپنی شاعری میں اعلیٰ فکر کے ساتھ ساتھ فنی تقاضوں کو بھی مدنظر رکھا۔ فیض کا فن تاریخی شعور کی مدد سے زندگی کے ساتھ ساتھ چلتا ہے بلکہ اس سے بھی آگے۔ احمد ندیم قاسمی اپنے ایک مضمون میں فیض کے فن کے حوالے سے یوں رقمطراز ہیں:

> ''فیض زندگی کا نباض ہے۔ اس کا فن کسی تاریخی شعور کی مدد سے زندگی کے ارتقائی رخ یعنی اس کے نامیہ رجحان کے ساتھ ساتھ چلتا ہے بلکہ بعض اوقات اس سے بھی آگے بڑھ جاتا ہے۔ زندگی اور انسان کا ارتقا اور ارتفاع ہی ہمیشہ اس کا مرکزی نظریہ رہا ہے''۔ (24)

کلیم الدین احمد فیض کے فن کے بارے میں اپنے ایک مضمون ''فیض'' میں یہ رائے رکھتے ہیں:

''فیض میں دو چیزیں ہیں جو دوسرے ترقی پسند شاعروں میں نہیں ملتیں۔ پہلی چیز تو یہ ہے کہ فیض کو نظم کے فنی تقاضوں کا احساس ہے اور ان فنی تقاضوں کو پورا کرنا چاہتے ہیں۔ دوسری چیز خود ضبطی ہے۔ وہ دوسرے باغی شاعروں کی طرح اپنے نعروں سے آسمان کو نہیں ہلاتے''(25)

مجید احمد تاثیر کی نظم میں جوش کی قدرت زبان اور اختر شیرانی کی رومان پسندی دونوں کی جھلک نظر آتی ہے۔ تاثیر صاف ستھری رباعی کہنے میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ رباعی بہت مشکل فن ہے۔ اُن کا مجموعہ بعنوان ''رباعیات تاثیر'' چھپ چکا ہے۔ آپ اپنے دور کے ہر بڑے شاعر اور شاعری کی تحریک سے متاثر تھے۔ آپ نے اپنے کلام میں اپنے دور کی نمایاں شعری روایات کو اپنانے کے ساتھ انہیں زندہ رکھا ہے اور یہ اُن کا بڑا کارنامہ ہے۔

احمد ندیم قاسمی مجید احمد تاثیر کی شاعری کے بارے میں کہتے ہیں:

''انہوں نے اپنے دور کی نظموں کی ہر ہیئت کو کامیابی سے برتا ہے بلکہ میرا خیال ہے کہ جو شاعر اتنی سہولت سے رباعی کہہ لیتا ہے وہ ہر نوع کے شعری اظہار پر قادر ہو جاتا ہے۔ تاثیر نے مثنوی اور وطن کے نغمے لکھے ہیں۔ تاثیر کی رباعیات اور نظمیں اُردو شاعری کی تاریخ کا ایک ناگزیر حصہ ہیں''(26)

ڈاکٹر سید عبداللہ رباعیات تاثیر کے بارے میں یہ رائے رکھتے ہیں:

''اکبر کے یہاں حقائق زندگی ہیں، حالی کے یہاں عملی اخلاق و دانش زیست ہے۔ تاثیر سیالکوٹی کے یہاں دونوں رنگ موجود ہیں۔ تاثیر کا اہم موضوع انسان اور اس کی تقدیر ہے۔ رباعیات تاثیر تعداد میں کم مگر قدر و قیمت میں وزن دار ہیں''۔(27)

نمونہ کلام ملاحظہ ہو:

تیرے رخ روشن کی ضیا ہو جاؤں
تیرے لب نازک کی صدا ہو جاؤں
تیری ہے تلاش مجھ کو اے قلزم حسن
جی چاہتا ہے، تجھ میں فنا ہو جاؤں (28)

محمد طفیل نام اور شہرت طفیل ہوشیار پوری کے نام سے ہوئی۔ ''میرے محبوب وطن'' طفیل کے ملی نغمات پر مشتمل پہلی شعری کتاب ہے۔ طفیل کا ناطہ فلمی دنیا سے بھی رہا اور انہوں نے فلموں کے لیے اُردو اور پنجابی میں اڑھائی سو کے قریب گیت لکھے۔ دوسری کتاب

''جام مہتاب'' ہے جو قطعات و رباعیات پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب ۱۹۸۰ء میں شائع ہوئی۔ ''ساغر خورشید''، ''شعلہ جام'' اور ''تجدید شکوہ'' غزلوں اور نظموں پر مشتمل تین شعری مجموعے ہیں۔ ''رحمت یزدان''، طفیل کا نعتیہ مجموعہ کلام ہے جو ۱۹۹۲ء میں شائع ہوا۔(29)

طفیل نے اگرچہ تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے لیکن غزل کا طواف ایک مدت تک کرتے رہے۔ انہوں نے غزل کے مزاج، رنگ و آہنگ اور ہیئت و انداز کو ایک پرستار کی حیثیت سے اپنایا ہے جس کی وفاداری شک وشبہ سے بالاتر ہے۔ شروع میں طفیل نے شاعری میں کسی اُستاد فن سے اصلاح نہیں لی لیکن سیالکوٹ آمد کے بعد امین حزیں سیالکوٹی اور مولانا توحید کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیے۔ اس کے علاوہ مولانا تاجور نجیب آبادی نے بھی اُن کو شاعری میں گرانقدر مشورے دیئے۔ آپ کی غزلیں ''ادبی دنیا'' میں شائع ہوتی رہیں۔ طفیل ایک روایت پسند شاعر ہیں۔ انہوں نے ہمیشہ پرانی روایات کو سراہا اور پسند کیا ہے۔ انہوں نے کلاسیکی شعرا سے اثر قبول کیا لیکن ان تمام اثرات کے باوجود غزل میں اپنے لیے ایک الگ راستہ بنایا ہے۔ وہ غزل میں سیدھا سادا اسلوب اظہار اختیار کرتے ہیں جو اپنی اثر انگیزی کی بنا پر سننے اور پڑھنے والوں کے ذوق و معیار پر پورا اُترتا ہے۔ اُن کا شعور اُن کے داخلی و خارجی مشاہدات کو اُن کی ذات کے حوالے سے اظہار کے صاف ستھرے اور رواں دواں سانچے فراہم کرتا ہے اور وہ ان سانچوں کو فن کی آنچ میں شائستہ کر کے سخن کر لیتے ہیں۔ طفیل کا کلام خود کلامی، خدا کلامی، رسولؐ کلامی اور لوک کلامی پر مشتمل ہے۔ معانی کے حوالے سے دیکھا جائے تو انہوں نے اس دیرینہ روایت کی تجدید کی ہے جس کا تار و پود سراسر اخلاقی قدروں کا مرہون منت ہے۔ اُن کی آخری دور کی شاعری میں مذہبی اور اخلاقی رجحان زیادہ نمایاں ہے۔ اُن کے قطعات اور رباعیات، نظم اور غزل میں سعدی کی سحر بیانی، رومی کی دولت وجدانی، حافظ کا عرفان، حسانؓ کا جذبہ مدحت رسولؐ، عرفی کا حسن بیان، اقبال کا دل بیدار، میر و غالب کا سوز سخن اور امیر خسرو کا گداز پایا جاتا ہے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ طفیل کے ایک شعری مجموعے کے بارے میں رقمطراز ہیں:

> ''طفیل روایت کی پختہ مسلمات کا احترام کرتے ہوئے اپنے تجربات قلبی کو اپنے مزاج محبت آشنا میں ڈھال کر ایک ایسی غزل ہمیں عطا کرتا ہے جو کسی اور جگہ دستیاب نہیں۔ ترکیبیں شیریں مانوس دل پسند و دلآویز، پیرایہ بے تکلف اور

بے ساختہ ہے، زبان اجلی اور پاکیزہ بیان خلوص میں ڈھالا ہوا۔ غرض
تغزل کی ہر ادا اس میں موجود ہے جو ہر غزل آشنا کو مطمئن کر سکتی ہے۔"(30)

طفیل کی شاعری میں موضوعات اور فن کے اعتبار سے وہ سب کچھ موجود ہے جو اچھی شاعری میں ہونا چاہیے۔ طفیل نے روایات کو مدنظر رکھتے ہوئے حسن و عشق کے معاملات کا اظہار بڑے خوبصورت اور پاکیزہ انداز میں کیا ہے۔ اُن کے ہاں حسن سے زیادہ عرفان حسن ملتا ہے۔ طفیل کی شاعری کا سب سے بڑا اور پھیلا ہوا موضوع غم و حوادث ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری اور خصوصاً غزلوں میں اپنے ذاتی غم و آلام کو دل کھول کر بیان کیا ہے۔ یادوں اور ماضی کے حوالے سے طفیل نے آنسوؤں کا بہت ذکر کیا ہے۔ معاشرے میں موجود طبقاتی تضاد بھی طفیل کی نگاہ میں بہت کھٹکتا ہے۔ اُن کی شاعری کا ایک نمایاں وصف علامتی انداز ہے۔ اُن کے ہاں علامتی انداز سیدھا سادا ہے۔ علامتی انداز نے کچھ چھپایا نہیں ہے۔ انہوں نے پرانی تعلیمات کو استعمال کرتے ہوئے ان میں نئی معنویت پیدا کر دی ہے۔ فنی لوازمات اور صنعتوں کو بھی بڑے خوبصورت انداز میں استعمال کیا ہے۔ آپ کی تراکیب عام فہم ہیں۔ تشبیہات و استعارات کو بڑے خوبصورت انداز میں شعروں میں استعمال کیا ہے جس سے شعروں کی تاثیر میں اضافہ ہو گیا ہے۔

نمونہ کلام ملاحظہ ہو:

رقص جذبات کی لے ، شعلہ آواز کا رنگ
اب تک آنکھوں میں ہے اس جلوہ گہ ناز کا رنگ
تیرے عارض پہ جھلکتا ہے حیا کی صورت
میرے احساس، تری شوخیٔ انداز کا رنگ (31)

تاب اسلم سکول کے زمانے میں سیالکوٹ کی مقامی ادبی تنظیموں اور مشاعروں میں باقاعدگی سے ایک سامع کی حیثیت سے شرکت کرتے تھے۔ 1949ء میں اُن کی پہلی نظم ''ادب لطیف'' میں مرزا ادیب نے شامل کی۔ ابتدائی شاعری میں سادگی اور معصومیت نظر آتی ہے۔ آپ کا کلام ''فردوس ادب''، ''اوراق''، ''افکار''، ''لیل ونہار''، ''امروز''، ''مشرق''، ''ادبی دنیا''، ''ادب لطیف''، ''ہمایوں''، ''نیرنگ خیال''، ''فنون'' اور ''ساقی'' میں شائع ہوتا رہا۔ 1965ء میں سیالکوٹ کی فضا قومی و ملی احساسات سے پر تھی۔ آپ نے بھی قومی و ملی نظمیں لکھیں۔ تاب اسلم سیالکوٹ میں کئی سال تک حلقہ ارباب ذوق کے سیکرٹری رہے۔ آپ نے تمام اصناف

سخن میں طبع آزمائی کی لیکن غزل میں نام پیدا کیا۔ آپ کے چار شعری مجموعے ''زخم وفا''، ''نقش آب''، ''سراب جاں'' اور تیری یاد کے سارے موسم'' شائع ہو چکے ہیں۔ پانچواں شعری مجموعہ ''درد تیرے فراق کے'' نام سے زیر تکمیل ہے۔ تاب اپنی شاعری میں سماجی حالات اور معاشرتی ناہمواریوں کو جگہ دیتے ہیں۔ وہ روایت میں جدت اور انفرادیت پیدا کرتے ہیں۔ مگر روایت سے ہٹتے نہیں۔ آپ نے عصری خیالات، رجحانات اور واقعات کو اپنی شاعری میں جگہ دی۔ آپ نے رومانوی شاعری بھی کی اور آپ کے خیالات کسی قدر ترقی پسند بھی ہیں۔ انہوں نے معاشرتی بے حسی، بے انصافی، ظلم و تشدد، جبر اور جہالت کے خلاف قلم اُٹھایا۔ اُن کی آواز کسی حد تک فیض کی آواز سے ملتی ہے مگر اُن کی آواز دبی دبی سی سنائی دیتی ہے۔ وہ اپنے قلم کو کسی آمر کے سامنے جھکنے نہیں دیتے۔ غزل کو حیات دوام، جدت، انفرادیت اور استحکام دینے والوں میں تاب اسلم کا نام سرفہرست آتا ہے۔ غزل کی رمزیت، ایمائیت اور اشاریت میں کتنی قوت ہے کتنی جاذبیت ہے۔ تاب اسلم اس ہنر سے آگاہ ہے۔ ان فنی لوازم سے تاب نے چمنستاں گل میں رنگ برنگ کے پھول کھلائے ہیں۔

تاب نے اپنی شاعری میں علامتوں کو بھی خوبصورت انداز میں استعمال کیا ہے۔ تہذیب کے اندر جھانکنے کے لیے تاب کی شاعری میں دو بنیادی علامتیں سامنے آتی ہیں۔ حبس اور برف کی علامتوں کو تاب نے نئے انسان کے بنیادی مسئلہ رہائی کے حوالے سے برتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیے:

برف میں محصور موسم کو حرارت کون دے
حبس اتنا تھا کہ دم گھٹنے لگا تاب اسلم
شرر ہوں برف کی اندھی سلوں میں رہتا ہوں
یہ زندگی بھی تو برف کا اک مکان ٹھہرا(32)

تاب کی شاعری میں ایک تازہ کاری کا احساس ملتا ہے جو جمالیاتی پہلو کی وجہ سے ہے۔ تاب کی غزل میں جمالیاتی پہلو حسن و عشق، سوز و گداز، غنائیت، مترنم اور رواں ردیفوں اور غنائی بحروں کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ محبوب کی سراپا نگاری اور اُس کے حسن ادا کا خوبصورت بیان جمالیاتی احساس کا تصور پیدا کرتا ہے۔ اُن کا احساس جمالیات متحرک ہے اور ہماری روح میں ایک جذب و انبساط پیدا کرتا ہے ۔ تاب کے کلام میں ایک ارتقائی صورت ملتی ہے۔ یہ ارتقا

اسلوب وفکر ہر اعتبار سے ہے۔ جوں جوں آگے بڑھتے ہیں اُن کی شاعری میں انفرادیت اور مزید پختگی نظر آتی ہے۔ تاب کے کلام میں کہیں کہیں تصور و فلسفہ کی جلوہ گری بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ عشق و عاشقی کی تڑپ اور رومانیت کی ہلکی پھلکی آنچ بھی ملتی ہے۔ تاب اسلوبیاتی اور موضوعاتی سطح پر تقلید کے قائل نہیں۔ اپنا راستہ خود تراشنا چاہتے ہیں۔ اُن کے ڈکشن پر کسی دوسرے شاعر کا رنگ دکھائی نہیں دیتا۔ آپ فن کے عصری تقاضوں پر نظر رکھتے ہیں۔ اُن کے اشعار عصری شعور اور فن کے ساتھ اُن کی مضبوط وابستگی کے آئینہ دار ہیں۔ تاب کے طویل فن ریاض، نظام حسیات کی ہمہ وقت بیداری، مشاہداتی تنوع، وسعت مطالعہ، بصیرت میں قلندرانہ لپک جھپک اور بصارت میں درویشانہ مسلک کی عطا ہے۔ تاب حالات کی تلخیوں کو محسوس کرتے ہیں۔ زندگی کی نئی قدروں سے ان کا سامنا ہوتا ہے اور وہ اس کے مدوجزر میں غوطہ زن ہوتے ہیں۔ وہ زندگی کے نئے نئے مفہوم تلاش کرتے ہیں اور زندگی کو خوشی وغم کے تناظر میں پرکھتے ہیں۔ وہ انسانیت کی عظمت کے معترف ہیں اور انسان کو عظیم رتبے کا حامل دیکھنا چاہتے ہیں۔ مایوسی اُن کے ہاں بہت کم نظر آتی ہے۔ وہ مثبت نظریات رکھتے ہیں۔ تاب کی شاعری میں جا بجا آنسو، آہیں، سسکیاں، محرومی اور کچھ کھو جانے کا احساس نمایاں ہے اور اس غم کا دائرہ بیکراں ہے۔ اُن کی غزل داخلیت کی شاعری ہونے کے باوجود مختلف جہات لیے ہوئے ہے۔ اُن کی شاعری ایک حساس دل کی آواز ہے۔

جابر علی سید نہ صرف ایک اچھے شاعر بلکہ ایک اچھے انسان، ادیب، محقق، نقاد، ماہر لسانیات و عروض اور مشفق اُستاد بھی تھے۔ جابر علی سید کی وفات کے بعد حمید اختر فائق نے اُن کے کلام کو ''موج آہنگ'' کے نام سے 1999 میں مرتب کر کے شائع کیا۔ آپ نے اُردو غزل میں ہیئت اور بحر کے نئے نئے تجربے کیے اس لیے کہ وہ علم عروض سے گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ آپ نے اُردو میں بعض بحروں کو روشناس کروایا جن کا پہلے سے اُردو میں رواج نہیں تھا۔ آپ شروع سے ہی مشکل پسند تھے۔ مشکل کام کر کے انہیں خوشی ہوتی تھی۔ اسی سبب سے انہوں نے غزلوں میں نوع بہ نوع تجربے کیے۔ نئے الفاظ، نئے محاورے اور نئی ترکیبیں استعمال کیں۔ اُن کی غزلوں میں اُن کی شخصیت کی بہت سی داخلی کیفیات اور ان کے شعور و لاشعور میں اُٹھنے والے ہنگاموں اور طوفانوں کا پتہ چل جاتا ہے۔ اُن کا کلام حسن صوری اور جمال معنوی کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ غزلوں میں صوتی آہنگ کے ساتھ ساتھ تفریح کا بھی بڑا خیال رکھتے ہیں کیونکہ تغزل ہی

غزل کو صحیح معنوں میں غزل بناتا ہے۔

نمونہ کلام ملاحظہ ہو:

بجھا دو ان چراغوں کو یہ چبھتے ہیں میری آنکھوں میں
پائے نازنین میں جیسے نوک خار صحرا خار گلشن بھی (33)

سید سبط علی صبا کی شاعری اپنا مواد سرزمین وطن، اس کی عسکری روایات اور اسلامی عسکری تاریخ سے حاصل کرتی ہے۔

صبا کا شعری مجموعہ ''طشت مراد'' مجلس تصنیف و تالیف واہ کینٹ نے شائع کیا۔ اُن کا کلام ''فنون''، ''ہماری زبان''، دہلی ''ماہ نو'' اور ''واہ کاریگر'' میں شائع ہوتا رہا۔ سبط علی صبا کی غزلوں کو اگر زمانی ترتیب سے دیکھا جائے تو ان میں سب سے پہلا موضوع ایوبی آمریت ہے۔ زنداں سلاسل، تیرگی اور دار و رسن جیسے امیجز کا استعمال اُس دور میں عام نظر آتا ہے۔ اگرچہ اس سے پہلے ان کا استعمال فیض کے ہاں بھی تھا۔ لیکن اب یہ شعری روایت کا حصہ بن گئے۔ صبا ابتدا ہی سے جمہوریت پسند تھے۔ اپنی غزل میں اس سلسلے میں انہوں نے ہمیشہ بلند بانگ لہجہ اختیار کیا۔

قدم قدم پر کرو اہتمام دار و رسن
رواں ہے قافلہ شوق امتحاں کے لیے

صبا کی غزل میں جگہ جگہ عوام کے فلک شگاف نعروں کی گونج ایوان اقتدار میں ہل چل مچاتی نظر آتی ہے۔ آپ 1965ء کی فتح پر شجاعت کے نغموں کے ساتھ ساتھ سقوط ڈھاکہ پر پاکستان کی شکست پر اپنی غزل میں آنسو بہاتے بھی نظر آتے ہیں۔ انہیں 1971ء کی ہزیمت کا احساس تھا جس کا اظہار صبا کی غزل میں دردناک انداز میں ہوتا ہے۔ صبا نے اپنی غزل میں داخلی منافرت اور فرقہ واریت پھیلانے والے سیاستدانوں کے ساتھ ساتھ تنگ نظر مُلا کو بھی اپنی تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ صبا کی عشقیہ شاعری اپنے اندر ایک پاکیزہ فضا رکھتی ہے اور ہر شعر تغزل کی چاشنی سے بھرپور ہے۔ کچھ اشعار ایسے ہیں جن میں صبا غم جاناں کی طرف بڑھتے ہیں لیکن غم دوراں انہیں اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔

صبا نے غزل کے ساتھ ساتھ سرزمین وطن، شہدائے کربلا اور قومی رہنماؤں سے والہانہ عقیدت کے واضح اظہار کے لیے اپنی مختصر زندگی میں متعدد نظمیں بھی کہیں۔ ان نظموں میں سے اکثر اہم قومی مواقع پر کہی گئیں جو نہ صرف اپنا ایک فکری و فنی معیار رکھتی ہیں بلکہ اس اعتبار

سے بھی منفرد ہیں کہ ان میں ایک ''مسلمان سپاہی شاعر'' کا باطنی پیکر اپنے واضح خطوط کے ساتھ جلوہ گر ہو رہا ہے۔ صبا کی ان میں سے نمایاں نظموں کے عنوانات ''زخم''، ''سلام آنے لگا''، ہم جاگ رہے ہیں''، ''راہ میں دیوار نہ بن''، ''نئی حیات''، ''عید محرومی''، ''روشنی عمل''، ''گواہ رہنا''، ''پرچم شبیر دیکھ''، ''14 اگست'' اور ''وہ ایک شاعر'' ہیں۔ ان میں چند ایک پابند اور باقی آزاد نظمیں ہیں۔

اُن کی غزل کی بحریں زیادہ تر سادہ اور رواں ہیں۔ اپنے اسلوب، آہنگ، تمثال کاری، تراکیب، علامات، لفظیات اور صناع بدائع کے حوالے سے یہ غزلیں اپنی فکری ندرت کی طرح اپنے اندر ایک غیر معمولی فنی ندرت بھی رکھتی ہیں۔

صبا کی غزل میں کلاسیکی اور معاصر اُردو غزل سے بالکل مختلف امیجری ملتی ہے۔ اُن کی غزل کی فنی تمثالیں موت کی لوری، حالات کی سولی، ہوا کی سیٹیاں، چاہتوں کے پنچھی، روح کے قیدی پرندے، زخموں کے آئینے، سایوں کے پیکر، خواہشوں کی تتلیاں، درد کا غازہ، نفرت کی سولی، ہوس کا کیچڑ، دکھوں کی گٹھڑی، افلاس کا زنداں اور حالات کی زنجیریں وغیرہ ہیں جو ان کی اپنی تخلیق کی ہوئی ہیں۔ صبا کی غزل میں مروجہ شعری علامات کی بھی کمی نہیں مثلاً جنگ، گاؤں، شمع، تیرگی، رات، طوق، اور زنجیر وغیرہ لیکن اُن کی طبع زاد علامات ایسی ہیں جو ان کی پہچان کا مستقل حوالہ بنتی ہیں۔ ان میں گرتی ہوئی دیوار، آدھا جسم، اور سبز آنکھیں ہیں جو اپنی دھرتی کے لیے ہیں۔ اُن کا اسلوب ایک سپاہیانہ اسلوب ہے جو اُن کی سپاہیانہ فکر نے پیدا کیا ہے۔

نمونہ کلام ملاحظہ ہو:

صبح آئی لہو میں ڈوبی ہوئی
شام کا رنگ جانے کیا ہو گا
اب نہ جاگے تو موسم گل کا
قافلہ دور جا چکا ہو گا (34)

اصغر سودائی بنیادی طور پر غزل گو شاعر ہیں۔ انہوں نے نعتیں بھی کافی تعداد میں لکھی ہیں۔ بطور نعت گو وہ اُردو شاعری میں ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔ آپ نے پاکستان کو ''نعرہء پاکستان'' دیا جو آپ کے ایک ترانے میں موجود ہے۔ آپ کا پہلا شعری مجموعہ ''شہِ دوسرا'' بزم رومی و اقبال نے 1989ء میں شائع کیا۔ دوسرا شعری مجموعہ ''چلن صبا کی طرح''

صدیقی پبلی کیشنز لاہور نے 1999ء میں شائع کیا۔ ''کرن صدا کی طرح'' اصغر کا تیسرا شعری مجموعہ ہے۔(35)

اُن کا نعتیہ مجموعہ ''شہ دوسرا'' تعجب انگیز اور تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ اصغر نے نعت کہنے کے لیے غزل کا پیرایہ استعمال کیا ہے۔ اپنی نعتوں سے اصغر نے مسلمانوں کی اصلاح کا کام بھی کیا ہے۔ اصغر اپنی شاعری میں حضورؐ کے نام لیوا عظیم ہستیوں کی صفات بھی بیان کرتے ہیں یہاں اقبال کے مردِ مومن کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ اصغر کی نعت جدید و قدیم کا خوبصورت امتزاج ہے۔ جدید موضوعات کے ساتھ وہ قدیم روایات کا دامن بھی نہیں چھوڑتے۔ اصغر سودائی کے کلام پر اقبال، حفیظ اور حالی کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔ اصغر کے نعتیہ اسلوب میں عربی لفظوں، آیتوں کے ساتھ ساتھ تلمیحات اور حوالے بھی بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ اصغر کی نعتوں کا ایک اہم عنصر ان کی فارسی تراکیب کا استعمال اس لیے زیادہ ہے کہ حافظ کا دیوان ہمیشہ اُن کے زیرِ مطالعہ رہا۔ اُن کی نعت میں صنعتوں کا استعمال بھی نظر آتا ہے۔ سب سے زیادہ انہوں نے صنعت تضاد کو استعمال کیا ہے جو نمایاں اور دلکش نظر آتی ہے۔(36)

اصغر کو وطن سے بے پناہ محبت ہے۔ وطن کے لیے قربانیاں دینے والوں میں اصغر خود بھی شامل تھے۔ وطن کے لیے محبت اور قربانیوں کا اظہار اُن کی غزلوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اصغر کی غزل میں ذاتی کرب کے پس پردہ معاشرتی زندگی، اس کی کشمکش، زندگی کے تضادات اور اس میں پائی جانے والی پیچیدگی کا اظہار بھی ہوتا ہے۔ غزلیہ اسلوب کی وجہ سے اصغر کی تمام نعتیں قافیہ بندی کے حوالے سے عمدہ مثالیں ہیں۔ آپ کی لمبی بحر کی نعتوں میں روانی، تسلسل، آہنگ، لے اور نغمگی پائی جاتی ہے۔ ایک طرف فارسی آمیز لہجہ اور دوسری طرف ہندی زبان کا اثر بھی اُن کی غزل میں موجود ہے۔ اُن کی غزل میں بہت زیادہ ہندی الفاظ بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو:

دنیا کے اک اک گوشے میں تیرا نور ظہور
غارِ حرا ہو، کوہ صفا ہو ، یا منزل طور
ہم ہیں تیرے عاصی بندے تو ہے بخشنہار
تو رحمان رحیم ہے مولا تو ستار غفور (37)

رشید آفریں نے مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی۔ اُن کا شعری کلام ''ادب لطیف''، ''ادبی دنیا''، ماہنامہ ''ماہ نور'' لاہور ''اقدار'' کراچی، ، ہفت روزہ ''برمنگھم'' برطانیہ اور

''اوراق'' لاہور میں شائع ہوتا رہا۔ آپ کے چار شعری مجموعے ''وجہ آفریں''، ''دست ساحل''، ''دامن احساس''، اور ''فخر دو عالم'' شائع ہو چکے ہیں۔(38)

رشید آفریں ادب میں مقصدیت کے قائل ہیں۔ اُن کے ہاں غیر مقصدی ادب کی کوئی اہمیت نہیں۔ آپ کی شاعری میں روایت اور جدیدیت کا امتزاج پایا جاتا ہے۔ رشید ایک حساس شاعر ہیں اُن کے مشاہدات اور محسوسات اُن پر علم و عرفاں کے دروازے کھول دیتے ہیں۔ آپ نے اُردو شاعری کو پورے سماج کا ترجمان بنایا ہے۔ بھوک اور افلاس، شکایت زمانہ، یاد ماضی، معاشرتی جبر اور گھٹن، فلسفہء زندگی، پاکستانیت، جدوجہد، امن و آشتی، رنج و الم اور استحصالی قوتوں کے خلاف جنگ رشید آفریں کی شاعری کے اہم موضوعات ہیں۔ رشید آفریں کی نظموں میں حسن آفرینی اور اثر آفرینی کے احساس و جذبات واضح نظر آتے ہیں۔ انہوں نے اپنی نظموں میں ہیئت سے زیادہ موضوع اور اسلوب سے زیادہ مواد کو اہمیت دی۔ نئی بحریں، حسین و جمیل تراکیب، تصویر کشی، امیجری اور سادہ اسلوب اُن کی نظموں کو چار چاند لگا دیتا ہے۔ رشید آفریں نے نظم کی طرح غزل میں بھی ہمیشہ اپنے مفاہیم اور مطالب کو آسان، صاف اور رواں زبان میں پیش کیا ہے۔

اس حوالے سے محمد خان کلیم کی رائے ہے:

> ''رشید آفریں نے غزل کی کلاسیکی قدروں کو اپنایا ہے اور زندگی سے مربوط کر کے غم جاناں کی لطیف، نازک اور پیچیدہ حقیقت کو شعری زبان میں آسان اور دل آویز مفہوم عطا کر دیا ہے''۔(39)

جگن ناتھ آزاد رشید آفریں کی غزل کے بارے میں رقمطراز ہیں:

> ''رشید آفریں کی غزل کلاسیکی غزل اور نئی غزل کا حسین امتزاج ہے۔ اس میں نئے خیالات کی تازگی ہے اور کلاسیکی لے کا آہنگ بھی''۔(40)

رشید آفریں کی غزل میں اُن کا ماضی اور ماضی کی یادیں ہر طرف بکھری ہوئی نظر آتی ہیں۔ اُن کی غزل کچھ کھو جانے کا احساس، تلاش، جستجو اور بچھڑنے والوں کی یادوں سے مزین ہے۔ اس حوالے سے جیلانی کامران رقمطراز ہیں:

> ''اچھی شاعری وہ ہے جو انسان کی یاداشتوں کو تازہ کرے اور یہ خوبی رشید آفریں کا شاعری میں یہ درجہ تم موجود ہے''۔(41)

نمونہ کلام ملاحظہ ہو:

یہ کیا مقام ہے حیراں ہوں سحر ہے کہ فسوں
کسی کا سر ہے قلم اور کسی کا سر ہے نگوں
کبھی اُفق پہ یہ خورشید بن کے چمکے گا
ردائے وقت پہ ٹپکا ہے جو حیات کا خوں (42)

احسان اللہ ثاقب کا اُردو ادب میں بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنے اولین مجموعہ کلام ''شہرِ غزل'' میں بیس بحور کے چھیاسی اوزان میں بڑی خوبصورتی سے طبع آزمائی کی ہے۔ آج اردو شاعری میں کوئی بھی قدآور شاعر اتنی تعداد میں بحور اور اوزان میں شعر نہیں کہہ سکا۔ مزید یہ کہ انہوں نے ایک نئی بحر کا اضافہ بھی کیا ہے اور ''اسے بحرِ مترنم'' کا نام دیا ہے۔ یہ بحر تمام عروضی تقاضوں کو پورا کرتی ہے۔

نمونہ کلام ملاحظہ ہو:

کوئی ہمدرد نہ جذبوں کا شناسا نکلا
جس کو چاہا تھا وہی خون کا پیاسا نکلا
لاکھ اصنام ہیں اک بھی نہ خدا سا نکلا
جو سورج کے مقابل تھا دِیا سا نکلا ((43

ریاض حسین چودھری نے نعت کے ساتھ ساتھ دیگر اصناف سخن میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ لیکن اُن کی پہچان صرف اور صرف نعت گو شاعر کے طور پر ہی ہے۔ آپ نے نعتیہ شاعری کو آزاد اور پابند نظموں کے وسیع امکانات کے ذریعے نئے آفاق دکھائے ہیں اور غزلیہ انداز کی نعتوں کو جدید اسالیب سے ہم آہنگ کر کے بنیاد و وقار عطا کیا ہے۔ آپ کا پہلا شعری مجموعہ ''خون رگ جاں'' ہے جو ملی و قومی نظموں پر مشتمل ہے۔ آپ کے سات شعری مجموعے ''زرِ معتبر''، رزق ثنا''، ''تمنائے حضوری''، ''متاعِ قلم''، ''کشکولِ آرزو''، ''سلام علیک'' اور ''خلدِ سخن'' نعت پر مشتمل ہیں۔ ''رزق ثنا''، نعتیہ مجموعے پر انہیں صدارتی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ ''سلام علیک''، شعری مجموعہ اکیسویں صدی کی پہلی طویل نعتیہ نظم ہے۔ ریاض حسین کی نعتیہ غزلیں اُن کی جولانی طبع کی بدولت ایک طرف قصیدہ بنتی نظر آتی ہیں تو دوسری طرف اُن میں نظم کا تسلسل در آیا ہے۔ نو بہ نو ردیفیں اور زمینیں اس پر مستزاد ہیں۔ ریاض کی کائنات نعت میں گھر اور وطن کا استعارہ ایک جاندار اور توانا اکائی کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ ریاض کی نعت میں استغاثے

کا انداز نمایاں ہے۔ وہ اپنے انفرادی اور اجتماعی دکھ حضورؐ کی عدالت عظمیٰ میں پیش کر کے نظر کرم کا ملتجی ہے۔

ریاض حسین چودھری کی نعت کے تمام استعاروں کا خمیر دین و آئین رسالتؐ کے ساتھ ساتھ، عہد جدید کے معتبر حوالوں سے اُٹھا ہے اور اُن میں تقدس بھی ہے اور تازہ کاری بھی۔ اُس کا اسلوب اُردو شاعری کی تمام تر جمالیات سے مستیز ہے اور اسے جدت و شائستگی کا معیار دیا جا سکتا ہے۔(44)

احمد ندیم قاسمی ریاض حسین کی نعت نگاری کے حوالے سے رقمطراز ہیں:

''گذشتہ ربع صدی میں ہمارے ہاں نعت نگاری نے بہت فروغ پایا ہے۔ جن شعرا نے اس صنف سخن میں ہمیشہ زندہ رہنے والے اضافے کیے ہیں ان میں ریاض حسین چودھری کا نام بوجہ روشن ہے۔ حفیظ تائب اور حفیظ جالندھری کی طرح ریاض حسین نے بھی شاعری کا آغاز غزل سے کیا مگر اس کے بعد جب نعت نگاری شروع کی تو غزل کی طرف پلٹ کر نہیں دیکھا۔ ریاض اس دور کا ایک بھرپور نعت نگار ہے۔ ''بھرپور'' کا لفظ میں نے جان بوجھ کر استعمال کیا ہے۔ اُن کے کلام میں محبت کی سرشاری بھی ہے، لفظ اور لہجے کی موسیقی بھی ہے اور پھر وہ حد ادب بھی ہے جو نعت نگاری کی اولین اور بنیادی شرط ہے۔''(45)

نمونہ کلام ملاحظہ ہو:

جن کے سینے پر فروزاں اُنؐ کے ہیں نقش قدم
ایک دیوانہ مدینے کی انہی گلیوں میں تھا
ڈھونڈتا پھرتا تھا میں نقش کف پائے حضورؐ
اک عجب سا کیف میرے مضطرب سجدوں میں تھا(46)

یوسف نیر نے کافی لمبا عرصہ مرے کالج میں بطور اُستاد گذارا۔ آپ مرے کالج کی مجلس سخن اور مجلس اقبال کے انچارج رہے۔ مرے کالج کے علمی و ادبی مجلہ ''الفیض'' کے نگران رہے اور مرے کالج سے ''اقبال نمبر'' اور ''غالب نمبر'' بھی شائع کیے۔ ۱۹۸۸ء میں آپ پاکستان رائٹرز گلڈ کے مرکزی صدر منتخب ہوئے۔ پنجابی ادبی سنگت لندن نے انہیں ۲۰۰۰ء کا ادبی ایوارڈ لندن میں ایک مشاعرے کے بعد پیش کیا۔

''روشنی کا پہلا دن'' یوسف نیر کا شعری مجموعہ ہے۔ یوسف نیر کا بہت سا

شعری سرمایہ مسودوں کی صورت میں اُن کے پاس موجود ہے(47)

معاشرتی جبر اور گھٹن، آوازِ حق، غمِ جاناں و غمِ دوراں، جد جہد، اجتماعی شعور، بھوک وافلاس، امن وآشتی، روحانی فضا، تصور، وطنیت اور انسانی زندگی کی ترجمانی یوسف نیر کی شاعری کے موضوعات ہیں۔آپ نے متنوع اصناف سخن میں شعر کہے ہیں لیکن غزل آپ کی محبوب صنف سخن ہے۔ نیر کی غزل اور نظم میں فن محاسن کا بھی خوبصورت استعمال ہے۔آپ سیدھے سادے بیانیہ اسلوب میں اپنے تجربات ومشاہدات بیان کرتے ہیں۔اور سادہ دلوں پر اثر کرنے والی زبان استعمال کرتے ہیں۔ اُردو غزل کو نئے تجربات اور اسالیب سے آشنا کرنے والے شعرا میں یوسف نیر کا نام سرفہرست ہے۔آپ نے حسن وعشق اور جنسی تجربات کو بڑے خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے لیکن روایتی شعرا کی طرح گیسو، لب ورخسار میں گم رہتے نظر نہیں آتے۔عدیم ہاشمی یوسف نیر کے اسلوب کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''اُردو غزل نے جس جدت کے ساتھ پچاس کی دہائی کے آخر اور ساٹھ کی دہائی کی ابتدا میں آنکھیں جھپکیں، جس ڈکشن اور جس اسلوب نے اردو غزل کو پرانی غزل سے علیحدہ کر کے نئی جدید غزل کا پیراہن پہنایا۔ یوسف نیر کی غزل اسی جدید غزل کی نمائندگی کرتی ہے۔''(48)

جس سرزمین نے اقبال اور فیض پیدا کیے اس زمانے میں صابر ظفر پیدا کیا ہے۔صابر کے لکھے ہوئے دل میں اُتر جانے والے گیتوں اور نظموں کے بول، چھوٹی بحروں میں جدید رویوں کی ضمانت غزلیں اکثر سامعین ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر سنتے رہتے ہیں۔آپ کا پہلا شعری مجموعہ ''ابتدا'' ہے جسے التحریر ادارہ لاہور نے شائع کیا۔''دھواں اور پھول''، ''پاتال''، ''جتنی آنکھیں اچھی ہوں گی''، ''دریچہ بے صدا کوئی نہیں''، ''لہو ترنگ''، ''دکھوں کی چادر''، ''بارہ دری میں''، ''اک تری یاد رہ گئی باقی''، ''عشق میں روگ ہزار''، ''بے آہٹ چلی آتی ہے موت''، ''صابر ظفر کی مزاحمتی شاعری''، ''چین اک پل نہیں''، ''پل دو پل کی چاہت میں''، ''اُڑان''، ''محبت کا نیل کنٹھ''، ''کوئی لو چراغ قدیم کی''، ''نامعلوم'' اور ''ترے عشق نے مالا مال کیا''۔(49)

صابر ظفر کے شہرہ آفاق شعری مجموعے ہیں۔اب تک تیس کے قریب اُن کے شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں اور کچھ مسودوں کی صورت میں اُن کے پاس موجود ہیں۔

صابر ظفر جدید غزل گو شاعر ہیں۔اُن کے ہاں جبر کے خلاف شدید تلخی پائی جاتی ہے اور

انصاف کشی پر انہیں طیش آتا ہے۔ صابر ظفر نے اپنی غزل میں داخلیت اور خارجیت کی پرانی بحث کو بالکل ختم کر دیا ہے۔ اور یہ ثابت کیا ہے کہ داخلیت خارجیت سے متاثر ہوتی ہے اور خارجیت کے بغیر بلاغت سے محروم رہ جاتی ہے۔ آپ نے اپنی غزل میں حقائق حیات کی ترجمانی کی ہے۔ صابر ظفر تخیل کے ریلے میں تعقل سے کبھی دست کش نہیں رہتا۔ وہ خارجی آنکھ کھولے رکھتا ہے تاکہ اس کی باطنی آنکھ کی بصارت دھندلا نہ جائے۔ تغزل میں شعور کی آمیزش، جس کا آغاز غزل میں غالب نے کیا اور جسے فراق نے اعتبار بخشا، صابر ظفر کے ہاں حسن کاری اور حقیقت نگاری کا ایک دلآویز سنگھم بن کر نمودار ہوئی ہے۔ صابر ظفر کی غزل یقیناً غزل کی کلاسیکی روایت سے پھوٹی ہے مگر اس نے دوسرے ہم سفروں کی طرح اس روایت میں اپنی شخصیت، اپنا منفرد رویہ اور اپنے عصر کی روح شامل کر کے ایک نئی روایت کی داغ بیل پڑنے کا امکان بھی پیدا کر دیا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کی صابر ظفر کی ابتدائی غزل کے بارے میں یہ رائے ہے:

> ''نئی اُردو غزل کا ذکر چھڑے تو بات صابر ظفر تک ضرور پہنچتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس نے نئی غزل کی سمفنی میں ایک ایسی آواز کا اضافہ کیا ہے جو اس سے ہم آہنگ ہی نہیں آوازوں کے اس جھرمٹ سے الگ بھی ہے۔ صابر ظفر کے کلام میں ابھی سے ایک پائیدار نقش بننے کا وصف نمایاں ہو رہا ہے۔'' (50)

نمونہ کلام ملاحظہ ہو:

صورت مرگ فقط راہ کی ٹھوکر نکلی
زندگی تو مرے اندازے سے کم تر نکلی
آتش کبر نکلتی ہی نہ تھی دل سے ظفرؔ
چوب منبر کو جلایا تو یہ کافر نکلی (51)

مذکورہ بالا شعرا کی شاعری کے تحقیقی و تنقیدی جائزے کے بعد میری رائے یہ ہے کہ سیالکوٹ کی اردو شاعری عالمی اردو شاعری کے ہم پلہ ہے۔ سیالکوٹ کی شاعری کے اپنے موضوعات اور اسالیب بھی ہیں اور عالمی اردو شاعری کے موضوعات اور اسالیب کو بھی سیالکوٹ کی شاعری میں دیکھا جا سکتا ہے۔ سیالکوٹ کی شاعری پر دبستان دہلی اور لاہور کی شعری روایت کے اثرات بھی رہے ہیں۔ قیام پاکستان سے پہلے یہاں کے شعرا نے دہلوی شعری روایت کے اثرات کو قبول کیا اگرچہ قیام پاکستان کے بعد ان پر لاہور کی شعری روایت کے اثرات رہے ہیں۔ تاہم ان اثرات کے باوجود سیالکوٹ کی شاعری کا اپنا مزاج بھی ہے۔ سیالکوٹ کی شاعری

پر کشمیر کے حالات و واقعات کے اثرات کے ساتھ ساتھ تقسیم ہند کے بھی اثرات رہے۔ ادبی، سیاسی اور مذہبی تحریکوں نے بھی یہاں کی شاعری کو متاثر کیا۔

سیالکوٹ مذہبی تحریکوں کا بھی ایک اہم مرکز رہا ہے۔ اقبال سمیت یہاں کے اکثر شعرا نے مذہب کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ اقبال و فیض کے شعری دبستانوں نے بھی سیالکوٹ کی شاعری پر گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ موجودہ دور کے شعرا بھی مذکورہ بالا سیالکوٹ کی شعری روایت کو برقرار رکھے ہوئے ہیں۔

حوالہ جات

1۔ زوبیہ چوہدری ''تاب اسلم۔شخصیت اور شاعری''، مقالہ برائے ایم۔اے اردو (غیر مطبوعہ)، لاہور، پنجاب یونیورسٹی، ۲۰۰۴ء، ص:۶

2۔ ڈاکٹر وحید قریشی، ''پیش لفظ''، مشمولہ، ''باقیاتِ تاثیر''، از مجید احمد تاثیر، لاہور، الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء، ص:۵، ۶

3۔ نوحی بریلوی بحوالہ ''یوسف رحمت''، ''عبدالنبی شجر طہرانی۔شخصیت اور شاعری'' مقالہ برائے ایم۔فل اردو (غیر مطبوعہ)، اسلام آباد، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، ۱۹۹۳ء، ص:۱۲

4۔ اعجاز الرحمن، ''شجر کی شاعری کی قدر و قیمت''، مشمولہ ''بہار شجر''، ص:۱۱

5۔ رشید آفرین، بحوالہ ''یوسف رحمت''، عبدالنبی شجر طہرانی۔شخصیت و شاعری''، ص:۷۷

6۔ ڈاکٹر نظیر حسین زیدی، ''ظفر علی خان کی شعری تصانیف''، مطبوعہ ''چناب میگزین''، سیالکوٹ، گورنمنٹ ڈگری کالج وزیر آباد، ۱۹۸۶ء، ص:۱۳۲

7۔ ایضاً، ص:۱۳۵

8۔ امین حزیں، ''نوائے سروش''، لاہور، الفیصل ناشران، ۲۰۰۶ء ص:۵، ۶

9۔ حبیب کیفوی، ''امین حزیں۔عبد السمیع پال''، مشمولہ ''اقبال ریویو''، ص:۷۰

10۔ ڈاکٹر انور سدید، ''اردو ادب کی مختصر تاریخ''، لاہور، اے ایچ پبلشرز، اپریل ۱۹۹۶ء ص:۳۳۷

11۔ امینِ حزیں، سرود سرمدی، الفیصل ناشران، لاہور، ۲۰۰۶ء، صفحہ ۱۱

12۔ صادق حسین، ''برگ سبز''، لاہور، فیروز سنز، ۱۹۷۷ء، ص:۶۱

13۔ حبیب کیفوی، ''کشمیر میں اردو''، لاہور، مرکزی اردو بورڈ، بار اول، ۱۹۷۹ء، ص:۲۱۳، ۲۱۹

14۔ حبیب کیفوی، ''کشمیر میں اردو''، ص:۲۱۶، ۲۱۷

15۔ اثر صہبائی، بحضور سرور کائنات، لاہور، انجمن حمایت اسلام، ۱۹۶۰ء، ص ۱۵

16۔ ضیا محمد ضیا بحوالہ ''افشیں عظیم''، ''فاخر ہریانوی''، مقالہ برائے ایم۔اے اردو (غیر مطبوعہ)، لاہور، پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۹۴ء، ص:۶۵

17۔ احمد ندیم قاسمی بحوالہ ''افشین عظیم''، ''فاخر ہریانوی''، ص: ۴۷

18۔ پروفیسر حمد احمد خان، ''تعارف'' مشمولہ ''موج صبا'' از فاخر ہریانوی، لاہور، ایوانِ ادب، ۱۹۶۶ء، ص: ۳

19- Dr. Muhammad Sadiq, "A History of Urdu Literature", Dehli, Oxfored University Press, 1984, Page No. 528-29

20۔ مکتوب احمد ندیم قاسمی بنام حفیظ صدیقی، بمقام لاہور، بتاریخ 10 فروری 1986ء

21۔ فاخر ہریانوی، موجِ صبا، لاہور، ایوانِ ادب، ۱۹۶۶ء، ص ۴۸

22۔ رخشہ نسیم، ''سیالکوٹ میں اردو شاعری (بیسویں صدی کے دوران)''، مقالہ برائے ایم اے اردو، ۱۹۷۹ء، ص: ۵۷

23۔ عبدالحمید عرفانی، کلیاتِ عرفانی (زیرِ طبع)

24۔ ڈاکٹر طاہر تونسوی، ''فیض کی تخلیقی شخصیت''، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۹ء، ص: ۱۷

25۔ ایضاً، ص: ۲۳

26۔ احمد ندیم قاسمی، ''مجید احمد تاثیر''، مشمولہ ''باقیات تاثیر''، لاہور، الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء، ص: ۱۰

27۔ ڈاکٹر سید عبداللہ، رباعیات تاثیر مشمولہ ''باقیاتِ تاثیر'' لاہور، الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء، ص: ۲۸

28۔ مجید احمد تاثیر، باقیات تاثیر، لاہور، الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء، صفحہ ۳۳

29۔ زاہدہ پروین رضوی، ''طفیل ہوشیار پوری''، مقالہ برائے ایم اے اردو، لاہور، اورینٹل کالج جامع پنجاب، ۱۹۸۸ء، ص ۸-۱۰

30۔ ڈاکٹر سید عبداللہ، ''شعلہ جام پر ایک نظر''، مشمولہ ''شعلہ جام''، احسان اکیڈمی، لاہور، ۱۹۷۸ء ص: و

31۔ طفیل ہوشیار پوری، شعلہ جام، لاہور، فنون پریس، ۱۹۷۸ء ص ۳۵

32۔ زوبیہ چوہدری، ''تاب اسلم شخصیت اور شاعری''، مقالہ برائے ایم۔اے اردو، لاہور، ۲۰۰۴ء، ص: ۱۲

33۔ جابر علی سید، موج آہنگ، ملتان، گورنمنٹ کالج، ۱۹۹۸ء ص ۵۵

34۔ سبط علی صبا، طشت مراد، واہ کینٹ، مجلس تصنیف و تالیف، ۱۹۸۶ء ص ۵۱

35۔ رضوانہ کوثر، ''اصغر سودائی۔فن اور شخصیت''، مقالہ برائے ایم۔اے اردو، لاہور، پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۹۷ء، ص: ۹

36۔ ایضاً، ص: ۹۳

37۔ اصغر سودائی، شہرِ دوسرا، سیالکوٹ، بزمِ رومی و اقبال، ۱۹۸۹ء، ص ۲۵

38۔ راقم الحروف کا رشید آفریں سے انٹرویو، بمقام سیالکوٹ، بتاریخ 15 اپریل 2011ء

39۔ محمد خان کلیم، ''کچھ وجہ آفریں کے بارے میں'' مشمولہ ''وجہ آفریں''، ص: ۱۴

40۔ جگن ناتھ آزاد (فلیپ)، ''دستِ ساحل''، از رشید آفریں

41۔ جیلانی کامران، ''تقریب رونمائی دستِ ساحل''، مشمولہ ہفت روزہ ''نوائے ڈسکہ''، جلد ۷،

شمارہ ۱، ڈسکہ، ۲۴ تا ۳۱ دسمبر ۱۹۹۵ء، ص: ۴
42۔ رشید آفریں، وجہِ آفریں، سیالکوٹ، مکتبہِ فردوس، ۱۹۷۳ء، ص ۱۷
43۔ عطا اللہ، قاضی، شعرائے پسرور، پسرور، ادبی سبھا، ۱۹۹۵ء، ص ۲۲۰
44۔ حفیظ تائب، ''پیشوائی''، مشمولہ ''زرِ معتبر'' از ریاض حسین چوہدری، لاہور، خزینہ علم و ادب، ستمبر ۲۰۰۰ء، ص: ۲۳
45۔ احمد ندیم قاسمی، (سرورق)، ''زرِ معتبر'' از ریاض حسین چوہدری
46۔ ریاض حسین چودھری، رزق ثنا، لاہور، خزینہ علم و ادب، ۲۰۰۰ء، ص ۵۲
47۔ راقم الحروف کا یوسف نیر سے انٹرویو، بمقام سیالکوٹ، بتاریخ ۱۸ جولائی ۲۰۱۱ء
48۔ عدیم ہاشمی، (فلیپ)، ''روشنی کا پہلا دن'' از یوسف نیر، لاہور، الحمد پبلی کیشنز، ۱۹۹۲ء
49۔ صابر ظفر، ''محبت ہو نہیں پاتی''، (فلیپ)، لاہور، نگارشات پبلشرز، ۲۰۰۵ء
50۔ ڈاکٹر وزیر آغا، (سرورق)، ''ابتدا'' از صابر ظفر، لاہور، التحریر، ۱۹۷۴ء
51۔ صابر ظفر، محبت ہو نہیں پاتی، مرتبہ طاہر نظامی، لاہور، نگارشات پبلشرز، ۲۰۰۵ء، ص ۱۵

سیالکوٹ میں صوفیانہ شاعری کی روایت

اردو ادب میں عرفان و تصوف کی روایت ایک بلند مقام و مرتبہ رکھتی ہے۔ اردو کے ہر بڑے شاعر نے صوفیانہ تصورات میں اپنے جوہر دکھا کر عشقِ خدا سے اپنے ایمان کو منور کیا ہے۔ تصوف میں خدا کے حوالے سے کائنات، موجودات اور اسرار و رموز کا بیان کیا جاتا ہے۔ ہندوستان کے بڑے بڑے اردو دبستانوں میں صوفیانہ شاعری کی روایت کا اپنا مقام ہے۔ ان دبستانوں میں اردو ادب کے بڑے بڑے مشاہیر پیدا ہوئے اور صوفیانہ شاعری کی روایت میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان دبستانوں میں سیالکوٹ کا علاقہ بھی ایک اہم دبستان کی حیثیت رکھتا ہے۔ پیشِ نظر آرٹیکل میں سیالکوٹ کے کچھ شعرا کی صوفیانہ شاعری کا تحقیقی و تجزیاتی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ کلامِ اقبال میں تصوف بھی ایک نمایاں موضوع ہے۔ اقبال کا فطری رجحان متصوفانہ فکر و فلسفہ کی طرف تھا۔ یورپ میں یورپی فلسفہ پڑھنے سے یہ میلان اور بھی زیادہ قوی ہو گیا تھا کیونکہ یورپی فکر و فلسفہ کا رجحان وحدت الوجود کی طرف تھا۔ قرآن پاک پر تدبر کرنے اور تاریخ اسلام کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد اقبال کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور انہوں نے قرآن کے مطالعہ کی وجہ سے اپنے قدیم نظریہ کو ترک کر دیا۔ اقبال کو اس مقصد کے لئے اپنے طبعی رجحانات کے ساتھ دماغی و قلبی جہاد کرنا پڑا۔ اقبالؒ کے درج ذیل اشعار میں یہ رجحان واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے:

چمک تیری عیاں بجلی میں، آتش میں، شرارے میں
جھلک تیری ہویدا چاند میں سورج میں، تارے میں
جو ہے بیدار انساں میں وہ گہری نیند سوتا ہے
شجر میں پھول میں حیواں میں پتھر میں ستارے میں (1)

یہ ابتدائی وقت تھا جب اقبالؒ وحدت و لوجود کے فلسفہ سے بہت زیادہ متاثر تھے لیکن بعد میں قرآن و حدیث اور سیرت طیبہ ﷺ کے عمیق مطالعہ سے اس عقیدہ و فلسفہ سے تائب ہو گئے۔ اقبالؒ تصوف کو دو شاخوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ ایک تصوف جو نا امیدی، عجز و ناتوانی

کی تعلیم دیتا ہے۔ وہ اس کو عجمی تصور کر کے اس کی مخالفت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

حذر اس فقر و درویشی سے جس نے
مسلماں کو سکھا دی سر تبریزی(2)

دوسرا تصوف وہ جو جوش وجذبہ اور حرکت وحرارت کی نصیحت کرتا ہے۔ جس کے سامنے شہنشاہیت کی کوئی اہمیت وحیثیت نہیں۔ اس حوالے سے کلامِ اقبال ملاحظہ ہو:

چشم و گوش و لب کشا اے ہوش مند !
گر نہ بینی راہ حق برمن نخند(3)

اقبالؒ اپنی فارسی شاعری میں ایک جگہ یوں فرماتے ہیں:

می شود ہر مود رازے خرقہ پوش
آہ!زیں سوداگر ان دیں فروش
واعظاں ہم صوفیاں منصب پرست
اعتبار ملتِ بیضا شکست(4)

اقبالؒ کے نزدیک اصل حیات طاقت ہے۔ اس لئے وہ طاقت کو جہاں اور جس رنگ میں دیکھتے ہیں بہت زیادہ پسند کرتے ہیں۔ جرمن فلاسفر نطشے کو اسی لئے پسند کرتے تھے کہ وہ قوت وطاقت کا قائل تھا۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

مرا سبوچہ غنیمت ہے اس زمانے میں
کہ خانقاہ میں خالی ہیں صوفیوں کے کدو(5)
اب حجرہ صوفی میں وہ فقر نہیں باقی
خون دل شیراں ہو جس فقر کی دستاویز
اے حلقہ درویشاں وہ مرد خدا کیسا
ہو جس کے گریباں میں رستاخیز(6)

اقبالؒ کے نزدیک موجودہ عجمی خانقاہیت عقائد واعمال میں خرابی پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کر رہی ہے۔

چند اشعار ملاحظہ ہوں:

سکھا دیے ہیں اسے شیوہ ہائے خانقہی

فقیہ شہر کو صوفی نے کر دیا ہے خراب(7)
نہ مومن ہے نہ مومن کی امیری
رہا صوفی گئی روشن ضمیری(8)

اقبالؒ اپنے صوفیانہ انداز پر بہت نازاں ہیں۔انہوں نے تصوف کے آغوش میں پرورش پائی اور فلسفے کی صحبت میں تربیت حاصل کی۔تصوف اور حکمت کے امتزاج نے اقبال کے اشعار میں وہ معجزہ بیانی اور مضمون آفرینی پیدا کی جو اردو ادب میں کسی اور شاعر کے ہاں کمیاب ہے۔ان کے اندازِ بیان میں بے اندازہ لطافت اور رنگینی پائی جاتی ہے۔اس حوالے سے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

رند کہتا ہے ولی مجھ کو ولی رند مجھے
سن کے ان دونوں کی تقریر کو حیراں ہوں میں
زاہد تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلماں ہوں میں
کوئی کہتا ہے کہ اقبال ہے صوفی مشرب
کوئی سمجھتا ہے کہ شیدائے حسیناں ہوں میں
دیکھ اے چشمِ عدو مجھ کو حقارت سے نہ دیکھ
جس پر خالق کو بھی ہو ناز وہ انساں ہوں میں
مزرعِ سوختۂ عشق ہے حاصل میرا
دردِ قربان ہو جس دل پہ وہ ہے دل میرا(9)

تصوف سے بھرپور ایک مناجات کے چند اشعار ملاحظہ ہوں جو غزل کی ہیئت میں لکھی گئی ہے۔اس مناجات کے پڑھنے میں جو لطف ہے وہ اسلامی دل کا ہی حصہ ہے۔کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں
طرب آشنائے فروش ہو تو نوائے محرم گوش ہو
وہ سرود کیا کہ چھپا ہوا ہو سکوتِ پردہ ساز میں
تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے ترا آئینہ ہے وہ آئینہ

کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں
نہ کہیں جہاں میں اماں ملی جو اماں ملی تو کہاں ملی
مرے جرم خانہ خراب کو ترے عفو بندہ نواز میں(10)

اقبالؒ اپنے دور کے خانقاہی نظام سے سخت بیزار تھے۔ وہ اپنے زمانے کی خانقاہوں کے حالات کا تذکرہ افسوس اور دکھ کے ساتھ اس طرح کرتے نظر آتے ہیں:

قم باذن اللہ کہہ سکتے تھے جو رخصت ہوئے
خانقاہوں میں مجاور رہ گئے یا گورکن(11)

اقبالؒ اپنے کلام میں ایک جگہ یوں نوحہ کناں دیکھے جاسکتے ہیں:

نذرانہ نہیں سود ہے پیرانِ حرم کا
ہر خرقہ ء سالوس کے اندر مہاجن
میراث میں آئی ہے انہیں مسند ارشاد
زاغوں میں تصرف میں، عقابوں کے نشیمن(12)

اقبالؒ ان مراقبوں اور ذکر واذکار کو بے فائدہ خیال کرتے ہیں جو مصائب وآلام کا علاج نہ ہوں۔ اس حوالے سے کلامِ اقبال ملاحظہ ہو:

یہ ذکر نیم شبی ،یہ مراقبے ،یہ سرود
تری خودی کے نگہباں نہیں تو کچھ بھی نہیں(13)

"ہندی اسلام" میں اقبالؒ موجودہ طریقِ خانقاہی کو یوں بیان کرتے ہیں:

اے مردِ خدا تجھ وہ قوت نہیں حاصل
جا بیٹھ کسی غار میں اللہ کو یاد کر
مسکینی و محکومی و نومیدی جاوید
جس کا یہ تصوف ہو وہ اسلام ایجاد کر(14)

مجاہدانہ حرارت رہی نہ صوفی میں
بہانہ بے عملی کا بنی شراب الست
گریز کشمکش زندگی سے مردوں کی

اگر شکست نہیں ہے تو اور کیا ہے شکست (15)

مولوی فیروز الدین انجمن حمایتِ اسلام کے سرگرم کارکن تھے۔ اکثر انجمن کے جلسوں میں شریک ہوتے۔ انجمن کے تیسرے سالانہ جلسے منعقدہ 25 تا 27 فروری 1888ء میں سیالکوٹ سے جو لوگ شریک ہوئے ان میں مولوی صاحب موصوف شیخ محمد اقبال (علامہ اقبال جوان دنوں سکاچ مشن کے طالب علم تھے) کے علاوہ دیگر اصحاب بھی شامل تھے۔ (16) مولوی صاحب صرف عالمِ دین ہی نہ تھے بلکہ صاحب عشق بھی تھے۔ ان کا محبوب شاعروں کا روایتی محبوب نہیں جو اپنے چاہنے والوں کو ذلت سے آشنا کرتا ہے۔ ان کا محبوب وہ ہے جو اپنے چاہنے والوں کو دنیاوی محبوب سے بے نیاز بلکہ بیزار کر دیتا ہے۔ ان کی عارفانہ کلام کا ایک بند ملاحظہ ہو:

جب سے اس مہوش کو دیکھا کچھ نہ عقل و ہوش ہے
بادۂ الفت سے دل اپنا میرا مدہوش ہے
ساقی قدرت سے بے بس آواز نوشانوش ہے
اس پیارے حسن کا دل میں ہمارے جوش ہے
مت کرو کچھ ذکر ہم سے ترک یا تاتار کا (17)

امینِ حزیں کی شاعری وجدان و تصوف جیسے موضوع سے بھری پڑی ہے۔ ان کے نزدیک دنیا میں روشنی صرف اور صرف وجدان کی وجہ سے ہے اور وجدان کا انسانی عظمت میں اہم کردار ہے۔ وجدان کے حوالے سے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

دیکھا ہے تصور میں اِک مست تغافل کو
کونپل میں نظر آیا گلشن دلِ بلبل کو
اِک پل میں پہنچتا ہوں میں عرشِ حقیقت تک
جب ایڑہ بتاتا ہوں وجدان کے دلدل کو
وجدان کے شعلے سے دنیا میں اجالا ہے
نام آدمِ خاکی کا اس نے اچھالا ہے
تصویر مکمل ہے وجدان کی رفعت کی
کہتے ہیں نبی جس کو وجدان کا ہمالہ ہے (18)

خدائے بزرگ و برتر کی حمد و ثنا کرنا ہر سچے مسلمان کی فطرت ہے۔ امینِ حزیں ایک

سچے اور کھرے مسلمان ہیں وہ اللہ تعالی کی حمد وثنا بھی کرتے ہیں۔مشکل وقت میں اس کے سامنے التجا بھی کرتے ہیں وہ اللہ تعالی کو مشکل کشا اور حاجت روا سمجھتے ہیں۔ان کا عقیدہ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی اور ذات حاجت روائی نہیں کر سکتی اس لئے امینِ حزیں فقط اسی ذات کے سامنے سربسجود ہوتے ہیں۔

عارف میرٹھی کی شاعری میں بھی عرفانی تصورات جا بجا ملتے ہیں۔عشق وجنون،عشقِ حقیقی اور تصوف ان کی شاعری کے اہم موضوعات ہیں۔چند اشعار ملاحظہ ہوں:

نورِ عرفاں جو میرے چشم کو بینا کر دے
ذرہ ذرہ سے عیاں طور کا جلوہ کر دے
تو اگر چشمِ عنایت کا اشارہ کر دے
کاہ کو کوہ کرے، قطرہ کو دریا کر دے
کششِ عشق جو جذبات مہیا کر دے
قوتِ ضبط کو منصور کا دعویٰ کر دے(19)

خدائے بزرگ و برتر کی تعریف وتوصیف کرنا ایک مومن کے ایمان کا لازمی جز ہے۔ اثرؔ صہبائی کی شاعری میں بھیعارفانہ تصورات جا بجا نظر آتے ہیں۔اس حوالے سے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

تیری بہار جانفزالالہ و یاسمن میں ہے
تیرا جمال دلکشا تاروں کی انجمن میں ہے
بادِ صبا میں تیری نکہت خوش بسی ہوئی
تیرا ہی جلوہ ضوفشاں پھولوں کے پیرہن میں ہے
کعبہ و دیر میں عبث ہم تھے ڈھونڈتے رہے
تو ہی کلی کلی میں ہے تو ہی چمن چمن میں ہے
رنگ میرے خیال کا، فیض تیرے جمال کا
کیف تیرے وصال کا میری مئے سخن میں ہے(20)

اثرؔ صہبائی کی طبیعت شروع ہی سے حکیمانہ ومتصوفانہ موضوعات کی طرف مائل تھی۔ کلامِ اقبال کا مطالعہ وہ شروع ہی سے کرتے تھے۔نتیجہ یہ ہوا کہ اس نوجوان شاعر کا کلام حقائق و

معارف کے انمول جواہرات سے مالا مال ہو گیا۔ کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

یاد تیری شراب ہے ذکر تیرا سرود ہے
کیف طرب میں موج زن میرا یم وجود ہے(21)
ذرے ذرے میں خیابار ہے طلعت تیری
پتے پتے میں چمن ساز ہے جلوہ تیرا
سنگِ اسود میں ہے مستور حقیقت تیری
اور صنم خانوں میں ہے جلوہ پیدا تیرا
تیرا ہی ہے کعبہ ہو کہ مے خانہ ہو
شیخ تیرا ہے غریقِ خم صہبا تیرا(22)

وجود مطلق یا ہستی خدا صوفیانہ شاعری میں یہ مسئلہ ہمیشہ زیرِ بحث رہا ہے۔ اس کے ساتھ مسئلہ جبر وقدر بھی ہمیشہ سے انسانی خیالات کا موضوع رہا ہے۔ فلاسفر اور صوفی تو کیا ایک عام انسان بھی کبھی کبھار یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ یہ مسائل نہایت اہم اور پیچیدہ ہیں اور قوم کے مفکرین ان کے متعلق اپنے اپنے نظریات رکھتے ہیں۔ اثرؔ صہبائی نے بھی ان مسائل پر روشنی ڈالی ہے۔ کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

تیری ہستی کا کچھ یقیں بھی نہیں
میرے لب پر مگر ''نہیں'' بھی نہیں
دیکھتا ہوں تو ہر جگہ موجود
سوچتا ہوں تو پھر کہیں بھی نہیں(23)

مسئلہ جبر وقدر کے حوالے سے یوں رقمطراز ہیں:

بیگانہ ہوش ہوں کہ ہوشیار ہوں میں
ہوں عالمِ خواب میں کہ بیدار ہوں میں
فطرت کی ستم ظریفیاں تو دیکھو
''مجبور'' کو وہم ہے کہ ''مختار'' ہوں میں(24)

مضطرؔ نظامی کی شاعری میں تصوف کے مضامین بکثرت ملتے ہیں۔ ان کی شاعری

میں ایک طرح کی پاکیزگی اور تقدس کا احساس پایا جاتا ہے۔ تصوف کی وجہ سے مضطرؔ نے بعض اوقات محبوبِ حقیقی کا عکس دکھایا ہے۔ معرفت کے رموز و بیان کیے ہیں اور زندگی کی حقیقتوں اور سچائیوں کو بھی اپنی شاعری میں سمویا ہے۔ وہ ایک صوفی نہ سہی لیکن تصوف کا رنگ ان کی شاعری میں نمایاں ہے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

کر شکوہ نہ بے مہری احباب کا مضطرؔ
کوئی نہیں تیرا تو میری جان خدا ہے
دل بادہ توحید سے پر نور ہے مضطرؔ
ساقی کا کرم ہے غمِ صہبا نہیں رکھتی (25)

مضطر کی شاعری میں زندگی کا یہ رخ بھی نمایاں ہے کہ انساں کا مقام اور مرتبہ بہت بلند ہے۔ بشرط کہ اسے عرفانِ ذات اور عرفانِ خداوندی حاصل ہو جائے اور وہ اپنا مقام و مرتبہ پہچان لے تو وہ خاک سے اکسیر بن جاتا ہے۔ اسی کیفیت کی بازگشت مضطر کی شاعری میں نمایاں ہے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

مہ و ستارہ تو ادنیٰ غلام ہیں تیرے
مہ و ستارا سے اعلیٰ مقام پیدا کر
جسے نہ توڑ سکے گردشِ ضربِ افلاک
کرم اے ساقی مہوش وہ جام پیدا کر (26)

انسان جب تک زندگی میں عشق کی دولت سے مالا مال نہیں ہوتا اس وقت تک وہ زندگی میں اہم مقام پیدا نہیں کر سکتا۔ مضطرؔ کی شاعری میں یہ درس عام ملتا ہے۔ انھوں نے انسان کے اندر عشق کی قوت لازوال کو پیدا کرنا چاہا ہے۔ جس کے فیضان سے انسان زندگی کی حقیقتوں اور رفعتوں سے صحیح معنوں میں لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

اپنی صدا کے دل سے تو بانگِ درا کا کام لے
دم کہیں کارواں نہ دے اس کا اعتبار نہ کر (27)
مرتا ہے عشق بھی کہیں مرتا ہے عشق بھی
تکلیف اس رہن و دار کے قربان جایئے (28)
پہلے منصور صفت سر تو کٹا لے اپنا

پھر کہیں دعویٰ بھی اے عاشق ہر جائی کر(29)

تغزل کیفیات حسن وعشق کے اس ایمائی اظہار کا نام ہے۔جس میں شدت ہوتی ہے۔ مگر شائستگی اور خلوص لے کر آتی ہے۔حسنِ ادا کے ساتھ ساتھ فلسفہ وتصوف کے مضامین میں تغزل تب آتا ہے۔ جب انھیں عشق ومحبت کے انداز میں ادا کیا جاتا ہے۔تغزل میں تفصیل سے زیادہ ایجاز واختصار، ہیجان کی بجائے ضبط اور وضاحت کی بجائے ایمائیت ہوتی ہے۔مضطرؔ کی شاعری میں مذکورہ بالا تغزل کے سبھی رنگ، انداز اور موضوعات پائے جاتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ڈھونڈتی پھرتی ہے آنکھ اس نگاہ ناز کو
چھپ گیا ہے چھوڑ کر جو صورت بسمل مجھے
کوئی ظاہر پہ مرتا ہے کوئی باطن پہ اے مضطرؔ
کسی کا دل حسیں ہے اور کسی کی ہیں حسین آنکھیں(30)
ہم غفلت محبوب کا شکوہ نہیں کرتے
اک راز محبت ہے افشا نہیں کرتے
خوباں کی ولایت کے دستور نرالے ہیں
زندانی اُلفت کو آزاد نہیں کرتے(31)

عقل وعشق اردو اور فارسی شاعری کا قدیم موضوع ہے۔عشقیہ شاعری میں عقل مصلحت اندیشی اور احتیاط کے معنی میں آتا ہے۔اور عشق اس والہانہ محبت کا نام ہے۔ جو آداب مصلحت سے نا آشنا ہے۔مضطرؔ نے عقل وعشق کے تصورات صوفی شعرا سے لے کر ان پر جدید فلسفہ واحدانیت کا رنگ چڑھایا ہے۔انھوں نے اپنی جدتِ فکر سے اس تضاد کو دور کرنے کی کوشش کی ہے کہ عقل ہمیں زندگی کی راہ میں پیش آنے والی مشکلات کو حل پیش کرتی ہے۔لیکن جو شے عمل پر آمادہ کرتی ہے۔ وہ عشق ہے مضطرؔ کے ہاں عشق سے مراد یقین وایمان ہے۔ان کے نزدیک عقل اور علم کی سب سے بڑی کوتاہی یہ ہے کہ اس کی بنیاد شک پر قائم ہے۔عقل وعشق کے موازنے کے حوالے سے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

عشق محبوب سے ہمکنار ہو گیا
عقل زادِ سفر باندھتی رہ گئی
عقل بت بن گئی سوچتی رہ گئی

کھیل تقدیر کے دیکھتی رہ گئی(32)
عشق صادق کے فیض سے مضطرؔ
آندھیوں میں چراغ جلتے ہیں
بندہ عقل سے اسرار کی بات
بندہ عقل سے اسرار کی بات
تیرے دیوانے کہاں کرتے ہیں(33)

مجید تاثیر کوئی صوفی شاعر تو نہیں تھے لیکن ان کے ہاں تصوف، معرفت اور مسئلہ جبر و قدر کے حوالے سے بہت سی رباعیاں موجود ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

خاموش فلک کے چاند تاروں میں ہے تو
اور زمزمہ ریز آبشاروں میں ہے تو
رنگینی جاں ہے تُجھ سے کہساروں میں
فردوس نگاہ لالہ زاروں میں ہے تو
کچھ دیر سکوں پذیر ہو جا اے دل
اک عالم بے خودی میں کھو جا اے دل
میں ڈھونڈ رہا ہوں بزم انجم میں اُسے
مت چھیڑ مجھے خموش ہو جا اے دل
باغوں کی ہوا بلا رہی ہے مجھ کو
فطرت نغمے سنا رہی ہے مجھ کو
اے منہ سے نہ اک حرف بھی کہنے والے
تیری آواز آ رہی ہے مجھ کو(34)
شایان عذاب ناز کہنے والو
انساں کو گہنگار کہنے والو
معقول دلیل بھی تو لاؤ کوئی
اے جبر کو اختیار کہنے والو(35)

اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا اور اس کے دربار میں سربسجود ہونا ہر مومن کی صفات میں شامل ہے۔

مجید تاثیر سچے اور کھرے مسلمان ہیں وہ اپنی شاعری میں خدائے بزرگ و برتر کی حمد و ثنا کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ اپنے لیے اور انسانیت کے لیے اللہ تعالیٰ کے سامنے التجائیں اور دعائیں کرتے بھی نظر آتے ہیں۔ کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

دل اور دماغ کو منور کر دے
خوشبوئے جمال سے معطر کر دے
باغوں کو نئی بہار دینے والے!
ہر خار حیات کو گل تر کر دے
مٹی کو فلک جناب کرنے والے!
تلچھٹ کو شراب ناب کرنے والے!
اِک گوشہ بے کسی میں تاثیر بھی ہے
اے ذرے کو آفتاب کرنے والے!(36)

طفیل ہوشیار پوی کی شاعری میں تصوف کے مضامین کا بیان بھی بکثرت ملتا ہے۔ کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

اب نہیں دل میں تمنا کا نشاں تک باقی
آئینہ عکس رخِ یار تک آ پہنچا ہے
دل کے آئینے میں آئے تو نظر آئے طفیلؔ
وہ ہے بے مثل بھلا کیسے مثالوں میں ملے(37)

ساغر جعفری کا کلیاتِ شاعری صوفیانہ تصورات سے بھرا پڑا ہے۔ اُردو غزل گو شعرا نے تصوف کے مختلف مسائل، معرفتِ الٰہی، شانِ عبودیت، وحدت و کثرت، اخلاصِ نیت اور بے ثباتی دنیا کو بیان کیا ہے۔ ساغر جعفری نے بھی تصوف کی اس روایت سے استفادہ کیا ہے۔ وہ اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ دنیا میں کسی چیز کو بھی ثبات حاصل نہیں۔ دنیا کی بے ثباتی کا درس جا بجا ان کی شاعری میں بھی ملتا ہے۔ کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

ساغر میں عمر بھر جسے کرتا رہا تلاش
وہ تو تھا میرے خانہ دل میں چھپا ہوا
بس نہیں چلتا اس وقت کسی کا ساغر

دوڑ کر جب گلے ملنے کو قضا آتی ہے(38)
دہر کی ہر ایک شے زندانی تقدیر ہے
شاخ پر جو پھول مرجھاتا ہے پھر کھلتا نہیں(39)

ساغر کی شاعری میں زندگی کے بارے میں گہرے شعور کا پتہ چلتا ہے۔ زندگی کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں ان کا علم اور مشاہدہ وسیع ہے۔ زندگی کے حقائق کا ادراک اور شعور ان کی شاعری میں جگہ جگہ دیکھا جا سکتا ہے۔ کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

یہی بشر کہ تصرف میں جس کے ہے دنیا
فراز عرش سے ٹوٹا ہوا ستارا ہے
زندگی کا کارواں رُکتا نہیں
چل رہا ہے سلسلہ دن رات کا(40)

تاب اسلم کی شاعری میں بھی جا بجا تصوف کے عناصر ملتے ہیں۔ انھوں نے زندگی کی سچائیوں سے بھی اپنی شاعری کے لیے مواد حاصل کیا ہے۔ وہ بہاروں کے حسن، پھولوں کی رنگینی ،بلبلوں کی چہک اور کائنات کی ہر چیز کے رنگ و بو میں محبوبِ حقیقی کے جلوے دیکھتے نظر آتے ہیں۔ کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

فضا کی زد میں اگر ساری کائنات ہے تابؔ
تو کوئی خواب محل ہم یہاں بنائیں کیا(41)
یہ کائنات یہ خوابوں کی وادیوں کا نگر
کسی کے بس میں کہاں اس کتاب کا پڑھنا
کنج دل میں میری چشم تر میں کون ہے
سوچتا ہوں گھُپ اندھیروں کے سفر میں کون ہے(42)

آغا وفا ابدالی صحیح العقیدہ مسلمان ہیں۔ توحید پر ان کا پختہ یقین و ایمان ہے۔ وہ اپنے زمانہ کے صوفی ازم اور تصوف سے نالاں ہیں۔ علامہ اقبال نے بھی اپنے کلام میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔ مگر آغا وفا نے اپنے انداز میں اس کی تصویر کشی یوں کی ہے:

رخ توحید دھندلایا تصوف کی سیاہی سے

مسلمانی ہوئی کمزور رسمِ خانقاہی سے
یہ اک واضح حقیقت ہے بقول شاعرِ مشرق
حرم رسوا ہوا پیرِ حرم کی کم نگاہی سے(43)

اکرامؔ سانبوی روایت پسند شاعر ہیں اور ان کے ہاں کلاسیکی موضوعات کی جھلک بھی ملتی ہے۔عشق ومحبت ،تصوف اور محبوب کی یاد اردو کی کلاسیکی شاعری کے اہم موضوعات ہیں ۔ اکرام بھی فراق ووصال کی بات کرتے ہیں۔ وہ ایک صوفی شاعر کی طرح عشق حقیقی میں ڈوبے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

تصور میں کسی کے کھو گیا ہوں
بھری محفل میں تنہا ہو گیا ہوں
زمانہ یاد کیا رکھے گا مجھ کو
میں خود گزرا زمانہ ہو گیا ہوں(44)
ہوا میں چار سو پھیلی ہے شوق کی خوشبو
اب آؤ چمن میں منائیں جشنِ بہاراں(45)
ہوتی نہیں بے تاب نگاہوں کی تسلی
دیکھا کیے جلوے رخ زیبا کے ازل سے
اس شوق کا انداز فسوں ساز تو دیکھو
کٹیا کہیں بہتر ہے مجھے شیش محل سے(46)

اسلم ملک نے حمد سے نعت ،غزل نظم اور ہائیکو جیسی اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ تصوف اور عشقِ حقیقی اسلم ملک کی شاعری کا ایک بڑا موضوع ہے۔اسلم ملک کے نزدیک صرف خدائے رحیم وکریم ،تعظیم ،عظمت اور تمہید وستائش کا حقدار ہے۔ لالہ وگل میں اس کی خوشبو ہے۔اور سورج چاند ستاروں کی روشنی بھی اسی سے ہے کیونکہ وہ نور اور نور کا منبع ہے۔ کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

لالہ و گل میں جو خوشبو ہے فقط تری ہے
چاند ستاروں کی چمک میں بھی ہے فیضان تیرا
گیت تیرے ہی سناتے ہیں پرندے سارے

بزمِ قیمتی کا ہر اک فرد ثنا خواں تیرا(47)

اللہ تعالیٰ ہی کل کائنات کا خالق و مالک ہے۔ یہ ساری خلقت اس کا کنبہ ہے۔ وہ ساری مخلوقات کا پروردگار ہے۔ عرش وفرش اس کے جلال سے بھرپور اور معمور ہے۔ وہ بنی نوع انسان کے ہر درد کا درماں اور ہر مشکل میں عقدہ کشا ہے۔ اسلم ملک اپنی ایک حمدیہ نظم میں انھی خیالات کا اظہار اس طرح سے کرتے ہیں۔ کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

تو خالق و مالک ارض و سما
سبحان اللہ ، سبحان اللہ
تو داتا مرے دل میں بسا
سبحان اللہ ، سبحان اللہ
خلقت ساری ہے کنبہ ترا
سبحان اللہ ، سبحان اللہ
تو افضل و اکمل سب سے بڑا
سبحان اللہ ، سبحان اللہ(48)

سرمدؔ صہبائی ظاہری طور پر صوفی نہیں ہیں اور نہ صوفیا کے کسی سلسلے سے وابستہ ہیں۔ بلھے شاہ، مادھولعل حسین کی شاعری سے ان کو گہرا لگاؤ ہے جس کی وجہ سے ایک خاص وقت اور مخصوص ماحول میں اچانک سرمد کے اندر کا صوفی بیدار ہو گیا اور کافیوں پر مشتمل کتاب ''نیلی کے سورنگ'' تخلیق کی۔ جس کی وجہ کافی کی روایت میں ایک نئے دور کے شاعر کے احساسات اپنے کے دیس لوگوں کے لیے امنڈ آئے اور ایک سوئی ہوئی شعری صنف جاگ اُٹھی۔ سرمدؔ نے ''نیلی کے سورنگ'' میں جو کافیاں لکھی ہیں یہ آزاد نظم کی ہیئت میں ہیں۔ اس شعری مجموعہ میں جہاں خوبصورت مقامی الفاظ موسموں اور رنگوں کی مٹھاس ہے۔ وہاں شاعر نے اپنے لاشعور کی باتیں شعور میں لا کر اپنے خیالات و احساسات اور محسوسات کو صدف بنا کر سیپی میں بند کر دیا ہے۔ اس مجموعہ میں شاعر نے سچل سرمست اور بابا بلھے شاہ کے قدیم نظریہ تصوف کی ترجمانی بھی کی ہے اور اس منافقت کے دور میں رشد و ہدایت کے نئے در وا کیے ہیں لیکن وعظ نہیں کیا بلکہ بات کو کسی نہ کسی کیفیت اور احساس میں رکھ کر بیان کیا ہے۔ صوفی شعرا جن میں پنجابی، ہندی اور سندھی صوفی شعرا کے بڑے ایوان ہیں لیکن سرمد نے خود کو ان ایوانوں سے دور رکھا ہے اور عوام کی بات عوام میں

بیٹھ کر کی ہے۔ سرمد نے لاشعوری اور شعوری کوشش سے علاقائی زبانوں میں جو کچھ صوفی شعرا نے لکھا خود کو اس سے جوڑ لیا۔ وہی لفظیات اپنائیں جو صوفیا اکرام نے اپنائیں تھیں۔ سرمد نے پنجابی، سندھی، پشتو، سرائیکی، پہاڑی اور دوسری علاقائی زبانوں کے الفاظ کو بے دریغ استعمال کیا ہے۔ اور بعض جگہ پر تو یوں لگتا ہے۔ جیسے یہ اردو زبان نہیں بلکہ مختلف علاقائی زبانوں میں لوگوں سے مخاطب ہوتے ہیں۔ ظاہری طور پر ایسے لگتا ہے کہ سرمد نے تصوف کے بارے میں اپنے جدید نظریات کو کافی کے مروجہ رنگ میں نہیں لکھا۔ اور اس ضمن میں آزاد شاعری کو منتخب کیا ہے لیکن پھر بھی صوفیا کی چھاپ نظر آتی ہے۔

ڈاکٹر انیس ناگی سرمد پر صوفی شعرا کے اثرات کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> اسے مہا تما بدھ، سچل سرمست، میرابائی اور بلھے شاہ کے خیالات کا مجموعہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ اور اس طرح سرمد نے ثقافتی یکجہتی کی فضا قائم کی ہے۔ سرمد نے تصویری اشیاء سے مضامین نکالے ہیں جو صوفیا اکرام کا طریقہ کار ہے۔(49)

سرمد کی کافیوں میں ہماری دھرتی کی خوشبو رچی بسی ہوئی ہے۔ زندہ استعاروں اور باطن سے اٹھنے والا کرب پڑھنے اور سننے والوں کے باطن میں چھپے غبار کو چھیڑتا ہے اور انسان کو اپنے ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ کیوں کہ کافی کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ غزل کی طرح کلاسیکی موسیقی سے جڑی ہوئی یہ براہ راست دل و دماغ پر اثر کرتی ہے۔ سرمد کلاسیکی موسیقی کا ذوق بھی جنون کی حد تک رکھتے ہیں۔ ان کی کافیوں میں موسیقیت بھی بلا کی ہے۔ ان کی کافیوں کی زبان و بیان اور رویے کے لحاظ سے اچھوتے نرالے اور نزول کلام سے مزین ہے۔ سرمد نے ان کافیوں کا مختلف علاقائی زبانوں کے تال میل سے دل کو لبھانے والا اسلوب پیدا کیا ہے۔

کچھ کافیاں ملاحظہ ہوں:

مکھ کی جوت بڑھی
پوہ ماگھ کے موسم ہیں یہ
کیسی دھوپ چڑھی
مکھ کی جوت بڑھی(50)
سارے رنگ کے سنگ آ گھر سائیں

موڑ مہار اُڑتے بادل کی
موج سند ھل کی(51)
ہم سادہ بندے رب سائیں
لُچا دھرم سماج
میں نہ کل نہ آج(52)

حوالہ جات

1. علامہ محمد اقبال، بانگِ درا، مکتبہ اردو ادب، لاہور، س۔ن، ص:47
2. علامہ محمد اقبال، ارمغانِ حجاز، اقبال اکادمی، لاہور، 2000ء، ص:35
3. علامہ محمد اقبال، اسرارِ خودی، اقبال اکادمی، لاہور، 1983ء، ص:57
4. ایضاً، ص:79
5. علامہ محمد اقبال، بالِ جبریل، اقبال اکادمی، لاہور، 2000ء، ص:28
6. ایضاً، ص:39
7. ایضاً، ص:47
8. ایضاً، ص:84
9. مولوی احمد دین، اقبال، مرتبہ مشفق خواجہ، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، 2006ء، ص:261
10. علامہ محمد اقبال، کلیاتِ اقبال، اقبال اکادمی، لاہور، 2009ء، ص:312
11. ڈاکٹر محمد اقبال، بالِ جبریل، اقبال اکادمی لاہور، 2000ء، ص:167
12. ایضاً، ص:172
13. ڈاکٹر محمد اقبال، ضربِ کلیم، اقبال اکادمی، لاہور، 2000ء، ص:47
14. ایضاً، ص:48
15. ایضاً، ص:51
16. رسالہ "انجمنِ حمایت اسلام" اپریل 1888ء ص:19
17. مولوی فیروز الدین ڈسکوی، "پیارے نبیؐ کے پیارے حالات"، جلد دوم، سیالکوٹ مفید عام پریس، بار اول، 1318ھ، ص:2
18. امین حزیں، "گلبانگِ حیات"، ص:134
19. "الابصار"، خصوصی اشاعت دوم، گورنمنٹ ڈگری کالج، ڈسکہ، 2003، ص:291
20. اثر صہبائی، "خمستاں"، سیالکوٹ، آزاد بک ڈپو، 1933ء ص:170
21. ایضاً، ص:150
22. ایضاً، ص:70

23. اثر صہبائی، جامِ طہور، ص:35
24. ایضاً، ص:72
25. مضطر نظامی، مسودہ نقش حیات، ص:41
26. ایضاً، ص:31
27. ایضاً، ص:100
28. ایضاً، ص:114
29. ایضاً، ص:117
30. ایضاً، ص:118
31. ایضاً، ص:192۔193
32. ایضاً، ص:250
33. ایضاً، ص:251
34. ایضاً، ص:34۔35
35. ایضاً، ص:47
36. ایضاً، ص:33۔34
37. طفیل ہوشیار پوری، شعلہ جام، ص:66۔67
38. ساغر جعفری، بہار و نگار، ص:67۔68
39. ساغر جعفری، برگ گل، ص:114
40. ایضاً، ص:144۔145
41. تاب اسلم، نقشِ آب، مکتبہ عالیہ، 1975ء، لاہور، ص:60
42. ایضاً، ص:62۔63
43. آغا وفا، غبار دل، ص:۹۰
44. اکرام سانبوی، مسودہ نمبر ا، ص:18
45. ایضاً، ص:52
46. ایضاً، ص:61
47. اسلم ملک، "خواب اور خوشبو"، ص:35
48. ایضاً، ص:38
49. انیس ناگی (انٹرویو) مشمولہ ہفت روزہ "مسلمان" اسلام آباد 24 فروری تا یکم اپریل 1992ء، ص:5
50. سرمد صہبائی، "نیلی کے سورنگ"، کتب پرنٹرز اینڈ پبلشرز لمیٹڈ، کراچی، فروری 1986ء، ص:15
51. ایضاً، ص:21
52. ایضاً، ص:54

اثر صہبائی کی ادبی خدمات

اثر صہبائی (۱۹۰۱۔۱۹۶۱ء) کا اصل نام خواجہ عبدالسمیع پال تھا۔ اثرؔ سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ اثرؔ کے بزرگوں نے کشمیر سے ہجرت کی تھی اور سیالکوٹ میں آباد ہوئے تھے۔ آپ نے گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم۔اے فلسفہ اور ایل ایل بی کیا۔ ۱۹۳۱ء میں ان کی رفیقہ حیات ان سے جدا ہو گئیں تو افسردگی، تاریکی اور مایوسی کے بادل ان کی زندگی پر چھا گئے۔ ۱۹۳۴ء میں آپ اس غم واندوہ کیپورش سے گھبرا کر سری نگر کشمیر چلے گئے۔ کشمیر میں ان دنوں ادبی مجلسیں اور ادبی نشستیں ہو رہی تھیں جن میں ڈاکٹر عبدالحکیم، نواب جعفر خان اثر لکھنوی، ڈاکٹر تاثیر اور پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی دہلوی جیسے شعراء واد با شرکت کرتے تھے۔ اثر ان ادبی محفلوں کے روح رواں ہوتے تھے۔ آپ نے کشمیر ہائی کورٹ میں قائداعظم کے ساتھ جونیئر وکیل کی حیثیت سے بھی کام کیا۔ قائداعظم نے مقدمہ جیتنے کے بعد صہبائی کی محنت کو سراہا۔(۱)

اثرؔ صہبائی کی پہلی تصنیف ''جامِ صہبائی'' ہے۔ قطعات و رباعیات پر مشتمل یہ شعری مجموعہ ۱۹۲۸ء میں دارالتالیف بیڈن روڈ لاہور سے طبع ہوا۔

''خمستان'' اثر کا دوسرا مجموعہ کلام ہے جو غزلوں، نظموں، قطعات و رباعیات اور متفرق اشعار پر مشتمل ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۳۳ء میں آزاد بک ڈپو سیالکوٹ سے شائع ہوا۔ اثرؔ کا تیسرا شعری مجموعہ ''جامِ طہور'' ۱۹۳۷ء کو تاج کمپنی لمیٹڈ لاہور نے طبع کیا۔ اس مجموعے میں رباعیات اور قطعات ہیں۔ ''راحت کدہ'' اثرؔ کا چوتھا شعری مجموعہ ہے جو ۱۹۴۲ء میں تاج کمپنی لمیٹڈ لاہور کے زیر اہتمام طبع ہو کر شائع ہوا۔ ''راحت کدہ'' حضرت اثر صہبائی کے اس کلام پر مشتمل ہے جو انہوں نے اپنی جواں مرگ رفیقہ حیات راحت کی موت سے متاثر ہو کر مختلف اوقات میں لکھا۔ اس میں غزلیں، نظمیں اور قطعات ہیں جو اس غم کی چھاؤں میں لکھے گئے۔ پانچواں شعری کلام ''روحِ صہبائی'' ۱۹۴۵ء میں تاج کمپنی لمیٹڈ کے زیر اہتمام شائع ہوا۔ یہ رباعیات اور قطعات کا مجموعہ ہے۔ اثرؔ کا چھٹا شعری مجموعہ ''بامِ رفعت'' ۱۹۴۵ء میں اکادمی پنجاب ادبی دنیا منزل لاہور نے شائع کیا۔ یہ جون ۱۹۳۳ء سے دسمبر ۱۹۳۷ء تک کے کلام کا

مجموعہ ہے۔اس مجموعے میں رباعیات، غزلیات اور نظمیں ہیں۔''نور و نکہت'' اثر کا ساتواں شعری مجموعہ ہے جو ۱۹۶۰ء میں جاوید پریس کراچی نے شائع کیا۔

آٹھواں شعری مجموعہ ''محبت کے پھول'' جنوری ۱۹۶۳ء میں نوائے وقت پرنٹرز لمیٹیڈ لاہور نے شائع کیا۔نواں شعری مجموعہ ''بحضور سرور کائناتؐ'' نعتوں پر مشتمل ہے۔ یہ مجموعہ کتب خانہ انجمن حمایت اسلام لاہور کے زیرِ اہتمام طبع ہوا۔

اثرؔ صہبائی برصغیر کے صفِ اول کے شعرا میں سے تھے۔علامہ سلیمان ندوی، پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی دہلوی، مولانا ابوالکلام آزاد، اثر لکھنوی اور دیگر ناقدینِ فن نے ان کے فن اور شاعری کو جی کھول کر سراہا۔

اثرؔ کی شعر گوئی کا آغاز گیارہ سال کی عمر میں ہوا۔تیرہ سال تک شاعری کی حیثیت تک بندی تک محدود رہی۔ چودہ برس کی عمر میں اثرؔ کو شاعری کی الہامی کیفیت محسوس ہونے لگی۔(۲) اس زمانے کا کلام تمام تر تلف ہو گیا ہے۔ چند اشعار یادگار ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا اس زمانے کا کلام بھی تضات سے مبرّا اور جذبات سے لبریز تھا۔کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

چاہتا ہے جی کہ میں اور بخت بد — خوب روئیں مل کے باہم ایک دن
شعلۂ نارِ محبت کی تپش — خود بخود ہو جائے گی کم ایک دن
رویئے ایسا کہ کوئی ہنس پڑے — خوب کہتی تھیں شبنم ایک دن
میں ہوں تیرا مونس و ہمدم اثرؔ — مجھ سے کہتا تھا میرا غم ایک دن (۳)

انیس برس کی عمر تک غزل اور نظم کی مشق جاری رہی۔رباعی گوئی کا آغاز بیس برس کی عمر میں ہوا اور اس کا محرک حضرت عمر خیام کی رباعیاں تھیں۔غالب، اقبال اور میر کے علاوہ جس شاعر سے متاثر ہوئے وہ عمر خیام ہی تھے۔ان کی اکثر رباعیاں عمر خیام کے رنگ کی ہیں۔(۴)

اثرؔ نے بچپن سے شاعری کا آغاز کیا اور وفات تک مسلسل لکھتے رہے۔ یہ سرمایہ کئی اصنافِ سخن پر مشتمل ہے۔لیکن ان کی شاعری کا جائزہ موضوعات وفن کے حوالے سے لیا جائے گا۔

اثرؔ زندگی کی بے ثباتی امیدوں کی ناکامی اور آغاز و انجام پریشان کن مسائل پر غور کر کے مغموم ہو جاتے ہیں۔افکار پریشاں میں اپنا نظریہ حیات اس طرح واضح کرتے ہیں:

رواح زارو نزار ہوتی ہے — ہجر میں بے قرار ہوتی ہے
سر بسر اضطرار ہوتی ہے — اک غریب الدیار ہوتی ہے

جوشِ وحشت اسے ستاتا ہے اک سیل جنوں بناتا ہے
خانہ دل کو توڑ دیتی ہے پیکر گل کو توڑ دیتی ہے
اپنے محمل کو توڑ دیتی ہے سب سلاسل کو توڑ دیتی ہے
گیت آزاد یوں کے گاتی ہے اور فضا میں سمائے جاتی ہے(۵)

کائنات اور زندگی کے بارے میں کہتے ہیں:

ہے ازل سے موج زن بحرِ رواں زندگی ہجر بے پایاں ہے بحرِ بیکراں زندگی
انجمن آرائے ہستی ہے ظہورِ زندگی ہے ضیا پاش دو عالم شمع نور زندگی (۶)

اثر کی بیشتر نظموں میں تلاشِ حسن پایا جاتا ہے۔ حسن سے ان کی مراد حسنِ ازلی ہے۔ اثرؔ پہاڑ، برسات، شام و سحر غرض کہ ہر نقش میں حسنِ ازلی کو جلوہ گر پاتے ہیں۔ اثرؔ فلسفہ کے طالب علم تھے انہیں الہیات سے غیر معمولی شغف تھا۔ انہوں نے اپنی شاعری میں الہیات کو سمو دیا۔ وہ فلسفے کو ارتقائے شاعری کا ایک ذریعہ سمجھتے ہیں۔ ان کے فلسفیانہ مضامین شعریت میں ڈوبے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کی نظم میں ''کائنات اور انسان'' کے مطالعہ سے ان کی اس نوعیت کی قادر الکلامی کا پتہ چلتا ہے۔ کائنات زندگی سے معمور ہے اور زندگی ایک طوفانِ اضطراب ہے جو اپنی رو میں رواں دواں ہے اور جس کا منتہا کچھ نظر نہیں آتا۔ اس کی ایک جھلک اثر کے کلام میں دیکھیے:

پیکر ہستی کی ہے رگ رگ میں ہیجانِ حیات قطرے قطرے میں ہے پنہاں اک طوفانِ حیات
باد پار ہوا رو ہے جس کو غمِ منزل نہیں سیل بے پروا ہے جو شرمندہ ساحل نہیں
ابتداء ہے زندگی اور انتہا ہے زندگی کاش کھل جائے کبھی یہ بھی کہ کیا ہے زندگی(۷)

زندگی کے اس طوفان میں انسان نمودار ہوتا ہے۔ انسان خود بھی منظم ہے اور کائنات کی تنظیم میں بھی اس کی ہستی کارفرما ہے:

اس تماشا گاہ میں اک ہستی انسان بھی ہے جو دل آگاہ بھی ہے دیدہ حیران بھی ہے
زندگی اس میں سمائی اور درخشاں ہو گئی برق مضطر تھی مگر شمع فروزاں ہو گئی
سیل آوارہ تھا لیکن چشمۂ عرفان بنا علم و عقل عشق اور ایثار سے انسان بنا
آگہی کا ساز سوز زندگی سے مل گیا ہوش بھی اک گونہ جوش بیخودی سے مل گیا(۸)

خدائے بزرگ و برتر کی تعریف و توصیف کرنا ایک مومن کے ایمان کا لازمی جز ہے۔ اثرؔ پر بھی اپنی شاعری میں ایک سچے مومن کی طرح حمد و ثنا کرتے نظر آتے ہیں۔ اللہ تعالی کی حمد

میں ان کی نغمہ سرائی کے حوالے سے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

کعبہ و دیر میں عبث ہم تھے ڈھونڈتے رہے تو ہی کلی کلی میں ہے تو ہی چمن چمن میں ہے
رنگ میرے خیال کا، فیض تیرے جمال کا کیف تیرے وصال کا میری مئے سخن میں ہے(۹)

اثرؔ کی طبیعت شروع ہی سے حکیمانہ موضوعات کی طرف مائل تھی۔ کلامِ اقبال کا مطالعہ وہ شروع ہی سے کرتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس نوجوان شاعر کا کلام حقائق و معارف کے انمول جواہرات سے مالا مال ہو گیا:

یاد تیری شراب ہے ذکر تیرا سرود ہے کیف طرب میں موج زن میرا یم وجود ہے(۱۰)

ذرے ذرے میں خیابار ہے طلعت تیری پتے پتے میں چمن ساز ہے جلوہ تیرا
سنگِ اسود میں ہے مستور حقیقت تیری اور صنم خانوں میں ہے جلوہ پیدا تیرا
تیرا ہی ہے کعبہ ہو کہ مے خانہ ہو شیخ تیرا ہے، غریقِ خم صہبا تیرا (۱۱)

حیات بعد الموت کے اہم مسئلے کو بھی اثرؔ نے خوبی سے بیان کیا ہے۔ ان کے نزدیک انسان کی ہستی غیر فانی ہے۔ موت کے ہاتھوں وہ صرف ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی ہے اور ہم اس غیر مرئی حالت کو دیکھ نہیں سکتے لیکن درحقیقت انسانی زندگی قائم و دائم ہے:

موجود بھی ازل سے ہوں اور جاوداں بھی ہوں خوفِ فنا نہیں ہے کہ مرنا نہیں مجھے (۱۲)

اثرؔ نے فنا کے خوف کو دل سے نکال دیا ہے اور زندگی کو ازلی اور جاودانی قرار دیا ہے۔ اس حوالے سے اشعار ملاحظہ ہوں:

ساحل پہ جاؤں گا بھی تو موجوں کو چیر کر
کشتی کے بل بھی پار اترنا نہیں مجھے (۱۳)

حبیبہ خزاں بھی اک فریبِ بہار میں
ہر چند نغمہ ریز رہا ساز ہست و بود
لیکن کھلا نہ راز نوا ہائے ساز کا
پندار نے وجود و عدم کو سمجھ لیا!
دیکھا تو یہ بھی راز تھا اور وہ بھی راز تھا (۱۴)

غمِ محبت یا زندگی کی ناکامیوں کا غم چشمِ بصیرت کو بہت تیز کر دیتا ہے۔ حقائق و معارف

کا صحیح احساس، انسانی جذبات کی عمیق ترین گہرائیوں سے شناسائی اور تخیل کی بلند ترین چوٹیوں تک رسائی اس غم کی بدولت ہوتی ہے۔ اثر کے شعری مجموعے ''راحت کدہ'' کی غزلیں جس قدر سوز و گداز سے پر ہیں دوسرے مجموعوں کی غزلیں اس درد کو نہیں پہنچتیں۔ ''راحت کدہ'' سے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

چشم مشتاق دیدیار رہی شام تک محوِ انتظار رہی
رات کا قصہ مختصر ہے صبح ہونے تک اشکبار رہی
راز سمجھا نہ کچھ گل خنداں کس لیے شبنم اشکبار رہی(۱۵)

کیف وسرور و مستی غزل کا جزو اعظم سمجھی گئی ہے لیکن ہر شام نے اس کا مفہوم اپنے اپنے خیال کے مطابق سمجھا ہے۔ اثرؔ کے تمام کلام میں خواہ وہ غزلیں ہوں نظمیں ہوں یا قطعات و رباعیات سب میں کیف و مستی پائی جاتی ہے:

پلائے جا ساقیا! پلائے جا انتظار کیا ہے
جو لڑکھڑا جائے ایک دو ساغروں میں وہ بادہ خوار کیا ہے
چمن میں رقص طرب ہے برپا اٹھا لے اپنا رباب مطرب
عبثیہ انجمن ہے تیرے دل میں کہ پھول کیا ہیں بہار کیا ہے
ازل سے خورشید و ماہ کے جام بزمِ ساقی میں چل رہے ہیں
مرید پیرِ مغاں کی نظروں میں دور لیل و نہار کیا ہے(۱۶)

اسی طرح ایک دوسری غزل میں بھی کیف و مستی اور رندی و سرشاری کے حوالے سے اشعار ملاحظہ ہوں:

بزمِ جہاں ہے مے کدہ جم مرے لیے ہے دورِ جام گردشِ پیہم مرے لیے
چھیڑا ہے کس کے حسن نے تارِ بابِ عشق رقصاں ہے ایک نغمہ پیہم مرے لیے
تیری نگاہِ لطف ہے موج مئے نشاط اب ہو گئی حرام مئے غم مرے لیے
ہے کائنات تیری ضیا سے حسین کہ تو ہے آفتابِ حسن مجسم مرے لیے
تو ہمکنار ہے تو خزاں بھی بہار ہے کیا ہوگا پھر بہار کا موسم مرے لیے(۱۷)

فلسفہ کی روح عقل، مذہب کی روح عمل اور شاعری کی روح جذبات ہیں۔ اثرؔ جذبات پرست ہیں لیکن اثرؔ کی طبیعت میں خوشگوار توازن اور اعتدال پایا جاتا ہے۔ جذبات کی پاکیزگی،

اندازِ بیان کی شگفتگی اور مضامین کی تازگی ان کی شاعری کی خاص خصوصیت ہے:

پھر خندہ زیرِ لب آتا ہے اے اثرؔ
پھر جھک رہا ہے سر میرا عجزِ نیاز سے
پھر جگمگا رہی ہے مری بزمِ آرزو
دیکھا کسی نے پھر نگہ دل نواز سے
آنکھیں بچھی ہوئی ہیں تیری راہ گزر میں
آغوشِ شوق وا ہے تیرے انتظار میں (۱۸)

اثرؔ کی شاعری میں تغزل کی جھلک بھی دیکھی جاسکتی ہے۔ان کا تغزل رچا ہوا اور پوری سنجیدگی ومتانت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔یہ ایسا تغزل ہے جسے خلوص کی شدت نے پرتاثیر بنادیا ہے۔اثرؔ کے مندرجہ ذیل اشعار سے صحیح تغزل کی مثال واضح طور پر سمجھ میں آجاتی ہے:

ڈوبی ہوئی نگاہ ہے رنگ حجاب میں
یا کوئی نوشگفتہ کلی نیم خواب میں
رنگینیوں میں غرق ہوئی ہے نقاب بھی
تم ہو کہ آفتاب چھپا ہے سحاب میں
زیرِ نقاب بھی تو بہت بے نقاب ہو
ہو جاؤ بے نقاب کہ تم آفتاب ہو (۱۹)

مناظر قدرت کے حسن سے کیف اندوزی صاحب ذوق ووجدان کی خصوصیت ہے اثر مناظر پرست ہیں۔ان کی اکثر غزلیات ایک ہی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہیں۔

مناظر فطرت کے علاوہ اثرؔ کے ہاں تخیل کی بلند پروازی اور جدت ادا جیسی صفات بھی بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ان صفات کے حوالے سے کلام اثرؔ سے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

اندوہ ربا ہے منظر ابر — کیا روح فزا ہے منظرِ ابر
مستانہ خرام آ رہا ہے اکبر — گلزار پہ برس رہا ہے اکبر
میخانہ بدوش ہیں گھٹائیں — پیغامِ سروش ہیں گھٹائیں
گل ہائے چمن کھلے ہوئے ہیں — یا مے سے سبو بھرے ہوئے ہیں(۲۰)

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی صہبائی کی جدتِ ادا' مضمون آفرینی اور شوخی ورنگینی پر تبصرہ

کرتے ہوئے کہتے ہیں:

مجھے صہبائی کی رباعیوں' قطعات میں غزلوں سے زیادہ رنگینی اور رس معلوم ہوتا ہے اور میرا خیال ہے کہ ان کا اصلی رنگ بھی یہیں آ کر ظاہر ہوتا ہے۔(۲۱)

ایک حساس شاعر جہاں زندگی کے گہرے مسائل کو نظر انداز نہیں کرتا وہاں وہ ملکی سیاسیات سے بھی لاپروا نہیں ہوسکتا۔ آج کا شاعر ماضی کے شاعر کی طرح بے حس نہیں کہ دنیا میں کیسا ہی انقلاب کیوں نہ آئے۔ حالات کتنے ہی سازگار رہوں وہ ماحول کا اثر قبول نہ کرے۔ اثرؔ کی طالب علمی کا دور سرگرم عملی سیاسیات میں گزرا۔ مقامی' بین الاقوامی' معاشی اور سیاسی مسائل ان کی نظر میں ہیں اور دنیا کے رستے ہوئے ناسوروں کے لیے وہ بھی ایک علاج پیش کرتے ہیں جو ارباب ہوش وخرد کے لیے قابلِ غور وفکر ہے:

بے دل و بے حس پڑا ہے کارواں کا کارواں
نعرہ ہائے ھاوھو سے اس کو گرماتا ہوں میں (۲۲)

اثرؔ کو افسوس ہے کہ اس کی قوم میں بے حسی بہت شدید ہے جس کا اظہار وہ اس طرح کرتے ہیں:

بولا نہ کہیں سے بھی کوئی میری صدا پر
اس دشت میں ہر سمت بہت میں نے پکارا (۲۳)

اثرؔ کے نزدیک قومیں جس جذبہ سے زندہ رہتی ہیں وہ آزادی ہے:

وہ آتش سے ملے گر تو آتش اچھی
وہ کشت وخون سے ہو حاصل تو کشت وخون بہتر (۲۴)

کشمیر اثر کا آبائی وطن تھا اور ملازمت کے دوران اس نے عمر کا بیشتر حصہ کشمیر میں گزارا۔ قیامِ کشمیر کے دنوں تحریکِ آزادیٔ کشمیر زوروں پر تھی کشمیری مسلمانوں پر ظلم واستبداد کے پہاڑ توڑے جارہے تھے۔ مسلمانوں کی بے چارگی اور مظلومیت کا اثرؔ کو گہرا احساس تھا کیونکہ ان کی حساس نظروں نے کئی ہنگامے دیکھے۔ وہ براہِ راست تحریکِ آزادی سے واقف تھے۔ ان کی تمام ہمدردیاں مظلوم کشمیری قوم کے ساتھ تھیں:

آہ! مظلوم کی سنتا نہیں فریاد کوئی

میں نے مظلوم کو ظالم سے چھڑانا ہے (۲۵)

ان کی شاعری میں قومی وملی شاعری کے عناصر بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں قومی وملی رنگ کو اثرؔ نے مستقل طور پر اپنی شاعری میں جگہ دی ہے۔ ان کی نظم ''سرودسفر'' قومی شاعری کا بہترین نمونہ ہے۔ اس نظم کے اشعار ملاحظہ ہوں:

چمن کے نغمہ گر اپنی نوا بدل ڈالیں
چمن کا رنگ، چمن کی فضا بدل ڈالیں (۲۶)

وجودِ مطلق یا ہستی خدا صوفیانہ شاعری میں یہ مسئلہ ہمیشہ زیرِ بحث رہا ہے اس کے ساتھ مسئلہ جبر وقدر بھی ہمیشہ ہمیشہ سے انسانی خیالات کا موضوع رہا ہے۔ فلاسفر اور صوفی تو کیا ایک عام انسان بھی کبھی کبھار یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ یہ مسائل نہایت اہم اور پیچیدہ ہیں اور قوم کے مفکر ان کے متعلق اپنے اپنے نظریات رکھتے ہیں۔ اثرؔ صہبائی نے بھی ان مسائل پر روشنی ڈالی ہے:

تیری ہستی کا کچھ یقیں بھی نہیں
میرے لب پر مگر ''نہیں'' بھی نہیں
دیکھتا ہوں تو ہر جگہ موجود
سوچتا ہوں تو پھر کہیں بھی نہیں (۲۷)

مسئلہ جبر وقدر کے حوالے سے یوں رقمطراز ہیں:

بیگانہ ہوش ہوں کہ ہوشیار ہوں میں
ہوں عالمِ خواب میں کہ بیدار ہوں میں
فطرت کی ستم ظریفیاں تو دیکھو
''مجبور'' کو وہم ہے کہ ''مختار'' ہوں میں (۲۸)

انسانی عظمت، درسِ عمل اور بلندیٔ عزائم اقبال کی شاعری کے اہم ترین موضوعات ہیں۔ اثرؔ نے ان موضوعات پر قطعات اور رباعیاں لکھی ہیں۔ اثرؔ نے شاعرانہ طور پر اقبال کے پیغام کو آگے بڑھانے اور ان کے سوزِ بصیرت کو عام کرنے میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ ان کے نزدیک انسان کی ہستی جامع صفات ہے۔ اس میں ساری دنیا کو اپنے اندر جذب کر لینے کی پوری صلاحیت موجود ہے:

گر اصل سے اپنی آشنا ہو جائے یہ مشتِ غبار کیا سے کیا ہو جائے

ہے بے خبری میں بھی مسجود ملائک ہو جائے و باخبر خدا ہو جائے (۲۹)

انسانی ترقی کا راز عمل اور بلندیٔ عزم میں مضمر ہے۔ مولانا روم اور اقبال نے عمل کو جوہرِ حیات اور روح قرار دیا ہے۔ صہبائی بھی اس رنگ میں ان کے قدم بقدم نظر آتے ہیں:

مسجد میں رہیں سبہ خوانی کب تک اندیشہ رزم زندگانی کب تک
زندہ ہے تو کارزارِ ہستی میں نکل یہ فکر شکست وکامرانی کب تک (۳۰)

اثرؔ نے مردِ مومن کی صفات بیان کرتے وقت اس صفت پر زیادہ زور دیا ہے کہ مرد مومن فنا و نیستی کی گرفت سے آزاد ہوتا ہے۔ وہ اپنے عمل صالح کے ذریعے اس مرتبے تک رسائی حاصل کر لیتا ہے کہ خود اللہ تعالیٰ کا ہاتھ بن جاتا ہے۔ اس میں وہی صفات پیدا ہو جاتی ہیں جن سے اس کے خالقِ حقیقی کی ذات متصف ہے:

طوبیٰ سے بھی بلند ہے رفعت تیری کونین سے بھی بڑی ہے وسعت تیری
ہو جائے اگر تو آپ اپنا محرم پھر ارض وسما میں ہے حکومت تیری (۳۱)

اردو کے دوسرے تمام شاعروں کی طرح اثر نے نعتیہ شاعری بھی کہی ہے۔ ان کا یہ شاعری رسمی طور پر ہی نہیں بلکہ اس صنفِ سخن کو دوسری اصنافِ سخن کی طرح سے باقاعدہ اپنایا ہے۔ جس طرح دوسری اصناف میں اثرؔ اقبال سے متاثر ہیں اس طرح اس صنف میں بھی انہوں نے خاصا اثر لیا ہے۔ بقول سید محمد جعفر شاہ ندوی پھلواری:

> اثرؔ کے کلام میں جا بجا اقبال کی جھلک نظر آتی ہے اس لئے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ یہ اقبال کے افکار سے خاصے متاثر ہیں۔ انہوں نے اپنی نعتوں میں شعریتِ محسنہ سے اجتناب کیا ہے اور کوشش یہ کی ہے کہ بیان حقائق اور جذبات عشق کی آمیزش سے نعت کا ایک انداز و رنگ پیدا ہو۔ (۳۲)

اب اثرؔ کا نعتیہ رنگ ملاحظہ ہو۔ اثرؔ صفاتِ نبویؐ کو بڑے خوبصورت انداز میں اس طرح پیش کرتے ہیں:

تیرے سوزِ عشق سے پیغامِ حق زندہ تر، تابندہ تر، پائندہ تر
تو نے صہبائی کو کیا کچھ دے دیا عشقِ حق، جوشِ جنوں، حسنِ نظر (۳۳)

نعتوں میں معجزات، صفات اور اخلاقِ حسنہ کے متعلق لکھتے ہوئے اپنے جذبات دلی اور عشقِ رسولؐ کو بھی پیش کرتے ہیں۔ انہیں رسول کریمؐ کے دیدار کی بے حد تمنا تھی جس کا اظہار

اپنے نعتیہ شعری مجموعے ''بحضور سرورِ کائناتؐ'' کے پسِ منظر میں کرتے ہیں:

میں اکثر سونے سے پہلے اس خدا نما انسان کی
زیارت کے لیے دعائیں مانگتا ہوں (۳۴)

ترنم و موسیقی اثرؔ کی نظموں اور غزلوں کی ایک خاص صفت ہے۔ ان کی شاعری میں اس قدر ترنم ہے کہ گا کر پڑھنے کے بغیر بھی وہ جاذبِ سماعت و روح افزا ہوتی ہے:

کیا کیا ہیں میرے دل میں خلشہائے جستجو
ذوقِ نظر کو دیدۂ بینا کو کیا کروں
پیشِ نظر نہیں ہے سرمایۂ نشاط
آغوشِ جام و گردنِ مینا کو کیا کروں (۳۵)

۱۹۳۵ء میں ترقی پسند تحریک اردو ادب میں شروع ہوئی۔ یہی دور اثرؔ صہبائی کی شاعری کا زریں دور ہے۔ اس تحریک کا کوئی خاص اثر، اثرؔ کی شاعری نے قبول نہیں کیا ماسوائے حقیقت نگاری کے۔ کسی شاعر کو رومانوی یا ترقی پسند کہتے وقت اس کے غالب رجحانات کو دیکھ کر فیصلہ کیا جاتا ہے کہ یہ شاعر رومانوی ہے یا ترقی پسند۔ اثرؔ کے ہاں رومانوی رجحانات کا اثر زیادہ ہے اور یہ ترقی پسند تحریک سے سرسری طور پر متاثر ہوئے۔ اب ہم اثرؔ صہبائی پر دوسرے عظیم شعراء کے اثرات کا مختصراً جائزہ لیتے ہیں۔ اپنے بڑے بھائی امینِ حزیں سیالکوٹی کی طرح اثر بھی دوسرے شعرا سے زیادہ اقبال سے متاثر ہوئے اور دونوں اس رنگ میں دوسرے متبعین سے زیادہ کامیاب رہے ہیں:

خود ہی مے ہوں، خود ہی خم ہوں خود ہی خم خانہ ہوں میں
بے نیاز ساقی و مینا و پیمانہ ہوں میں(۳۶)

ساقی کے علاوہ اور بہت سی اصطلاحات کو اثرؔ نے اپنی شاعری میں استعمال کیا ہے۔ یہ وہی اصطلاحات ہیں جس سے اقبال نے اپنے فکر و پیام کا تانا بانا تیار کیا ہے مثلاً جفا طلبی، بادیہ پیمائی، شعلہ طور، شعلہ مینائی، بتانِ آذری اور مسجود ملائک کا استعمال اقبال کی نظموں اور غزلوں میں کثرت سے ہے۔ انہیں اصطلاحات کی مدد سے اقبال نے اپنے فلسفۂ زندگی کو وضاحت کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اثرؔ صہبائی اور اقبال کے فلسفۂ زندگی میں مماثلت کے بہت پہلو نکلتے ہیں۔ مثلاً ذوقِ عمل، امید، یقین، عزم و اعتماد اور مردِ مومن کے موضوعات دونوں کے یہاں

مشترک ہیں۔ اقبال کی طرح اثرؔ نے بھی ان اصطلاحات سے استفادہ کیا ہے۔ بعض الفاظ تو الفاظ و معانی دونوں لحاظ سے اقبال ہی کے اشعار کی صدائے بازگشت معلوم ہوتے ہیں۔ اثرؔ نے اقبال کے ترتیب دیئے ہوئے الفاظ ہی سے فائدہ نہیں اٹھایا بلکہ ان تراکیب کی وضع پر خود بھی بعض اچھی ترکیبیں وضع کی ہیں۔ مثلاً بربطِ یزداں، شمشیرِ اھرمن کش، نشہ ہائے یزداں اور خیبر اھرمن۔ ایک اور بات جس میں اثرؔ صہبائی نے اقبال کا اثر قبول کیا ہے وہ چند مکالماتی نظمیں ہیں مثلاً ''شاعر اور دنیا'' اور ''شاعر اور خدا''۔ فغان نیم شبی کی اصطلاح اقبال نے بیشتر مواقع پر استعمال کی ہے۔ اس سے مراد وہ نیم شبانہ آہ وزاری اور تڑپ و گداز ہے جو عاشق صادق کے ساتھ مخصوص ہوتا ہے۔ ایک جگہ اس کا استعمال ملاحظہ ہو:

ہزار مرحلہ ہائے فغاں نیم شبی

اثرؔ کے یہاں اس اصطلاح کا استعمال ملاحظہ ہو۔ بالکل وہی فضا پیدا کی ہے جو اقبال کے اکثر اشعار کی جان ہوتی ہے۔ ''بامِ رفعت'' سے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ادھر بھی اک نگہ دلنواز ہو جائے — مرا وجود سراپا گداز ہو جائے
فغان نیم شبی کو عطا ہو سوز و گداز — ہر ایک آہ و آئینہ خلوص و نیاز (۳۷)

اب اثرؔ کے کچھ اشعار پیش کیے جاتے ہیں جو موضوعات اور اسلوب کے لحاظ سے اقبال سے ملتے جلتے ہیں:

موجود ہوں جاوداں ہوں موہوم نہیں — ہو جاؤں فنا یہ میرا مقسوم نہیں
بوسیدہ ہے تجھ میں حیاتِ ابدی — معلوم ہے مجھ کو تجھ کو معلوم نہیں (۳۸)

اردو شاعری میں بہت سے شعرا نے میرؔ کے اسلوب کو اپنانے کی کوشش کی لیکن وہ میر کے رنگ کو بہت دنوں تک نہ نبھا سکے اور بہت جلد اس اسلوب کو ترک کر دیا۔ اثرؔ صہبائی کے ہاں اقبال کے ساتھ ساتھ میر کا بھی کچھ کچھ انداز ملتا ہے۔ اثر نے ''جامِ طہور'' کے دیباچے میں خود اس بات کا اقرار کیا ہے کہ ''راحت کدہ'' میں میر کا اثر غالب ہے۔ (۳۹)

''راحت کدہ'' کا مقدمہ لکھتے ہوئے اثر لکھنوی نے بھی لکھا ہے:

متعدد اشعار میں میر کا رنگ بھی جھلکتا ہے اور یہی ایک پرستار میرؔ کے عقیدے میں شاعری کی معراج ہے۔ (۴۰)

میر کی طرح کی شاعری میں بھی غمِ عشق کی فراوانی پائی جاتی ہے۔ اثرؔ نے میر کی بعض

غزلوں کی زمینوں کو بھی نہایت خوبصورتی کے ساتھ اپنی غزلوں میں استعمال کیا ہے۔ اثرؔ کے شعری مجموعے ''راحت کدہ'' کی غزلوں میں میر کی طرح کا سوز و گداز دیکھا جا سکتا ہے۔ اس شعری کلام کی بعض رباعیاں اور غزلیں مضمون کے اعتبار سے ایسی ہیں جن کو پڑھ کر گماں گزرتا ہے کہ میر کی ہونگی۔ اب اثر کی شاعری میں میر کے اسلوب اور انداز کی جھلک ملاحظہ ہو:

سطحِ دریا پر ابھر آتے ہیں
بلبلے ہیں تیرتے جاتے ہیں ہم
تیر کر لیکن ذرا کچھ دور تک
اس نئی ہستی سے گھبرا جاتے ہیں ہم
تنگ آ کر وحشت افکار سے
سر انہیں موجوں سے ٹکراتے ہیں ہم
ٹوٹ کر دریا میں ہو جاتے ہیں غرق
پھر سکون بے خودی پاتے ہیں ہم (۴۱)

اثرؔ کی فلسفیانہ فکر ایک نشاطیہ لہجہ دیتی ہے۔ ''راحت کدہ'' کے بعد اثرؔ اپنی محبوب بیوی کے عارضی غم سے باہر نکل آئے تھے اور زندگی کے بارے میں رجائی طریقہ اختیار کر لیا تھا۔ اس طرح میر کے رنگ کی جھلک ان کے کلام میں عارضی ثابت ہوئی۔ اس غم نے ایک فائدہ پہنچایا کہ زندگی اور موت کے بارے میں خدا اور انسان کے بارے میں سوچ بچار کا موقعہ ملا۔ اردو شاعری میں فکری لحاظ سے غالب کا کلام بڑی اہمیت رکھتا ہے جنہوں نے اپنی غزلوں میں حیات و کائنات کے بارے میں فکر کی دعوت دی ہے۔ اس لحاظ سے اثر صہبائی کی شاعری میں غالب کا اثر میر سے زیادہ ہے۔ غالب کے شعری اثرات کا اعتراف کرتے ہوئے اثرؔ ''جامِ طہور'' کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

چودہ برس کی عمر میں شاعری کی الٰہامی کیفیت محسوس ہونے لگی۔ انہیں ایام میں مجھے غالب اور اقبال کے کلام سے لگاؤ پیدا ہوا جو آج تک برابر ترقی کر رہا ہے۔ (۴۲)

غالب کا نظریہ زندگی کے بارے میں میر کی طرح افسردہ نہیں بلکہ وہ غم و اندوہ میں بھی نشاطیہ پہلو تلاش کر لیتے ہیں مثلاً

کچھ تو دے اے فلک نا انصاف
آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی

اس طرح اثر صہبائی بھی زندگی کے بارے میں ناامید نہیں وہ کہتے ہیں:

شامِ فرقت کو بھول جاتا ہوں
صبحِ عشرت کو بھول جاتا ہوں
بادہ ذکر میں فنا ہو کر
رنج و راحت کو بھول جاتا ہوں (۴۳)

خدا کے متعلق مرزا غالب کا نظریہ مندرجہ ذیل شعر سے بہت اچھی طرح واضح ہوتا ہے:

اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

اثر صہبائی کا خیال بھی خدائے بزرگ و برتر کے معاملے میں کچھ ایسا ہی ہے:

تو ہی ساری ہے جب ہر ایک شے میں
جائے موجود کیا ہے معدوم کیا (۴۴)

حوالہ جات

۱۔ حبیب کیفوی، ''کشمیر میں اردو''، لاہور، مرکزی اردو بورڈ، بار اول، ۱۹۷۹ء ص: ۲۱۳۔۲۱۹
۲۔ اثر صہبائی، ''جامِ طہور''، لاہور، تاج کمپنی لمیٹڈ، ۱۹۳۷ء، ص: ۴
۳۔ رسالہ، ''قوسِ قزح''، سالانہ نمبر ۱۹۲۶ء ص: ۱۵
۴۔ اثر صہبائی، ''خمستاں''، سیالکوٹ، آزاد بک ڈپو، ۱۹۳۳ء ص ۳۱
۵۔ ایضاً، ص: ۴۰
۶۔ ایضاً، ص: ۱۳۹
۷۔ ایضاً، ص: ۱۳۹
۸۔ ایضاً، ص: ۱۴۰
۹۔ ایضاً، ص: ۱۷۰
۱۰۔ ایضاً، ص: ۱۵۰
۱۱۔ ایضاً، ص: ۷۰
۱۲۔ ایضاً، ص: ۹۵
۱۳۔ ایضاً، ص: ۱۰۵
۱۴۔ ایضاً، ص: ۱۲۱
۱۵۔ اثر صہبائی، ''راحت کدہ''، لاہور، تاج کمپنی لمیٹڈ ۱۹۴۲ء، ص: ۱۱
۱۶۔ ایضاً، ص: ۵۰

۱۷۔ ایضاً،ص:۵۸
۱۸۔ ایضاً،ص:۷۷
۱۹۔ اثر صہبائی،''روحِ صہبائی''،لاہور،تاج کمپنی لمیٹڈ،۱۹۴۵ء،ص:۱۱
۲۰۔ ایضاً،ص:۳۵
۲۱۔ تبصرہ روحِ صہبائی از ابواللیث صدیقی،ریڈیو براڈ کاسٹ لکھنؤ محفوظ تراشا از اثر مرحوم
۲۲۔ اثر صہبائی،''روحِ صہبائی''،ص:۹۲
۲۳۔ ایضاً،ص:۱۳۲
۲۴۔ ایضاً،ص:۱۵۲
۲۵۔ ایضاً،ص:۸۵
۲۶۔ ایضاً،ص:۱۷۰
۲۷۔ اثر صہبائی،''جامِ طہور''،ص:۳۵
۲۸۔ ایضاً،ص:۷۲
۲۹۔ ایضاً،ص:۱۵۶
۳۰۔ اثر صہبائی،''جامِ صہبائی'' 'لاہور'دارالتالیف'۱۹۲۸ء'ص:۱۸
۳۱۔ اثر صہبائی،''جامِ طہور''،ص:۱۸
۳۲۔ سید محمد جعفر شاہ،''مقدمہ''،مشمولہ،''بحضور سرورِ کائناتؐ'' از اثر صہبائی، لاہور،انجمن حمایتِ اسلام،س۔ن،ص:۲۴
۳۳۔ اثر صہبائی،''حضور سرورِ کائناتؐ''،ص:۳۵
۳۴۔ ایضاً،ص:۳۹
۳۵۔ اثر صہبائی،''روحِ صہبائی''،ص:۱۴
۳۶۔ اثر صہبائی،''بامِ رفعت''،لاہور،اکادمی پنجاب،۱۹۴۵ء،ص:۱۸
۳۷۔ ایضاً،ص:۲۵
۳۸۔ ایضاً،ص:۵۵
۳۹۔ اثر صہبائی،''اشارات''،''جامِ طہور''،ص:۹
۴۰۔ اثر لکھنوی،''مقدمہ''،''راحت کدہ''ص:ی
۴۱۔ اثر صہبائی،''راحت کدہ''،ص:۱۱۵
۴۲۔ اثر صہبائی،''اشارات''،جامِ طہور،ص:۸
۴۳۔ اثر صہبائی،''خمستاں''،ص:۲۷
۴۴۔ ایضاً،ص:۵۰

آسی ضیائی رامپوری بطور اقبال شناس

آسی ضیائی رامپوری کا نام قدآور اقبال شناس ناقدین میں شامل ہے۔آسی ضیائی نے ایک تو علی گڑھ یونیورسٹی میں رشید احمد صدیقی جیسے اقبال شناس کی شاگردی اختیار کی دوسرے اقبال کی مادرِ علمی مرے کالج سیالکوٹ کی علمی و ادبی فضا نے آسی ضیائی کی ''اقبال شناسی'' کے لیے مہمیز کا کام کیا اور یوں آسی ضیائی نے کلام اقبال پر خامہ فرسائی کرتے ہوئے ایک کتاب اور چار مضامین رقم کیے۔

''کلامِ اقبال کا بے لاگ تجزیہ'' آسی ضیائی کی اقبال شناسی کے حوالے سے مستند تصنیف ہے۔اس کتاب میں کلامِ اقبال کے اہم خصائص کا اجمال کے ساتھ تجزیہ کیا گیا ہے ۔ایک صد مضامین پر مشتملیہ کتاب تین حصص میں منقسم ہے۔ پہلا حصہ دو ابواب پر، دوسرا حصہ تین ابواب پر تیسرا اور آخری حصہ ایک باب پر مشتمل ہے۔''کلامِ اقبال کا بے لاگ تجزیہ'' کے آغاز میں آسی ضیائی نے ایک جامع مقدمہ بعنوان ''اِدعا'' رقم کیا ہے جو کتاب کی اہمیت اور وجہ تحریر پر روشنی ڈالتا ہے۔کتاب کے حصہ اول میں محبت ،جستجو ،متصوفانہ، مذہبیت ،مظاہرِ قدرت سے محبت ،مذہبی روایات سے محبت ،تصوف ،عمومی تبصرہ ، خاص موضوعات ،ترجمے ،بقیہ نظمیں، غزلیں، دوسرا دور، رومانی شاعری، ایک انوکھا قیاس ،خورشید، ایک دلچسپ انکشاف، دوسری نظمیں ، نئے دور کا آغاز ،خلاصۂ بحث اور محرکات جیسے مضامین کی فہرست ہے۔

کتاب کے حصہ دوم میں بعد کی شاعری ،اسلوب کا جائزہ ،وسیلہ، ساخت و پرداخت ،حکیمانہ اسلوبِ شاعری کی خصوصیات ،سادگی اور ندرت ،تمثیل نگاری ،تخاطبِ بالغائب ،رموز وعلائم کا استعمال، حالیؔ، اکبرؔ، اقبالؔ، صوت وآہنگ کا اہتمام ،تصورات و پیغام پر تبصرہ، خودی، تصورِ خودی کا وھبی و ماحولی پس منظر، اثباتِ خودی ،اثباتِ خودی کے مقامات، شرفِ انسانی، تسخیرِ فطرت، مسئلہ خیر وشر اور روح وجسم کا اتحاد، مسئلہ جبر وقدر، تخلیقِ مقاصد، بدویت، عقل وعشق، ارتقا ،مردِ کامل کے سابقہ تصورات ،صوفیا، اخوانِ الصفاء کے مصنفین اور ابنِ مکویہ، عبدالکریم الجیلی، اس

تصور کی غایت ،مغربی مفکرین ،ڈارون ،نطشے ، برگساں ،اقبال ،حیاتی ارتقا پر اعتراض ،اقبال کی تاویلات ،قرآن کی تصریحات ،اقبال کی تاویلات کی وجہ ،اسرائیلی روایات اوران کے اثرات ، المہدی کا تصور ، لابخل پہلو ،ایک تضاد ، ان اعتراضات کا جواب ، جذباتی تصور ،عقلی تصور ،لنین اور دوسرے غیر مسلم ،زمان ،لاتسبّو الدھر کی تحقیق ،متفرقات ، رمزے ،ابلیس ،مسلمانوں کا عام تصور ، اس تصور کا تجزیہ ، جبریل ،پیش گوئیاں عورت ،ایک شعر اور مخالفت کا نفسیاتی سبب جیسے مضامین کی فہرست شامل ہے۔

کتاب کا حصہ سوم میں خاتمہ ءکلام ،خلاصۂ بحث ، پیغامِ اقبال کے محرکات ،اقبال کے اثرات ،الف معاشرے پر ،ایک شبہ کا ازالہ ، ب ادب پر اور اقبال کا مستقبل جیسے مضامین کی فہرست ہے۔ درج بالا فہرستِ مضامین میں واضح ہو جاتا ہے کہ اس کتاب میں اہلِ علم کے ساتھ ساتھ طلبا کے استفادہ کا بھی خیال رکھا گیا ہے۔ دراصل اقبال پر لوگوں نے ماضی میں بھی لکھا۔ اب بھی لکھ رہے ہیں اور آئندہ بھی کام کرتے رہیں گے۔ اقبال پر لکھنے والوں میں بڑے چوٹی کے اہلِ علم وقلم بھی شامل ہیں اور اوسط وادنیٰ درجے کے بھی۔ اس انبوہِ عظیم کی کاوشوں کے انبار میں ایک منفرد اضافہ ''کلامِ اقبال کا بے لاگ تجزیہ'' ہے۔ آسی ضیائی نے کئی سالوں تک اس کی تیاری کے لیے محنت کی اور بالآخر جب اس کی اولین اشاعت ہوئی تو قارئین کو ابتدائی صفحات ہی میں اس کتاب کی وجۂ تحریر کا علم خود آسی ضیائی کی زبانی کچھ یوں ہوا:

> جب میں کسی بے مقصد مقرر کو سامعین کے گرمانے کی خاطر اس قسم کے اشعار پڑھتے سنتا ہوں ''نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر ،تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں پر'' یا بازار سے گزرتے ہوئے ایک ہوٹل کی دیوار پر اس طرح کے نعرے لکھے دیکھتا ہوں: ''اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی ،جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی یا ریڈیو پر گائی ہوئی کسی طوائف کی آواز میرے ذوق کو اس طرح کچلتی ہوئی بارِ سماعت ہوتی ہے: ''بتاؤں تجھ کو مسلماں کی زندگی کیا ہے ،یہ ہے نہایتِ اندیشہ وکمالِ جنوں'' تو مجھے ہر حساس شخص کی طرح ،دو گونہ تکلیف ہوتی ہے۔ ایک خود اقبال پر ظلم ہوتا دیکھ کر دوسرے اقبال کی قوم کو بھٹکانے اور سلانے کی ان کوششوں کو سوچ کر۔(1)

آسی ضیائی کو دکھ اس بات کا تھا کہ اقبالؔ کو ایک بُت کی طرح پوجا جا رہا تھا۔ انھیں یہ بات گوارا نہ تھی کہ ایک بدکردار مقرر ،گھٹیا اخلاق کا بے ایمان دوکاندار ،ایک سماج کی دھتکاری ہوئی

بازاری عورت، اقبال کے کلام کی بے حرمتی کرے۔ چنانچہ وہ اپنے پیشِ رو اقبال شناسوں پر تنقید کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> میرے معزز بزرگ جنھوں نے فکرِ اقبال کے بے شمار گوشے ہمارے سامنے آشکار کیے خواہ اس پر براہی مانیں۔ یہ کہے بغیر نہ رہوں گا کہ ان کی نیک نیتی محنت و کاوش اور ذہانت وعلمیت کا اعتراف کرنے کے باوجود میں یہی سمجھتا ہوں کہ اگر وہ اقبال پر لکھتے وقت ذرا زیادہ محتاط ہوتے، اس کے پیغام اور فلسفے کی تشریح ہی پر بس نہ کرکے اس پر سنجیدہ تنقید کے ہر پہلو بھی نکالتے تو غالباً اقبال کو یہ بت کا مقام حاصل نہ ہوتا۔(2)

آسی ضیائی کی زیرِ تبصرہ کتاب کے بارے میں مزید تاثر قائم کرنے سے پہلے اس کے اہم مضامین کا مختصر تعارف کرانا ضروری ہے۔ چنانچہ ''کلامِ اقبال کا بے لاگ تجزیہ'' کے مضامین کا مختصر جائزہ درج کیا جاتا ہے۔ جس سے کلامِ اقبال کے بارے میں آسی ضیائی کے نقطہ نظر کی وضاحت بھی ہوتی ہے۔ ''محبت'' مضمون میں آسی ضیائی نے کلامِ اقبال کے حوالے سے محبت کو موضوع بحث بنایا ہے۔ کیونکہ یہی عنصر ہے کہ جو اقبال کی ابتدائی شاعری میں ان کے سفرِ انگلستان سے پہلے پہلے تک نظر آتا ہے۔ اور اقبال کی شاعری کے ارتقا کے ساتھ ساتھ اس عنصر کا ارتقا بھی عنوان کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ ہوتا نظر آتا ہے۔

''وطن سے محبت'' مضمون میں اقبال کی جذبہ محبت کو وطن سے منسوب کرتے ہوئے قدرے تفصیل سے بحث کی ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے پہلے تو دہلوی اور لکھنوی دبستانوں کا ذکر کیا ہے۔ بعد ازاں انھوں نے وطن پرستی کو مغربی ادب کی دین قرار دیتے ہوئے پہلے حالی او رپھر اقبال کے کلام پر بحث کی ہے۔ اور اس سلسلہ میں بانگِ درا کی نظم ''نیا شوالہ'' کے چند غیر مطبوعہ اشعار کا حوالہ دیا ہے۔ ''مظاہرِ قدرت سے محبت'' مضمون میں آسی ضیائی نے مظاہرِ قدرت کی کامیاب منظر کشی کی دو وجوہات تحریر کیں ہیں۔ ایک تو اردو ادب میں مغربی شاعری کی نفوذ پذیری اور دوسری اقبال کی وادی کشمیر سے وابستگی، اس سلسلے میں بانگِ درا ہی کی اکثر نظموں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ ''مذہبی روایات سے محبت'' مضمون میں مذہبی روایات سے محبت کا موضوع بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً بلالؓ جیسی نظم پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ مغربی درسگاہوں سے کسبِ فیض کرنے کے باوجود اقبال اپنے مذہب سے گہری محبت رکھتے ہیں۔ آسی ضیائی نے محبت کے بعد کلامِ اقبال کے جس دوسرے عنصر پر بحث کی ہے۔ وہ ''جستجو'' ہے۔ اقبال کے نظریہ حرکت وعمل

کی بنیاد یہی ''جستجو'' ہے۔جس کے مطابق جستجو صرف مظاہرِ قدرت تک محدود نہیں بلکہ اس کی رسائی تو ''خالقِ کائنات کے حضور'' تک ہے۔

دینی شعائر سے اقبال کی وابستگی کے بعد آسی ضیائی نے اقبال کے ان صوفیانہ خیالات پر بحث کی ہے۔ جو انھوں نے موروثی روایات کی طرح اپنے بزرگوں سے پائے تھے۔مضمون ''تصوف'' میں آسی ضیائی نے تصوف اور شاعری کے گہرے تعلق پر ایک اجمالی نظر ڈالتے ہوئے تصوف کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

> اس کی تعریف مختصر الفاظ میں، ظاہر داری اور رسمیات سے آزادی اور خدا کے ساتھ روحانی لگاؤ کی جاسکتی ہے۔(3)

اس سلسلے میں آسی ضیائی نے قرآن وسنت کے علاوہ پروفیسر سید صفی حیدر کی کتاب ''تصوف اور اردو شاعری'' کے حوالے دینے کے بعد اقبال کی نظموں ''عقل ودل''، ''شمع پروانہ''، ''دردِ عشق'' اور ''التجائے مسافر'' وغیرہ میں تصوف کے عناصر کی نشاندہی کی ہے۔کلامِ اقبال میں محبت، جستجو اور تصوف کے عناصر کی نشاندہی کرنے کے بعد آسی ضیائی اشعار کے حوالے دے کر ان تینوں عناصر میں جہاں قدرِ مشترک دریافت کرتے ہیں۔وہاں انھیں ان کیلیکجائی مجموعۂ اضداد بھی نظر آتی ہے:

> جو اقبال اپنے ذوقِ تصوف کی بنا پر پوری نوعِ انسانی کی ہمدردی کا دم بھرے۔اس کا ذہن وطن کی جغرافیائی حدود کی تنگی کا کیوں کر متحمل ہوسکا؟ اور جس شخص کو ''غبارِ راہِ حجاز'' بننے کی تمنا ہو وہ ہندوستان کی مورتی اپنے دل میں سجا کر اس کی پوجا کیوں کرسکتا ہے۔ نیز اگر اقبال محبت کے ذریعے بیمار قوموں کے شفا پانے کے قائل ہیں تو اپنی قوم سے یہ کسی قسم کی محبت ہے کہ اس کو چھوڑ کر جنگلوں اور پہاڑوں میں سکون کی تلاش کی جائے۔(4)

''خاص موضوعات'' مضمون میں آسی ضیائی کہتے ہیں کہ ابتدائی دور کی شاعری میں اقبال کو شمع، سورج، پھول اور بچہ جیسے خاص موضوعات نے مہمیز کیا ہے۔ابتدائی دور میں اقبال کی طبع زاد نظموں کے بعد آسی ضیائی نے قارئین کی توجہ ''ایمرسن''، ''ٹینی سن'' اور ''لارنگ فیلو'' وغیرہ ان کی نظموں کی جانب مبذول کروائی ہے جن کے اردو تراجم بانگِ درا کا حصہ ہیں۔ بقیہ ''نظمیں'' کے عنوان سے ان نظموں پر بحث کی گئی ہے جن میں اقبال نے مختلف شخصیات جیسے ،غالب، سرسید، داغ اور آرنلڈ وغیرہ کو موضوعِ سخن بنایا ہے۔مثلاً نالۂ فراق، داغ وغیرہ۔

''غزلیں''، مضمون میں بانگِ درا کی غزلوں میں اُستاد داغ کے تتبع کے باعث جن رسمی مضامین کا اظہار اقبال نے کیا۔ اس کا ذکر آسی ضیائی نے کیا ہے۔ ''رومانی شاعری'' میں پہلے دور کی شاعری کے بعد اقبال کے قیام یورپ کے زمانے (۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء) تک کو دوسرا دور قرار دینے کے بعد آسی ضیائی نے اقبال کی شاعری میں ''عشقِ مجازی'' کی موجودگی کا ثبوت ''عاشق ہرجائی''، ''سلیمیٰ''، ''وصال''، ''شمع''، ''جگنو'' اور ''حقیقتِ حسن'' جیسی نظموں کے حوالے سے دیا ہے۔ آسی ضیائی کے نزدیک اقبال کی اس ''بوالہوسی'' کا سبب قیامِ یورپ ہے۔ بانگِ درا کی نظموں ''پھول کا تحفہ عطا ہونے پر''، ''وصال''، ''کلی'' اور سلیمیٰ کے متعدد اشعار پر دلائل دے کر آسی ضیائی نے کلامِ اقبال میں عشقِ مجازی کی موجودگی کی نشاندہی کی ہے۔

بانگِ درا کی نظم ''کلی'' میں لفظ خورشید تین بار اور دیگر نظموں میں جا بجا دیکھ کر آسی ضیائی نے مضمون ''خورشید'' میں اس شک کا اظہار کیا ہے کہ کلام اقبال میں ''خورشید'' کا مطلب سوچ نہیں بلکہ کوئی انسانی ہستی ہے۔

آسی ضیائی نے مضمون ''ایک دلچسپ انکشاف'' میں کلامِ اقبال کے حوالے سے دلچسپ انکشاف یہ کیا ہے کہ قیامِ یورپ کے ابتدائی حصہ میں اقبال کو اپنی محبت کی کامیابی کے باعث کائنات کا ذرہ ذرہ دامِ محبت میں گرفتار نظر آتا ہے تو وہ حسن و عشق، کلی، حقیقتِ حسن اور ''.....کی گود میں بلی دیکھ کر''، جیسی نظمیں رقم کرتے ہیں مگر اگلے ہی حصے میں شاعر کی ذہنی کیفیات جس طرح پلٹا کھاتی ہیں۔ اس کے نتیجے میں ''عاشقِ ہرجائی''، ''کوشش ناتمام''، ''نوائے غم''، ''عشرت امروز'' اور ''فراق'' جیسی نظمیں معرضِ وجود میں آتی ہیں۔ ''دوسری نظمیں''، مضمون میں دوسری نظموں سے مراد بانگِ درا کے دوسرے دور کی وہ نظمیں ہیں جن کا ذکر پہلے نہیں کیا گیا یعنی طلبہ علی گڑھ کے نام ''صقلیہ''، ''پیامِ عشق'' اور ''عبدالقادر کے نام'' ان نظموں میں اقبال کا نقطہ نظر بدلا اور انھوں نے عزیز احمد کے قول کے مطابق، وطن سے سیاسیات کا رشتہ توڑ کر مذہب سے جوڑ لیا۔ ''نئے دور کا آغاز'' مضمون میں مذکورہ بالا چار نظموں کے حوالے ہی سے کلامِ اقبال کے نئے دور پر بحث کی گئی ہے۔ جس میں اقبال کا کردار ایک عارف اور راہنما کا ہے۔

''خلاصہ بحث'' مضمون میں آسی ضیائی کے نزدیک مجموعی طور پر ان نظموں سے اقبال کے درج ذیل اویہائے نظر معلوم ہوتے ہیں:

۱۔ تہذیبِ مغرب کا انجام ہلاکتِ یقینی ہے۔

۲۔ وطن کی بجائے کلمہ طیبہ مسلمانوں کے لیے وجہِ اشتراک ہے۔
۳۔ ''عشق گرہ کشا'' اور مسلسل جدوجہد ہی زندگی برقرار رکھنے کی ضامن ہیں۔

''محرکات'' مضمون میں آسی ضیائی نے بتایا ہے کہ ''کلامِ اقبال'' کی ارتقائی تبدیلی اور انکشاف کے محرکات میں مغربی تہذیب، فلسفہ عجم اور عشق مجازی کی ناکامی ہیں۔ ''اسلوب کا جائزہ'' مضمون میں اقبال کے فلسفہ و پیغام کا تجزیہ کرنے سے قبل، ان کے اسلوب پیغام کا جائزہ لیا گیا ہے۔ جس کی بحث کا آغاز کلامِ اقبال کے ذرائع اظہار و ابلاغ سے کیا گیا ہے۔ ''وسیلہ'' مضمون میں آسی ضیائی نے بتایا ہے کہ کلامِ اقبال کی عالمگیر مقبولیت میں بڑا ہاتھ ان کے فارسی کلام کا ہے۔ یعنی اسرارِ خودی، پیامِ مشرق، زبورِ عجم وغیرہ کی جرمنی، ترکی، ایران، روس، امریکہ اور چین وغیرہ میں پذیرائی کا سبب فارسی زبان ہے۔ یہاں آسی ضیائی نے پروفیسر مجیب احمد، جامعہ لیہ کے ''فکر اقبال'' میں شامل مضمون ڈاکٹر اقبال مرحوم کا اقتباس نقل کیا ہے:

> فارسی میں لکھنے کی بدولت ڈاکٹر اقبال اور ان کے فلسفے کا اسلامی دنیا میں چرچا ہو گیا۔ اور ہندوستان میں ان کی قدر کرنے والے کم نہیں ہوئے۔ ہندوستانی مسلمان ان سے فارسی زبان اختیار کرنے کی شکایت نہیں کر سکتے۔ اس لیے کہ فارسی جاننا ان کا ایک تہذیبی فرض ہے۔(5)

''ساخت پرداخت'' مضمون میں آسی ضیائی بتاتے ہیں کہ بانگِ درا سے پیامِ مشرق تک کلامِ اقبال میں دو اسالیب ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ ایک تو پاکیزہ اور ستھرے ذوق کی آئینہ دار فنکاری اور دوسرے متعین، پرحکمت اور راعیانہ اسلوب، حکیمانہ اسلوبِ شاعری کی خصوصیات مضمون میں بتاتے ہیں کہ اس اسلوب کی حامل تصانیف میں قرآن، انجیل، مثنوی مولانا روم کے علاوہ کلامِ اقبال بھی شامل ہے۔ ''سادگی اور ندرت'' میں آسی ضیائی نے دہلی اور لکھنو کے اہلِ زبان کے ساتھ کلامِ اقبال کا موازنہ کرنے کے بعد بالآخر فیصلہ اقبال کے حق میں دے دیا۔ کلامِ اقبال کی کامیابی کی ضامن یہی سادگی اور ندرت ہے۔ بانگِ درا، بالِ جبریل، ضربِ کلیم، جاوید نامہ، پیامِ مشرق اور زبورِ عجم کے حوالے سے آسی ضیائی نے کلامِ اقبال کے اسلوب میں تشکیلات کی اہمیت کے دو اسباب بیان کیے ہیں۔ اول انسان کی قصہ کہانی سے دلچسپی اور دوم بالواسطہ خطاب۔

''تخاطبِ بالغائب'' خصوصیت آسی ضیائی کے نزدیک دراصل تمثیل کا تسمہ ہے۔ اقبال کی نظموں ''شمع اور شاعر''، ''خضرِ راہ''، ''ابوالعلا معری''، ''پنجاب کے پیرزادوں'' سے اور

نصیحت وغیرہ میں تخاطب بالغائب کا اسلوب موجود ہے۔ ''رموز وعلائم کا استعمال'' مضمون میں آسی بتاتے ہیں کہ ''بادہ وساغر'' کی زبان میں ''مشاہدہ حق کی گفتگو'' کرنا صدیوں سے ہمارے شعرا کے خمیر میں داخل ہے مگر جدید رموز وعلائم کے علمبردار حالی، اکبر اور اقبال ہیں:

> حالی مضمون میں حالی کا تعارف، قارئین سے کروانے کے بعد آسی ضیائی نے حالی کے ہاں رموز وعلائم کی موجودگی کے ثبوت کے لیے حالی کا وہ نمونہ کلام نقل کیا ہے۔ جو ان کی نظم ''آزادی کی قدر'' سے متعلق ہے۔(6)

''اقبال'' مضمون میں آسی ضیائی نے بتایا ہے کہ حالی کے آزاد اکبر کے ''سید'' کی طرح اقبال کے علائم و رموز میں قلندر، شاہین، مومن وغیرہ شامل ہیں جن کی آفاقی حیثیت مسلم ہے۔ آسی ضیائی نے یہاں حالی کی مسدس اور اقبال کے ''جوابِ شکوہ'' کا موازنہ بھی کیا ہے۔ ''صورت وآہنگ کا اہتمام'' مضمون میں آسی بتاتے ہیں کہ اقبال کا صحیح ذوق صوت وآہنگ ہے۔ میر، انیس، نظیر اکبرآبادی اور جگر کے کلام سے مثالیں دینے کے بعد آسی ضیائی نے اقبال کی نظموں ''ایک شام''، ''مسجدِ قرطبہ''، ''ذوق وشوق''، ''ساقی نامہ'' اور ''ابلیس کی مجلسِ شوریٰ'' کے حوالے سے صوت وآہنگ کے موضوع پر بحث کی ہے۔ آپ اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> اقبال جیسے عظیم شاعر کو اپنی نظموں میں مناسب لب ولہجہ اور صوت و آہنگ پیدا کرنے کے لیے تکلف اور آورد کی ضرورت مطلق پیش نہیں آتی ہوگی۔ یہ ذوق بھی شعری لوازم سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر ایک شاعر ایک عظیم بات کو شعر کے گوارا پیکر میں ڈھالنے کی صلاحیت رکھتا ہے تو خود بخود اس کو اس کے لیے مناسب الفاظ لاتے وہی ملکہ بھی ہونا چاہیے اور چونکہ زبان خود انسانی احساسات کی صوتی عکاسی ہے۔ اس لیے شاعری کے احساساتِ لطیف بھی اصواتِ لطیف کا جامعہ پہن کر سامنے آتے ہیں۔(7)

''تصورات و پیغام پر تبصرہ'' میں آسی ضیائی نے اقبال کے ان تصورات و پیغام کا تجزیہ کیا ہے۔ جن کی تشریح وتعبیر اس سے قبل چھوٹا بڑا ادیب کر چکا ہے۔ ''تصورِ خودی کا ذہنی و ماحولیاتی پس منظر'' میں آسی ضیائی بتاتے ہیں کہ اقبال نے جب اپنے زمانے کے ہندوستان پر نظر ڈالی تو انھیں پتہ چلا کہ اُمتِ مسلمہ ہر اعتبار سے پست، کمزور اور محکوم ہے۔ مزید برآں مغرب سے مرعوب ہونے کے باعث اتحاد واخلاق سے بیگانہ بھی ہے تو انھوں نے نظموں کے ذریعے اس صورت حال پر اپنے درد وکرب کا اظہار کبھی کیا اور تفکر، تصورِ خودی بھی اس نظامِ فکر کا نتیجہ ہے۔

''اثباتِ خودی کے مقدمات (خودی)'' مضمون میں آسی ضیائی بتاتے ہیں کہ اثباتِ خودی کے مقدمات میں پہلا مقدمہ خود ''خودی'' ہے۔ عجمی تصوف کے جواب میں اقبالؔ نے جو اسلامی تصوف پیش کیا ہے اور اس کی بنیاد ہی خودی پر قائم ہے۔ اس ضمن میں آسی ضیائی نے میکش اکبر آبادیکی ''نقدِ اقبالؔ'' مولانا سید ہاشمی فرید آبادی کی ''تاریخ مسلمانانِ پاکستان و بھارت'' اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی ''تجدید و احیائے دین'' کے حوالے سے پیش کیا ہے۔ تسخیر کائنات میں آسی کہتے ہیں کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ انسان اپنی جسمانی، عقلی اور روحانی طاقتوں سے کائنات پر اپنا تسلط جماتا چلا جاتا ہے۔ آسی ضیائی کے نزدیک اقبالؔ کے ہاں جسمانی تسخیر سے زیادہ عقلی اور روحانی تسخیر پر زور دیا گیا ہے۔

''مسئلہ خیر و شر اور روح و جسم کا اتحاد'' مضمون میں آسی کہتے ہیں کہ اقبال کے نزدیک تخلیق انسانی کا مقصد حصولِ لذت نہیں خودی کا تحقق اور نشوونما ہے اور اسی بنا پر ہر وہ چیز خیر ہے جو تسخیر فطرت میں خودی کی معاون ہو اور اس کا مزاج شر ہے۔ اور یہ نظریہ اس وقت تک درست نہیں ہوسکتا جب تک روح و جسم کا اتحاد نہ تسلیم کرلیا جائے۔ مضمون ''مسئلہ جبر و اختیار'' میں آسی ضیائی نے کلامِ اقبال کے حوالے دے کر اس عقیدہ کو تمام مقدماتِ خودی کا قدرتی نتیجہ قرار دیا ہے۔ بعد ازاں مختلف فلسفیوں سے موازنہ کے بعد کلام اقبال میں اس عقیدہ کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔ مضمون ''بدویت'' میں آسی ضیائی نے کلامِ اقبال کے حوالے سے اقبال کی بدویت پسندی کی مختلف وجوہات بیان کی ہیں۔ جن میں اقبال کی فطرت شناسی اور مغربی تہذیب سے مرعوبیت شامل ہیں۔ یہاں اقبال کے اشعار کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ان کے نظریۂ فن پر بھی بحث کی ہے۔ ''عبدالکریم الجیلی'' مضمون میں آسی ضیائی کہتے ہیں کہ الجیلی کے انسانِ کامل کا راستہ الٰہیات اور مابعد الطبیعات میں بہت الجھا ہوا ہے۔ انھوں نے عبدالکریم الجیلی کے مسلک کی وضاحت کے لیے ''عزیز احمد'' کی کتاب ''اقبالؔ.....نئی تشکیل'' سے ایک اقتباس نقل کیا ہے:

> جیلی کا انسان کامل محسن اعلیٰ ترین رومانی قدروں کا حامل ہے۔ اس کی عینیت میں انتہا درجے کی شدت ہے۔ اور وہ ایک نظام الٰہیات کا پیداوار اور اس سے مربوط ہے۔(8)

''نطشے'' مضمون میں آسی ضیائی نے نطشے کے فوق البشر کا موازنہ برنارڈ شاہ اور برگساں کے فوق البشر سے کرنے کے لیے ''عزیز احمد'' کی کتاب ''اقبال نئی تشکیل'' سے حوالے

دیئے ہیں۔ارتقائے حیات کے جس عمل کو برگساں نے ''جوشش حیات'' کا نام دیا ہے۔آسی ضیائی نے اسیکوموضوع بنا کرعقل جبلت اوروجدان پر بحث کی ہے۔آسی مضمون ''اقبال'' میں کہتے ہیں کہ اقبال نے اپنا تصور مردمومن مرتب کرتے وقت مذکورہ بالا فلسفیوں کے نظریات سے استفادہ کیا ہے۔آسی ضیائی نے اس ضمن میں ''ساقی نامہ'' کے اشعار کا حوالہ دیا ہے:

یہ موجِ نفس کیا ہے؟ تلوار ہے
خودی کیا ہے تلوار کی دھار ہے
ازل سے ہے یہ کشمکش میں اسیر
ہوئی خاکِ آدم میں صورت پذیر

آسی ضیائی کے نزدیک کلامِ اقبال کا ایک لاینحل پہلو یہ ہے کہ اگر ارتقا کی کوئی آخری منزل نہیں آسکتی تو پھر انسانِ کامل کیوں کر آسکتا ہے؟ ایک تضاد مضمون میں اسرارِخودی اور بالِ جبریل، میں آنحضورؐ کے متعلق اقبال کے افکار کو آسی ضیائی نے متضاد قرار دیا ہے۔''ان اعتراضات کا جواب'' مضمون میں مذکورہ بالا اعتراضات کے جواب میں آسی ضیائی نے یہ نظریہ پیش کیا ہے۔کہ اقبال کا ''انسانِ کامل'' کا تصورِ شاعری میں محض ایک مثالی تصور ہے۔ ''جذباتی تصور'' مضمون میں آسی ضیائی نے اقبال کے جذباتی تصور اسلام کے حوالے سے ان کے پسندیدہ صحابہ کرام، سپہ سالاروں اور سیاسی شخصیات کا ذکر کیا ہے۔مثلاً حضرت ابو ذرؓ، سلمانؓ، ابو بکرؓ، عمرؓ، خالدؓ، قطب الدین ایبکؒ، احمد شاہ ابدالیؒ، ٹیپو الجیلی وغیرہ۔

''عقلی تصور'' مضمون میں آسی ضیائی نے اقبال کی نظموں خضرِ راہ، خدا کا فرمان ،فرشتوں کے نام، ابلیس کی مجلس شوریٰ کے حوالے سے ان کے اشتراکی اور اقتصادی نظریات پر بحث کی ہے: مثال کے طور پر درج ذیل ملاحظہ ہو:

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

''لنین اور دوسرے غیر مسلم'' مضمون میں بالِ جبریل اور جاوید نامہ کے حوالہ جات کے بعد آسی ضیائی نے واضح کیا ہے۔کہ لنین اور افغانی وغیرہ کو اقبال نے اپنے تخیل میں مسلمان بنانا چاہا ہے۔''زمان'' مضمون میں قرآن وحدیث اور کلام اقبال کو مدِ نظر رکھتے ہوئے آسی ضیائی نے واضح کیا ہے کہ اقبال نے قدیم تصور زماں کے برخلاف جس میں زماں کو ایک معروضی حقیقت

فرض کیا جاتا ہے۔ زماں کو داخلی اور موضوعی قرار دیا ہے۔ ''جبریل'' مضمون میں آسی ضیائی نے بالِ جبریل کی نظموں ''ابلیس و جبریل'' اور ''مسجد قرطبہ'' کے ساتھ ساتھ بانگِ درا کی خضر راہ اور طلوع اسلام کے حوالے سے جبریل پر بحث کی ہے۔ ''پیش گوئیاں'' مضمون میں آسی ضیائی نے شمع و شاعر، جواب شکوہ، خضرِ راہ، طلوع اسلام، ساقی نامہ مسجد قرطبہ اور ابلیس کی مجلس شوریٰ میں مغربی تہذیب کی تباہی اور مسلمانوں کے روشن مستقبل کے بارے میں اقبال کی پیش گوئیوں پر بحث کی ہے۔ ''دعائیں'' مضمون میں آسی ضیائی کہتے ہیں کہ اقبال کی دعائیں ملت کے لیے تھیں اور اس میں کہیں بھی مادی اشیا کی خواہش نہیں کی گئی۔ ''عورت'' مضمون میں آسی ضیائی کہتے ہیں کہ اقبال نے اس مسئلہ میں فلسفیانہ طور پر بھی شریعت ہی کی حمایت کی ہے۔ اس بات کو آسی ضیائی نے مختلف حوالوں سے ثابت کیا ہے۔

جوہر مرد عیاں ہوتا ہے بے منتِ غیر
مرد کے ہاتھ میں ہے جوہر عورت کی نمود

''اس مخالفت کا نفسیاتی سبب'' مضمون میں آسی ضیائی کہتے ہیں کہ اقبال خود اوائل جوانی میں ایک ناکام محبت کا شکار رہ چکے تھے۔ اس لیے انھوں نے آزادیٔ نسواں کی مخالفت کی۔ خلاصہ بحث میں آسی ضیائی نے اقبال کو فلسفی اقبال سے زیادہ شاعر اقبال قرار دیا ہے۔ ''پیغامِ اقبال کے محرکات'' مضمون میں آسی ضیائی نے وطنیت، عجمی تصوف سے بیزاری، نظریۂ عشق اور حرکت و عمل کو پیغام اقبال کے محرکات قرار دیا ہے۔ ''اقبال کے اثرات معاشرہ پر'' مضمون میں آسی ضیائی نے کلامِ اقبال کے معاشرہ پر اثرات کے ضمن میں اقبال کو مجدد قرار دیتے ہوئے ان کی عظمت کا اعتراف کیا ہے۔ ایک شبہ کا ازالہ مضمون میں آسی ضیائی کہتے ہیں کہ مسلم معاشرے میں نتیجہ فکری و عملی انقلاب لانے والا تنہا شخص اقبال ہی نہیں بلکہ محمد بن عبدالوہاب نجدی، شاہ ولی اللہ، سید احمد بریلوی اور جمال الدین افغانی نے بھی اس کام میں حصہ لیا۔

آسی ضیائی کے خیال میں اقبال کے ادب پر اثرات معاشرے پر چھوڑے جانے والے اثرات سے کہیں زیادہ دیرپا اور عظیم ہیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے قدیم شعرا (میرؔ اور غالبؔ) کے ساتھ ساتھ اقبالؔ کے ہمعصر شعرا (فانیؔ، حسرتؔ اور اصغرؔ) سے موازنہ کیا ہے اور پھر ان جدید شعرا (رازرام بریلوی، عاصی کرنالی، ماہر القادری اور قابلِ اجمیری) کا ذکر کیا ہے جن پر کلام اقبال کے اثرات بہت واضح ملتے ہیں۔ ''اقبال کا مستقبل'' کتاب کے اس آخری مضمون

میں آسی ضیائی نے کلامِ اقبال کے ان موضوعات کا دوبارہ ذکر کیا ہے جن پر اس سے قبل اسی کتاب میں مباحث ہو چکے ہیں۔ یہاں کلامِ اقبال کیمعائب ومحاسن واضح کرنے کے بعد بالآخر اقبال کوایک عظیم شاعر قرار دیا گیا ہے۔

آسی ضیائی رام پوری کا ایک اہم مضمون ''اقبال .....میری اور آپ کی نظر میں'' جون ۱۹۴۹ء میں مرے کالج میگزین کے حصہ اردو میں چھپا۔ یہ مقالہ کالج کے طلبا کے لیے مخصوص ہونے کے باعث اشاعت سے قبل یومِ اقبال کے موقع پر ۲۹ اپریل ۱۹۴۹ء کو کالج ہال میں پڑھا گیا۔ آغاز ہی میں آسی ضیائی نے اقبال کے لیے اپنی اور طلبا کی عقیدت کا موازنہ کیا ہے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے کلامِ اقبال سے اشعار کا انتخاب کیا ہے۔

عشق سے پیدا نوائے زندگی میں زیر و بم
عشق سے مٹی کی تصویروں میں سوز دمبدم

موازنہ کے سلسلے میں آسی ضیائی نے اپنے اور طلباء کے ماحول اور زمانے کی تبدیلی کو بھی موضوعِ بحث بنایا ہے۔ یہاں آسی ضیائی طلبا کو مشورہ دیتے ہیں کہ وہ اقبال کی شاعری کو سمجھنے سے قبل اردو شاعری کا پس منظر سمجھیں تبھی اقبال شناس ہو سکیں گے۔ پیغامِ اقبال کو سمجھنے کے سلسلے میں آسی ضیائی طلبا سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں:

> آپ اقبال کے چشمے کی صفائی، روانی، وسعت اور زور تک پہنچ کر رک جائیں گے اور میں نے اس سے آگے بڑھ کر اس کے منبع کو دیکھا ہے کہ آپ کے لیے اقبال ایک روشنی ہے ۔ اور اس روشنی کے اس خزانے کی اہمیت جتانا چاہتا ہوں۔ جس سے اقبال نے اپنا چراغ جلایا ہے۔ آپ کے خیال میں اقبال ایک ہیرا ہے جسے ہماری خوش قسمتی سے زمین نے اُگلا۔ میری نظر میں اقبال ایک غیرت مند فقیر تھا جس نے اعلیٰ دربار سے اپنی جھولی بھری اور اسے لٹا کر غنی ہو گیا۔ اس لیے آپ اقبال سے محبت کرتے ہیں مگر معاف کیجیے یہ وہ محبت ہے جو ایک جاہل ماں اپنی لاڈلی اولاد سے کرتی ہے۔ اور میں اس کی عزت کرتا ہوں۔(9)

غرض طلبا کو اقبال کا قدر شناس بنانے کے لیے آسی ضیائی نے آغاز تا انجام ''موازنہ'' سے کام لیا ہے۔ اور آخر میں طلبا کو تلقین کی ہے کہ وہ ''اقبال شناس'' بننے سے پہلے ''قرآن شناس'' بنیں۔ آسی ضیائی کا مقالہ اقبال ''خورشید'' مارچ ۱۹۵۳ء میں ''مرے کالج میگزین'' کے حصہ اردو میں شائع ہوا۔ بعد ازاں اس مقالہ کا خلاصہ آسی ضیائی نے اپنی تصنیف ''کلامِ اقبال کا بے

لاگ تجزیہ'' میں بعنوان ''خورشید'' رقم کیا۔اس میں آسی ضیائی نے اقبال کی رومانی محبت کی کہانی ''کلامِ اقبال'' کی زبانی پیش کی ہے۔یعنی ''بانگ درا'' کے حصہ دوم کی نظموں کے حوالے سے اقبال کی جنسی محبت پر بحث کی ہے۔ان کے خیال میں ''حسن وعشق''، ''.....کی گود میں بلی دیکھ کر''، ''کلی''، ''وصال''، ''سلیمیٰ''، ''نوائے وقت''، ''عشرتِ امروز'' اور ''عاشقِ ہرجائی'' جیسی نظموں میں اقبال کی محبت کا حال کچھ کچھ ملتا ہے۔مگر یہ بات قابلِ غور ضرور ہے کہ ان نظموں میں اقبال کے ''محبوب'' کا نام بھی کسی نہ کسی طرح آیا ہے۔اور وہ نام ہے ''خورشید'' اور ''نظم کلی'' میں تو یہ نام تین مرتبہ آیا ہے مثلاً:

اپنے خورشید کا نظارہ کروں دور سے میں
صنعتِ غنچہ ہم آغوش رہوں نور سے میں

''بانگِ درا'' کے حصہ دوم کی چوبیس نظموں میں سے اٹھارہ ایسی نظموں کی نشاندہی آسی ضیائی نے کی ہے۔جن میں کسی نہ کسی طرح کامیاب محبت کا اظہار ہوتا ہے۔مگر ان کے بعد عاشقِ ہرجائی سے لے کر ''فراق'' تک وہ نظمیں ہیں جو محبت کا انجام ناکافی ظاہر کرتی ہیں:

یونہی میں دل کو پیامِ شکیب دیتا ہوں
شب فراق کو گویا فریب دیتا ہوں

آسی ضیائی نے انھی نظموں کے بارے میں لکھا ہے:

> ان نظموں کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کو کسی ایک حسین سے محبت نہ کرنا چاہیے بلکہ ایک کے بعد ایک حسین بدلتے رہنا چاہیے اور آخرت کی ''حوروں'' اور ''شرابوں'' کے لالچ میں دنیا کی رنگینیوں سے جوانی میں باز نہ رہنا چاہیے۔(10)

آسی ضیائی کا مقالہ ''اقبال اور موجودہ ادبی بے راہ روی''، ''مرے کالج میگزین'' کے حصہ اُردو میں مارچ ۱۹۶۳ء کی اشاعت میں چھپا۔آغاز میں انھوں نے پریشان فکری اور ابہام کو نظم ونظر کے انحطاط کا باعث قرار دیا ہے۔اور ان کے خیال میں اُن مصائب کے رواج دینے میں ترقی پسند تحریک کا بڑا ہاتھ ہے۔انھوں نے ادبی بے راہ روی کی ایک وجہ یہ بھی بیان کی ہے۔کہ ترقی پسند تحریک کے زیر اثر ،کلام اقبال کو اس نظامِ فکر سے الگ کر کے پڑھا جاتا ہے۔جس کے باعث قاری تضاد اور غلط فہمی کا شکار ہو جاتا ہے۔پھر کلامِ اقبال میں قرآن وحدیث کی تاویلات کو موضوعِ بحث بنانے کے بعد آسی ضیائی نے تنقید کا رخ اقبال کے فن کی طرف موڑ دیا

ہے۔مختلف اشعار کو سامنے رکھ کر فنی معائب کی نشاندہی کی گئی ہے۔ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

بعض دوسرے اسالیب بھی اقبال کے ہاں ایسے بن گئے جن کی فنی
نقطہ نظر سے کوئی تاویل نہیں ہوسکتی اور یہی میرے خیال میں آج کے ادب میں
ابہام انتشار اور لا مقصدیت پھیلانے کے خاص ذمہ دار ہیں۔(11)

آسی ضیائی رامپوری کا مقالہ ''حالی اور اقبال'' مرے کالج سیالکوٹ کے ادبی مجلہ ''مجلہ افکار'' حصہ اردو میں ۱۹۶۳ء کو شائع ہوا۔آسی ضیائی نے بحث کا آغاز اقبالؔ کے اس شعر سے کیا ہے:

میں کشورِ شعر کا نبی ہوں گویا
جاری ہے مرے لب پہ کلامِ حالیؔ

یہاں عام ناقدین کے برخلاف آسی ضیائی نے اقبال کا رشتہ رومی، غزالی، الجیلی، ابن عربی، نطشے اور برگساں سے ملانے کے بجائے اقبال کے اپنے ہی ہم وطن حالی سے جوڑا ہے۔اور کلامِ حالی اور کلامِ اقبال کے موازنہ کے بعد یہ بھی ثابت کیا ہے کہ ان کے ہاں وطن پرستی، مذہب پرستی اور قومی اصلاح کے جذبات مشترک ہیں۔اس سلسلے میں ہر دو شعرا کے کلام میں علائم و رموز کی مماثلت پر بحث کرتے ہوئے آسی ضیائی نے اقبال کے ''مردِ مومن'' اور حالی کے ''مردِ آزاد'' کا ذکر بحوالہ کلام ہے:

بھروسا کر نہیں سکتا غلاموں کی بصیرت پر
کہ دنیا میں فقط مردانِ حر کی آنکھ ہے بینا (اقبال)
قرض لے کر حج کو جانے کی ضرورت
آزادی کی قدر اور برکت اتفاق (حالی)

آسی ضیائی نے بلحاظِ فکر حالی کو اقبال کا پیش رو قرار دینے کے باوجود آسی نے حالی کو فنی اعتبار سے اقبال کا پیش رو قرار نہیں دیا۔وجہ یہ بیان کی ہے کہ ایک اقبال ہی پر کیا موقوف، اس اعتبار سے تو حالیؔ، تمام جدید شعرا کے پیش رو اور رہ نما ہیں مقالہ کے آخر میں خلاصۂ کلام کے طور پر حالی و اقبال کی اقدار مشترک کا موازنہ کرنے کے بعد آسی ضیائی لکھتے ہیں:

اقبال خود حالی ہی کا ایک ترقی یافتہ Magnified وجود تھے۔(12)

اقبال کے بارے میں سوانحی، تحقیقی، تنقیدی اور تشریحی کتب و مقالات لکھنے والے نقاد بے شمار ہیں۔اور ان اقبال شناس ناقدین کی طویل فہرست میں ایک نام آسی ضیائی کا بھی ہے

جنھوں نے ''کلامِ اقبال کا بے لاگ تجزیہ'' کے عنوان سے ایک کتاب اور اقبالؔ کی فکر وفن سے متعلق چند مقالات رقم کیے ہیں۔ آسی ضیائی کی اقبال شناسی پر ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی نے رائے کچھ ان الفاظ میں پیش کی ہے:

> آسی ضیائی کا تنقیدی اسلوب پختہ اور ایک گوشہ انفرادیت کا حامل ہے۔ ان کی بیشتر تنقیدی تحریروں میں عام طرزِ فکر سے ہٹ کر، ایک منفرد سوچ کار فرما ہوتی ہے۔ مثلاً مرثیے کے بارے میں ان کا نقطہ نظر، جس میں سے خود کو بڑی حد تک متفق پاتا ہوں۔ البتہ اقبال پر انھوں نے جو کچھ لکھا۔ اس سے پوری طرح اتفاق مشکل ہے۔(13)

حوالہ جات

۱۔ آسی ضیائی رامپوری، ''کلام اقبال کا بے لاگ تجزیہ'' گلزارِ عالم پریس لاہور 1957ء، ص:۸
۲۔ ایضاً، ص:۹
۳۔ ایضاً، ص:۲۷
۴۔ ایضاً، ص:۴۰
۵۔ ایضاً، ص:۸۹
۶۔ ایضاً، ص:۱۲۱
۷۔ ایضاً، ص:۱۳۷
۸۔ ایضاً، ص:۱۸۸
۹۔ ''مرے کالج میگزین''، جون، ۱۹۴۹ء، ص:۲۱
۱۰۔ "مرے کالج میگزین''، مارچ، ۱۹۵۳، ص:۴۷
۱۱۔ ''مرے کالج میگزین''، مارچ ۱۹۶۳ء، ص:۶۷
۱۲۔ ''مجلہ افکار'' مرے کالج سیالکوٹ، ۱۹۶۷ء، ص:۶
۱۳۔ انٹرویو، ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، ۲۰ اپریل 2021

اقبال شناسی کے تناظر میں فیض اور جابر علی سید کا اختصاصی مطالعہ

اردو ادب میں اقبال شناسی ایک بلند مقام و مرتبہ رکھتی ہے۔ سیالکوٹ کے مشاہیر کی بڑی تعداد نے اقبال شناسی پر نمایاں کام کیا ہے۔ میجر اقبال ڈار، نعیم اللہ ملک، ڈاکٹر نظیر صوفی، امان اللہ خاں، آسی ضیائی رامپوری، خالد نظیر صوفی، ڈاکٹر الحمید عرفانی، مولوی الف دین نفیس، یوسف سلیم چشتی، مولانا ظفر علی خاں، چودھری محمد حسین، فیض احمد فیض جابر علی سید اور سیالکوٹ سے تعلق رکھنے والے دیگر مشاہیر نے فکر اقبال پر قابلِ قدر کام کیا ہے۔ البتہ پیش نظر آرٹیکل میں دو معروف مشاہیر فیض اور جابر علی سید کا تنقیدی و جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

فیض احمد فیض ایک شاعر، نثر نگار کے ساتھ ساتھ اقبال شناس بھی ہیں۔ فیض احمد بین الاقوامی شہرت یافتہ شاعر ہیں۔ فیض عظیم مفکر اقبال کے فکر و فلسفہ سے خاص نسبت رکھتے تھے۔ ان دونوں کے کئی اساتذہ اور تعلیمی درسگاہیں بھی مشترک تھیں۔ فیض اور اقبال دونوں کا جائے پیدائش سیالکوٹ ہے علاوہ ازیں دونوں کے والد بھی آپس میں گہرے دوست تھے۔ فیض کی طرح جابر علی سید ایک شاعر، نقاد، ماہر لسانیات و عروض کے ساتھ ساتھ اقبال شناس بھی ہیں۔ جابر نے کئی ادبی مشاہیر کو اپنی تنقید کا موضوع بنایا ہے۔ انھوں نے علامہ اقبال کے کلام اور فن و فکر کو اپنی خصوصی توجہ کا محور بنایا ہے۔ تحقیق و تنقید کے سلسلے میں اقبال جابر کا پسندیدہ موضوع تھا۔ انھوں نے فکرِ اقبال پر بھرپور انداز اور دل و جان سے سپرد قلم کیا۔ اس سلسلے میں انھوں نے اقبال پر باقاعدہ کتب بھی تصنیف کی ہیں۔

فیض احمد فیض ایک شاعر اور نثر نگار کے ساتھ ساتھ اقبال شناس بھی ہیں۔ علامہ اقبال پر لکھے ہوئے مضامین پر مشتمل فیض کی کتاب ''اقبال'' ۱۹۸۷ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب کا ناشر مکتبہ عالیہ لاہور ہے اور اسے شیما مجید نے مرتب کیا ہے۔ یہ کتاب ۱۱۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس

کی ترتیب وتدوین کے سلسلے میں شیما مجید کہتی ہیں:

> یہ کتاب فیض احمد فیض کے ۸ مضامین اور تحریروں پر مشتمل ہے۔اس کتاب کی ترتیب وتدوین کا محرک جذبہ،فیض صاحب کے اقبال کے بارے میں خیالات کو یکجا دیکھنے کی خواہش کے علاوہ اقبال شناسوں کو اس ضرورت کی طرف متوجہ کرنا بھی ہے۔جس کا فیض صاحب نے ان مضامین میں احساس دلایا ہے۔1

اس کتاب میں فیضؔ کی اقبالؔ پر لکھی ہوئی دو نظمیں بھی شامل ہیں۔ان میں سے ایک نظم ''اقبال'' کے اس مصرع سے شروع ہوتی ہے: زمانہ تھا کہ ہر فرد انتظار موت کرتا تھا۔(2) یہ ابھی تک فیض کے کسی مجموعے میں شامل نہیں۔یہ نظم ۱۹۳۳ء میں لکھی گئی تھی اور ان کی نومشقی کے دور کی تخلیق ہے۔دوسری نظم ''اقبال'' جس کا اولین مصرع ہے:

آیا ہمارے دیس میں ایک خوش نوا فقیر3

یہ نظم ان کے شعری مجموعہ ''نقش فریادی'' میں بھی شامل ہے۔اس کے علاوہ وہ فیض کے دو مضامین انگریزی میں تھے۔جنھیں نہ صرف کتاب ''اقبال'' میں ہو بہو شائع کیا گیا ہے بلکہ ان کا اُردو ترجمہ بھی شامل کیا گیا ہے۔ایک مضمون ''اقبال کا فنی پہلو'' ہے اور دوسرا ''محمد اقبال'' پہلے مضمون کا اُردو ترجمہ شاہد علی نے کیا ہے۔اور دوسرے مضمون کا ترجمہ سجاد باقر رضوی نے کیا ہے۔''جذباتِ اقبال کی بنیادی کیفیت'' اور ''اقبال اپنی نظر میں'' دونوں مضامین ''میزان'' میں سے لیے گئے ہیں۔فقیر وحیدالدین کی ''روزگار فقیر'' کا مقدمہ بھیہاں شامل کیا گیا ہے، جو اقبال پر ایک مختصر مضمون کا درجہ رکھتا ہے۔اس کے علاوہ جستہ جستہ کے عنوان سے فیض کی تحریروں کے کچھ اقتباسات ان کی مختلف کتابوں سے اور چند خیالات ان کے انٹرویوز سے اخذ کر کے یہاں درج کیے گئے ہیں۔اس طرح اس کتاب میں اقبال کے بارے میں فیض کے تمام خیالات کو یکجا کر دیا گیا ہے۔فیضؔ کو اقبال سے خاص نسبت تھی۔مرزا ظفر الحسن ''عمر گذشتہ کی کتاب'' میں فیض اور اقبال کی چند مماثلتوں کا ذکر یوں کرتے ہیں:

> دونوں کا وطن اور جائے پیدائش سیالکوٹ اور فیض کے والد اور علامہ کی دیرینہ دوستی۔دونوں کے ابتدائی اساتذہ مشترک تھے۔دونوں نے گورنمنٹ کالج میں تعلیم پائی دونوں نے لاہور کو وطن بنایا۔دونوں شاعر بین الاقوامی شہرت کے حامل ہیں۔4

فیضؔ اقبالؔ کی انقلابی قدر سے بڑے مسحور تھے۔شاید یہی وجہ ہے کہ

فیض آخر تک اقبال کی عظمتِ فکر کے قائل رہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ کلامِ اقبال میں دلچسپی کے علاوہ اقبال پر نقد و نظر کے باب میں جو کچھ شائع ہوتا رہا وہ بھی ان کی نظروں سے اوجھل نہیں رہا لیکن اقبالیات کا ایک پہلو انھیں ہمیشہ تشنہ اور فام محسوس ہو ا۔ وہ اقبال کی ذات کے ایک مکمل اور بھرپور مطالعہ کے متمنی تھے۔ 5

فیض احمد فیضؔ اقبال پر اپنے مضمون ''اقبال۔۔۔فن اور حصارِ فکر'' میں لکھتے ہیں:

علامہ اقبال پر بہت سی کتابیں لکھی گئیں، جن میں اقبال کے فلسفے، پیام، فکر، ذات اور سوانح کے متعلق ہیں۔ 6

فیض صاحب اس مضمون میں یہ بھی لکھتے ہیں:

کوئی کتاب ان کے شعر کے محاسن اور خصوصیات کے متعلق نہیں ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ اقبال اپنے آپ کو شاعر کہلانا پسند نہیں کرتے تھے۔ 7

فیض مزید لکھتے ہیں:

اس وجہ سے لوگ ان کے پیغام کی طرف توجہ دینے کی بجائے شعر پر سر دھنتے رہیں گے۔ اقبال کے بہت سے مداح بھی انھیں حکیم، مفکر یا فلسفی ہی کی حیثیت سے دیکھنا چاہتے تھے۔ 8

اس مضمون میں فیض اقبال کے ابتدائی کلام کے بارے میں بیان کرتے ہیں:

ان کے کلام کا پہلا دور مناظرِ قدرت کے مشاہدے اور اس مشاہدے کے پیدا کردہ تحیر کا دور ہے۔ وہ اس دور میں چاند ستارے، پہاڑ، سمندر، جگنو، پرندے وغیرہ کو اپنا موضوع بناتے ہیں۔ ربط و رشتے اور ابتدا پر انتہا پر غور کرتے ہیں۔ اس دور میں ان کے ہاں اُداسی اور تنہائی کی کیفیت ملتی ہے۔ پھر یورپ جانے کے بعد کے دور کا ذکر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس دور میں ان کے ہاں ذاتی اور دلی واردات کا ذکر ملتا ہے۔ 9

فیض اس مضمون میں اقبال کے اسلوب کے حوالے سے کہتے ہیں:

اسلوب کے اعتبار سے ان کے کلام کا یہ دور غالبؔ کے ابتدائی دور سے مشابہ ہے۔ جس میں پُرشکوہ انداز، غیر مانوس فارسی تراکیب اور بلند بانگ لہجہ غالب ہے۔ 10

اس کے بعد فیض لکھتے ہیں کہ اقبال کے ہاں وطن پرستی کا جذبہ ملتا ہے۔ اس ضمن میں وہ اقبال کی کئی نظموں کا حوالہ دیتے ہیں۔ مثلاً سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا اور ''نیا شوالہ'' وغیرہ۔ دوسرے دور کا ذکر کرتے ہوئے فیض لکھتے ہیں:

اقبال کے ہاں فطرت، مناظر قدرت، اپنی ذات اور وطن کے محدود
اظہار کی بجائے عالمی حالات کے زیر اثر ملت پرستی کا موضوع ان کی توجہ کا مرکز بن
جاتا ہے۔11

اس دور میں انھوں نے بہت سی طویل نظمیں لکھیں۔ مسدس کی صنف کو منتخب کیا۔ اپنا پیرایہ اظہار بدلا، تشبیہات اور استعارات کی بجائے صاف اور سادہ گفتگو کا انداز اختیار کیا۔ اس دور کی ابتدا ''مثنوی اسرار و رموز'' سے ہوتی ہے۔ اور ''پیامِ مشرق'' سے آگے ''بالِ جبریل'' اور ''ارمغانِ حجاز'' پر جا کر اس کا اختتام ہوتا ہے۔ اب ان کا یہ ذہنی اور جذباتی سفر اپنے انجام تک پہنچتا ہے جس میں انسان اور کائنات کے بارے میں غور و فکر ملتا ہے۔ یہاں اختصار ہے، فصاحت ہے، تحیّر کی جگہ ایمان اور محبت کی بجائے عشق ہے۔ وہ غنائیہ شاعری کا بدل پیدا کرنے کے لیے شاعری کی روایات میں کچھ نئے اضافے کرتے ہیں۔ وہ بہت سے پرانے الفاظ تبدیل کرتے ہیں۔ فیض لکھتے ہیں:

جیسے جیسے اقبال کی فکر و خیال کا دائرہ وسیع ہوتا گیا ویسے ویسے ان کے
موضوعات مرتکز ہوتے گئے۔ اقبال نے غزل کو وسعت دی۔12

''ہماری قومی زندگی اور ذہن پر اقبال کے اثرات'' مضمون میں فیض نے بتایا کہ ہماری ذہنی زندگی میں جس قسم کا تلاطم اقبال کے افکار کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ ان سے پہلے یا ان کے بعد کسی ادیب، کسی مفکر، کسی مصنف نے ہمارے اذہان میں پیدا نہیں کیا۔ اس کے بعد انھوں نے سر سید تحریک کے متعلق بتایا کہ اگرچہ سر سید تحریک نے بھی لوگوں کے ذہنوں کو بیدار کیا لیکن اقبال کے افکار کا تعلق نہ صرف ہندوستان کے مسلمانوں سے تھا بلکہ تمام مسلمانوں، دنیا بھر کے عام انسانوں، جملہ موجودات اور غیر موجودات سے تھا۔ اقبال نے ہمارے قومی کاروبار میں خواہ وہ سیاست ہو، خواہ مذہب، خواہ اخلاقیات، خواہ قومی زندگی کا کوئی شعبہ ہو اس میں تفکر اور تدبر کا عنصر شامل کیا۔ اقبال نے لوگوں کو سوچنے، غور کرنے، مشاہدہ کرنے، مطالعہ کرنے اور تجزیہ کرنے کا طریقہ بتایا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ ہر خاص و عام سیاسی مفکر، معلم اور خطیب کے ہاں اقبال کا سا سوچنے کا اثر پیدا ہو گیا۔ اقبال کا ایک اور اثر لوگوں کے ذہنوں پر یہ ہوا کہ لوگوں کے ذہنوں نے غلامی سے نجات پائی۔ انھوں نے انسانیت اور کائنات کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ فیض کا کہنا ہے کہ سر سید تحریک نے ان تمام باتوں کو آفاقی طریقہ سے نہیں سوچا۔ آفاقی طریقہ سے سوچنے کی

ترغیب اقبال نے ہمارے ذہنوں میں پیدا کی۔ انھوں نے ہمارے ذہنوں میں شعر و ادب کے ایک نئے مقام کا تعین کیا کیونکہ اس سے پہلے شعر کو ایک تفریحی چیز سمجھا جاتا تھا۔

مولانا الطاف حسین حالی کے بعد شعر میں فکر و حکمت محض اقبال کی وجہ سے پیدا ہوئی۔ اقبال نے ہی بتایا کہ شعر بہت ہی سنجیدہ چیز ہے۔ یہ محض دل لگی کا سامان نہیں۔ اپنے ایک مضمون ''کلامِ اقبال کا فنی پہلو'' میں جوان کی انگریزی تقریر کا ترجمہ ہے۔ فیض نے اقبال کے کلام کے فنی پہلو پر گفتگو کی ہے۔ فیض کہتے ہیں کہ اقبال کی شاعرانہ تکنیک پر کم کام کیا گیا ہے۔ اس کی وجہ خود شاعر ہے۔ اقبال خود اپنی شاعری سے زیادہ اپنے پیغام کو سمجھنے کی تلقین کرتے ہیں۔

فیض کا کہنا ہے کہ ہمارے سنجیدہ مزاج حضرات شاعر کو بدنام سی شخصیت سمجھتے ہیں۔ شاید اقبال نہیں چاہتے تھے کہ انھیں بھی ایسے سڑے بسے نغمہ نگاروں میں شامل کر لیا جائے۔ فیض کہتے ہیں کہ اگرچہ اقبال، فلسفی، مفکر، قومی راہبر اور مبلغ سبھی کچھ تھے۔ لیکن جس چیز نے ان کے پیغام کو قوت بخشی اور دلوں میں گھر کر جانے کی صلاحیت بخشی، وہ ان کی شاعری ہی تھی۔ شاعر اقبال کے ابتدائی کلام کے سٹائل اور طرزِ اظہار اور بعد کے کلام کے سٹائل اور طرزِ اظہار میں شدید فرق ہے۔ اس کے ہاں اس فرق کا باوصف ایک تسلسل ہے۔ فیض کہتے ہیں کہ ان کے بچپن کی شاعری کے علاوہ نوجوانی کی شاعری میں بھی سنجیدگی اور متانت کا احساس نمایاں اور احساس پوری شاعری میں نظر آتا ہے۔ اس تسلسل کا دوسرا پہلو تلاش و جستجو کا عنصر ہے۔ ان کے کلام میں اسرارِ کائنات او راسرارِ زندگی کو سمجھنے کو مستقل خواہش ہے۔

فیض کہتے ہیں کہ ان کے ابتدائی کلام کا انداز مرصع، مسجع اور فارسی آمیز ہے۔ اس میں بیدلؔ، نظیریؔ، غالبؔ اور فارسی شعرا کا اثر ہے۔ اقبال کے کلام کے ابتدائی دور کی مثال فیض اس شعر سے دیتے ہیں:

کسی قدر لذت کشورِ عقدہ مشکل میں ہے
لطفِ صد حاصل، ہمارے سعی بے حاصل میں ہے

فیض کہتے ہیں کہ ان کی شاعری کے ابتدائی دور میں ان کا انداز مرصع ہے۔ مگر آہستہ آہستہ یہ شاعری سادگی کی طرف جاتی ہے۔ ابہام سے قطعیت کی جانب، خطاب سے معنویت کی جانب، بعد میں کلام میں مرصع کاری نہیں۔ کوئی امیجری نہیں، اختصار ہے۔ ابتدائی کلام میں جوانی میں اقبال کے کلام میں اپنی ذات پر توجہ ملتی ہے۔ اپنا عشق، غمِ تنہائی اور مایوسیوں کے بارے میں

لکھا گیا ہے۔ پھر وہ اپنی ذات سے آگے مسلمان قوم، بنی نوع انسان اور کائنات کی بات کرتے ہیں۔ ابتدائی دور میں کہیں سادگی ہے کہیں مرصع انداز ہے۔ اس دور میں تنوع کے بعد میں اقبال کا فکر ایک بندھی بدھائی وحدت اختیار کر لیتا ہے۔ اس دور کے کلام میں یکسانیت ہے نشیب و فراز نہیں۔ یہ اقبال کے فن کے ارتقا کی دوسری منزل ہے۔ تیسرا دور عمل ہے۔ جسے تحلیل کہہ سکتے ہیں۔ پہلے دور میں بہت سی نظمیں مناظر فطرت پر ہیں مگر ان میں ربط نہیں مگر بعد میں اس فکر نے ترقی کی۔ ہر چیز میں ربط پیدا ہو گیا۔ اقبال کے چوتھے دور میں جذباتی فضا میں تبدیلی نظر آتی ہے۔ بہت سے الفاظ تبدیل ہو گئے ہیں مثلاً محبت بعد کے دور میں پہنچ کر عشق میں تبدیل ہو گیا۔ غالباً اقبال پہلا شاعر ہے جس کے ہاں مجنوں، فرہاد وغیرہ ناموں کو چھوڑ کر کوفہ حجاز، عراق، فرات وغیرہ کا ذکر ملتا ہے۔ ان کے ہاں جدید الفاظ ہیں مگر ایسے الفاظ نہیں جو نامانوس ہوں۔ اقبال نے اپنے کلام میں ایسی بحروں کا استعمال کیا جو اس سے پہلے اُردو شاعری میں استعمال نہیں ہوتی تھیں۔

فیض کے مطابق اقبال عمل، ارتقا، جدوجہد اور فطرت کا شاعر ہے۔ اقبال کا موضوع انسان ہے۔ وہ انسان کی عظمت کے گن گاتا ہے۔ انسان ہی وہ مخلوق ہے جس نے تخلیق کا چیلنج قبول کیا۔ وہ ستاروں اور چاند کو مسخر کرنے والا ہے۔ یہ وہ عظیم موضوع ہے جو اقبال کے آخری ایام کے کلام کو حسنِ شعر سے ارفع مقام پر پہنچا دیتا ہے۔

''فکرِ اقبال کی ارتقائی منزلیں'' مضمون میں فیض نے اقبال کی فکر کے ارتقا کو تفصیل سے بیان کیا ہے اور بتایا ہے کہ کس طرح پہلے دور میں ان کی فکر اور تھی اور دوسرے دور میں مزید پختہ ہوتی ہے۔ ان کی فکر کا اظہار مختلف ادوار اور مختلف صورتوں میں ہوتا رہا ہے۔ پہلے قومیت، وطنیت، پھر اسلام ازم کا دور آیا۔ ہر دور میں ان کی شعری علامتیں، شعری لب ولہجہ بدلتے رہے ہیں۔ ان کے ہر دور کے کلام میں تدبر اور تفکر ہے اور دوسرے تجسس اور تلاش کا عنصر ایسا ہے جو کہ ہر دور پر غالب رہا ہے۔ شروع میں مناظرِ فطرت پر نظمیں ہیں۔ حب وطن کا عنصر ہے ابتدا میں ان کے ہاں محبت کا لفظ ہے۔ بعد میں یہ عشق کا درجہ اختیار کرتا ہے۔ پہلے دور میں جذبات ہیں داغ کی زبان ہے۔ اس کے بعد غالب کی زبان کا اثر ہے۔ انگلستان کے دور کی نظموں میں اُداسی اور تنہائی کا ذکر ہے۔ دوسرے دور میں فارسی زبان کا اثر غالب نظر آتا ہے۔ اس کے بعد واعظانہ، خطیبانہ انداز کا دور آتا ہے۔ سیاسی، لسانی، معاشرتی معاملات و مسائل کی جانب داری پر وہ زیادہ توجہ کرتے ہیں۔ اس کے بعد غلامی اور آزادی کا ذکر ہے ہیئتی اعتبار سے ان کی

زیادہ توجہ مسدس کی جانب ہوجاتی ہے۔مثلاً شکوہ،''شمعِ شاعر''اور''خضرراہ''نظموں میں مسدس ہیئت استعمال کی ہے۔آخری دور میں زبان اور لہجہ بدل جاتا ہے۔فکر کا دائرہ وسیع ہوجاتا ہے۔اس دور میں ان کے ہاں ظاہری تکلف نہیں رہا بلکہ پختگی آ گئی ہے۔جدت الفاظ سے وہ نئی نئی بحریں اور ترکیبیں اپناتے نظر آتے ہیں۔''محمد اقبال'' کے عنوان سے جو مضمون کتاب میں شامل کیا گیا ہے وہ دراصل انگریزی میں تھا اور اس کا ترجمہ سجاد باقر رضوی نے کیا ہے۔اس مضمون میں بھی اقبال کے فکری ارتقا پر بحث کی گئی ہے۔اوران کی شاعری کے مختلف ادوار کا ذکر کیا گیا ہے۔

''جستہ جستہ'' کے عنوان سے شیما مجید نے فیض کی کتابوں سے چن کر جو اقتباسات دیئے ہیں ان میں بھی اقبال کی فکر اوران کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔مثلاً فیض ایک جگہ کہتے ہیں اقبال ایک مفکر بھی تھے اور شاعر بھی۔(13)انھوں نے اپنے نظریات کو شعر کی پوشاک بھی عطا کی ہے۔شاعری میں انھوں نے جو جدتیں اور جو نئے نئے امکانات پیدا کیے ہیں ان کا بہت کم ذکر ہوا ہے۔ایک اور جگہ کہتے ہیں کہ انسان کو آزاد نظم لکھنے کی ضرورت اس وقت ہوتی ہے جب وہ پابند نظم میں کچھ نہ لکھ سکتا ہو۔ علامہ کو آزاد نظم لکھنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔(14)انھوں نے اردو شاعری سے زیادہ فارسی شاعری میں تجربے کیے ہیں جن کی طرف توجہ نہیں کی گئی۔اقبال نے بہت سے الفاظ کو نیا معنوی تناظر بھی عطا کیا ہے اور بہت سے الفاظ کو رائج بھی کیا ہے۔

جابر علی سید ایک شاعر،نقاد،ماہر لسانیات وعروض کے ساتھ ساتھ اقبال شناس بھی ہیں۔انھوں نے مختلف موضوعات اور بہت سی ادبی شخصیات کو اپنی تنقید کا موضوع اور توجہ کا محور بنایا ہے۔لیکن انھوں نے علامہ اقبال کے کلام اور فن وفکر پر خصوصی توجہ دی ہے۔عملی تنقید کے سلسلے میں اقبال جابر علی سید کا پسندیدہ موضوع تھا۔انھوں نے اقبال پر جس بھرپور انداز اور تفصیل سے لکھا،کسی دوسرے پر نہیں لکھا۔اس سلسلے میں انھوں نے اقبال پر باقاعدہ دو مستقل کتابیں تصنیف کی ہیں۔ ایک کتاب''اقبال کا فنی ارتقا'' ہے۔جو مطبع ظفر علی سنز لاہور سے جون ۱۹۸۵ء میں شائع ہوئی۔ دوسری کتاب''اقبال۔ایک مطالعہ''جو مطبع ظفر سنز لاہور سے جون ۱۹۸۵ء میں شائع ہوئی۔اقبال شناسی کے حوالے سے جابر علی سید کی تیسری کتاب''تنقید اور لبریزم'' بھی ہے۔جو کاروانِ ادب ملتان سے ۱۹۸۲ء میں طبع ہوئی۔ یہکتاب مکمل اقبال کے حوالے سے نہیں بلکہ اس کا کچھ حصہ اقبالیات پر مشتمل ہے۔اقبالیات کے حوالے سے چوتھی کتاب''اقبال اور الہلال'' ہے جو غیر مطبوعہ

ہے۔اس کے علاوہ علامہ اقبال پر ان کے کچھ غیر مطبوعہ مضامین بھی موجود ہیں۔

جابر علی سید نے بطور اقبال شناس اقبال کے فن پر بڑی جامع اور معیاری تنقید کی ہے۔ اور اس ضمن میں دوسرے نقادوں کی آرا اور ان کے تنقیدی محاکے کا تجزیہ کرتے ہوئے اپنے ذاتی انکشافات اور نئے خیالات پیش کیے ہیں۔''علامہ اقبال کے فنی ارتقا'' کے مضمون میں انھوں نے بعض ایسی ہستیوں اور کلام اقبال کی خوبیوں کی طرف توجہ دلائی ہے جو شاید ہی کسی دوسرے اقبال شناس نقاد نے ان کی طرف دھیان دیا ہو۔مثلاً اقبال کی نظم ''ہمالہ'' کے متعلق اقبال شناسوں کیبھی رائے ہے کہ اس نظم میں حب الوطنی اور قوم پرستی کے ان جذبات و احساسات کا نشان ملتا ہے۔ جس کی تشریح وتوضیح اقبال نے صدائے درد، تصویرِ درد، ہندی اور نیا شوالہ نظموں میں کی ہے۔جابر علی سید ہمالہ کے بارے میں کہتے ہیں:

> اقبال کی یہ نظم ہمالہ ان کے اس ثقافتی سفر کا نقطہ آغاز ہے جس کا نقطہ معراج ان کی نظم مسجد قرطبہ ہے۔15

اس نظم کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ:

> یہ نظم مجموعی طور پر تین نمایاں رجحانات رکھتی ہیں منظر نگاری، واقعیت اور سادگی پسندی۔16

یہ وہ رجحان ہے جن کی طرف بہت ہی کم نقادوں کی نگاہ اُٹھتی ہے۔جابر علی سید کا طریقہیہ ہے کہ وہ تنقید کرتے وقت جہاں موضوع و مواد اور معانی کے کھرے کھوٹے یا اعلیٰ و ادنی کی پرکھ کرتے ہیں۔وہاں وہ الفاظ ان کی ساخت و ترکیب ان کے فنی استعمال اور ان نظموں کو مضمون کے ساتھ جو داخلی ربط ہوتا ہے اس پر بھی پوری توجہ دیتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ الفاظ کہاں تک مضمون کے مطابق لائے گئے ہیں اور شاعر نے ان میں کیا جدت و خوبی پیشِ نظر رکھی ہے۔

اقبال کی نظم ''فرشتے آدم کو رخصت کرتے ہیں'' کو لے لیجیے اس پر انھوں نے بالکل نئے اور انوکھے انداز میں اظہار خیال کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ چھوٹی سی ڈرامائی نظم غزل کی ہیئت میں ہے اور پانچ اشعار پر مشتمل ہے۔ پانچ کے عدد سے اگلی نظم ''روح ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے'' لکھتے وقت مخمس کا احساس پیدا کیا ہے اور اس طرح اقبال نے یہ نظم مخمس کے انداز پر تخلیق کی وہ لکھتے ہیں:

> اقبال نے پہلے شعبے کو سوزِ آدم کی بنا پر تغزل کا رنگ دیا ہے اور پانچ شعر کی غزل لکھی ہے۔ پانچ کا تصور ابھی شاعر کے ذہن میں تھا اس نظم کا دوسرا حصہ معرضِ وجود میں آنے والا تھا کہ شاعر کو پانچ پانچ مصرعوں کے بندوں کا خیال آیا

اور مخمس کی بناڈال دی گئی اور اس مخمس کی بنیاد بھی پانچ ہی بندوں پر رکھی گئی ہے۔ 17

جابر علی سید تنقید کرتے وقت شعر کی خارجی اور داخلی وحدت پر خصوصی توجہ دیتے ہیں۔ جو شعر یا نظم پارہ اس معیار پر پورا اترتا ہے وہ ان کے نزدیک بہترین شعر اور نظم پارہ ہے۔ تنقید کے لیے چند بنیادی شرطوں یا خصوصیتوں کا ہونا ضروری ہے۔ ان کے بغیر ایک اچھا نقاد اپنے فرضِ منصبی کو پورا نہیں کر سکتا اور نہ ہی اس کی تنقید معیاری اور مستند ہو سکتی ہے۔ جابر علی سید کی تنقید کا انداز ملاحظہ ہو۔ اس قطعے کا عنوان ہے جان وتن۔ اس میں علامہ اقبال نے معنی ومضمون کو جناب ،الفاظ اور ہیئت کو تن سے تعبیر کیا ہے۔ اور ان معنوں میں جو وحدت موجود ہے ان میں جو باہمی رشتہ اور تعلق ہے اس کی توضیح جابر علی سید کے الفاظ میں اس طرح ہے:

> لفظ عبارت ہے بولے ہوئے معنی سے خیال کی خارجی صوتی صورت سے، یہ ہماری سائنسی منطقی مجبوری سے کہ ایک وحدت کو دو ٹکڑوں میں تقسیم کر دیتے ہیں جب کہ اصل حقیقت یہی ہے کہ دونوں عنصروں میں یگانگت ہے۔ ھاپرت نہیں ،وحدت ہے، دوئی نہیں یا دونوں ایک ہی حقیقت کے دو مختلف پہلو ہیں۔ ایک دوسرے میں مدغم اور علیحدگی کے تصور سے بھی گریزاں اور بیزار۔ 18

جابر علی سید نے اگرچہ اقبال پر ایسی کوئی کتاب تصنیف نہیں کی، انھوں نے اپنی اقبال شناسی کو متفرق مضامین اور چند گنے چنے عنوانوں تک محدود رکھا ہے۔ اس کے باوجود ان کے طریقہ تنقید میں بڑی جامعیت ہے۔ وہ ایک عنوان کے تحت جب کوئی بات کرتے ہیں وہ اگرچہ عنوان سے متعلق ہوتی ہے مگر وہ اشاریت سے کام لے کر بہت کچھ کہہ جاتے ہیں۔ قاری ان کے مضامین کا مطالعہ کرتے وقت فکر اقبال کی بہت سی باریکی ،نقطہ آفرینی سے واقف ہو جاتا ہے۔ اقبال نے لفظی پیکران ،تشبیہ اور استعاروں کے پیرائے میں جو جہانِ معنی سموئے ہیں وہ ایک واضح شکل میں آمنے سامنے آجاتے ہیں۔ اس طرح جابر علی سید کی تنقید میں تنوع اور ترفع پیدا ہوتا چلا جاتا ہے اور فکر اقبال کی معنوی گتھیاں سلجھتی چلی جاتی ہیں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ وہ اقبال کی فنی عظمت واہمیت کو بھی واضح کرتے چلے جاتے ہیں۔ اور قاری کا ذہن فکر کی گہرائی اور خیالات کی ندرت کے ساتھ ساتھ شعر اقبال کی فنی معجز نمائیوں اور حسن کی رنگا رنگی اور بوقلمونی سے بھی لذت اندوز ہوتا رہتا ہے۔ اور اس ذوقِ جمال کی تسکین وتشفی کا سامان فراہم ہو جاتا ہے۔

جابر علی سید نے بانگِ درا، بالِ جبریل ،ضربِ کلیم اور ان کی فارسی تصنیفات پر بڑی جامعیت سے تحقیق کر کے اقبال شناسی کے رجحان میں اضافہ کیا ہے۔ انھوں نے اقبال کے مخصوص

لہجوں، ان کی ہیئت پسندی، ان کے شعوری اور فنی ارتقاان کی تخلیقی تسلسل کو اگر چہ اجمالی طور پر بیان کیا ہے لیکن ان کے بیانمیں کچھ ایسی معنویت پوشیدہ ہے کہ اعجاز واختصار اور اشاریت کے باوجود ہم اقبال کے حکیمانہ افکار اور فکرِ اقبال کے مآخذ ومنابع تک رسائی حاصل کر لیتے ہیں۔ اور اقبال جن فلاسفہ اور مفکرین اور علما محدثین اور صوفیا اکرام سے متاثر ہوئے ان کا نشان بھی مل جاتا ہے۔ غرض جابر علی سید کی تنقید اور اقبال شناسی اردو کے تنقیدی ادب میں ایک قیمتی سرمایہ ہے اور اس کی اہمیت وافادیت سے کسی کو بھی انکار نہیں۔

جابر علی سید نے اقبال کے نکتہ چینوں اور معترضوں کے اعتراضوں اور خوردہ گیریوں پر گہری نظر ڈالی ہے۔ اور بتایا ہے کہ ان کی یہ نکتہ چینیاں محض معاصرانہ حسد ورقابت پر مبنی ہیں۔ سیماب اکبر آبادی، فانی بدایونی، جوش اور پطرس بخاری وغیرہ اقبال کے نمایاں نکتہ چینوں میں ہیں۔ جابر علی سید نے اس نکتہ چینی کی نفسیاتی توضیح اس طرح کی ہے:

> پطرس کی ادبی شخصیت زیاں کارانہ محسوس ہوتی ہے۔ پطرس کی محفل آرائی، افریت اور بذلہ سنجی سب ان کی ذہانت کا زیاں ہے۔ اس احساس زیاں کاری نے پطرس کو اقبال کی عظمت کا منکر بنا دیا ہے۔ ایک چھوٹی انا ایک عظیم انا سے برسرِ پیکار نظر آتی ہے۔ جس کا منطقی نتیجہ ظاہر ہے۔ 19

(۴۷) اقبال کے ساتھ اپنی اس غیر معمولی دلچسپی کا اعتراف وہ خود بھی کرتے ہیں وہ لکھتے ہیں:

> اقبال کے اسلوب کی بلند آہنگی تفکر اور گہرائی لیے ہوئے ہے۔ یہ صرف بے مغز اور شور انگیز آوازوں کا آرکسٹرا نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو اقبال کے چند اور ہمعصر شاعروں کو بھی وہی مقبولیت حاصل ہوتی جو انھیں حاصل ہے۔ 20

ہم جابر علی سید کی اقبال پر تنقید کا جائزہ لیتے ہوئے دیکھتے ہیں کہ جابر علی سید کیہ خصوصیت ہے کہ اوروں کی طرح انھوں نے اقبال کے کلام میں تکراری انداز اختیار نہیں کیا بلکہ ان کی تنقید ایک جدت، ایک تنوع لیے ہوئی ہے۔ جابر علی سید کی یہ خصوصیت ہے کہ انھوں نے جس موضوع پر بھی قلم اٹھایا وہ موضوع منفرد ہے۔ جابر علی سید نے اقبال کے کلام کے ان حصوں پر تنقید کی ہے جس پر کسی دوسرے کی آج تک نظر نہیں پڑی۔ اگر پڑی تو صرف اچٹتی ہوئی۔ لیکن ایک عالم جب کسی عالم کا مطالعہ کرتا ہے تو یہ معمولی بات نہیں ہوتی۔ جابر علی سید کے علم کا تقاضا تھا کہ وہ اس غیر معمولی پہلوؤں پر روشنی ڈالتے۔ فارسی، عربی، انگریزی اور اُردو کے تحقیقی مطالعے اور اقبال کے کلام پر بار بار نظر ثانی نے

ان کو اقبال پر تنقید کا حقدار بنا دیا۔ ۱۹۷۷ء کا سال دنیا بھر میں اقبال کے سال کے عنوان سے منایا گیا۔ جتنی کتابیں اس سال چھپیں ان کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ مگر یہ بات ہم ڈنکے کی چوٹ پر کہہ سکتے ہیں کہ لکھنے والوں نے اگرچہ خوب لکھا ہوگا مگر اقبال کے ان چھپے ہوئے فنی گوشوں کو سوائے جابر علی سید کے اور کوئی روشنی نہیں ڈال سکا تھا۔ ڈاکٹر انوار اس بارے میں کہتے ہیں:

ان کے علم کے متعلق کسی کو اختلاف نہیں۔ اس صدی میں ایسے عالم ،فارسی، اردو، انگریزی اور کسی حد تک عربی سے واقف شاید ہی ہوگا۔ 21

حوالہ جات

شیما مجید، پیش لفظ ''اقبال''، از فیض احمد فیض، لاہور، مکتبہ عالیہ، ۱۹۸۷ء، ص: ۱۲
فیض احمد فیض، ''اقبال'' (نظم) مشمولہ ''اقبال''، مرتبہ شیما مجید، ص: ۸۷
ایضاً، ص: ۸۹
مرزا ظفر الحسن، ''عمر گذشتہ کی کتاب''، کراچی، ادارہ یادگار غالب، ۱۹۸۷ء، ص: ۳۰۲
شیما مجید، ''پیش لفظ''، اقبال، از فیض احمد فیض، ص: ۱۳
فیض احمد فیض، اقبال، ص: ۱۹
ایضاً، ص: ۱۹
ایضاً، ص: ۲۰
ایضاً، ص: ۲۱
ایضاً، ص: ۲۲
ایضاً، ص: ۲۲
ایضاً، ص: ۲۲
فیض احمد فیض، ''جستہ جستہ'' (اقتباسات) مشمولہ ''اقبال''، مرتبہ شیما مجید، ص: ۷۵
ایضاً، ص: ۷۶
جابر علی سید، ''اقبال کا فنی ارتقا''، لاہور، مطبع ظفر سنز، ۱۹۸۵ء، ص: ۳۲
ایضاً، ص: ۳۳
ایضاً، ص: ۴۵
جابر علی سید، ''لفظ معنی کا رشتہ''، مشمولہ ''اقبال کا فنی ارتقائی''، ص: ۶
جابر علی سید ''اقبال اور پطرس بخاری''، مشمولہ اقبال کا فنی ارتقاء، ص: ۹۶
ایضاً، ص: ۹۸
ڈاکٹر انوار احمد، ''نوائے وقت''، ملتان، ۸ جنوری ۱۹۸۵ء، ص: ۷

امین حزیں سیالکوٹی-اقبالؒ کا ایک معنوی شاگرد

امینِ حزیں (۱۸۸۲ء-۱۹۶۸ء) سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔آپ کا اصل نام خواجہ محمد مسیح پال ہے۔سکاچ مشن سکول سیالکوٹ میں انہیں مولوی میر حسن جیسے استاد سے اکتسابِ فیض کا موقع ملا۔مولوی صاحب کی تربیت نے ان کے شعور کو اجاگر کیا۔ان کی ملازمت کا بیشتر حصہ گلگت میں انڈین پولیٹیکل سروس میں گزرا۔۱۹۳۹ء میں خان بہادر کا خطاب پا کر ملازمت سے سبکدوش ہوئے اور اپنے آبائی شہر سیالکوٹ میں سکونت اختیار کی۔(1) ۱۹۰۲ء میں ان کی پہلی غزل لکھنو کے ''پیامِ یار'' رسالے میں چھپی اور اس کے بعد شعروشاعری کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ابتداء میں مولانا ظفر علی خاں اور مولانا جوہر کے رنگ سے متاثر تھے بعدازاں حضرت علامہ اقبالؒ کو پسند کرنے لگے اور یہ رنگ ایسا بھایا کہ پھر کسی اور کا نقش نہ جم سکا۔امینِ حزیں کا کلام برصغیر پاک و ہند کے مختلف ادبی رسائل میں چھپتا رہا جن میں ''پیامِ یار''، ''مخزن''، ''ساقی'' اور ''ہمایوں'' قابلِ ذکر ہیں۔(2) امینِ حزیں کا پہلا شعری مجموعہ ''گلبانگِ حیات'' ۱۹۴۰ء میں شائع ہوا۔دوسرا شعری مجموعہ ''نوائے سروش''، الفیصل ناشران و تاجران ادارے نے شائع کیا۔

تیسرا مجموعۂ کلام ''سرودِ سرمدی'' بھی الفیصل ناشران و تاجران ادارے نے شائع کیا۔امینِ حزیں کی شاعری کے آٹھ مسودے ابھی تک شائع نہیں ہو سکے۔

یہ آٹھوں مسودے ان کے عزیز و اقارب کے پاس موجود ہیں۔امینِ حزیں کے ہزاروں کی تعداد میں مشاہیر کے نام خطوط بھی محفوظ ہیں۔اردو ادب کے محققین کے لیے یہ شعری و نثری فن پارے قیمتی سرمایہ ہیں۔

امینِ حزیں ایک مشاق اور قادرالکلام سخن ور تھے۔انہوں نے تقریباً ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔انہیں اردو، عربی، ہندی، سنسکرت، انگریزی، پشتو اور دیگر علاقائی زبانوں پر مکمل عبور حاصل تھا۔ان کے کلام کو گل و بلبل، لیلیٰ و مجنوں، وامق و عذرا اور شبِ ہجراں کے افسانہ ہائے دراز سے دور کا تعلق بھی نہیں۔خدائے بزرگ و برتر کی عظمت اور رسولِ ﷺ کی عقیدت کا ان کی زندگی اور شاعری پر گہرا اثر تھا۔نظم میں اقبالؒ اور غزل میں غالب کے پیروکار تھے۔امینِ حزیں کی

شاعری میں جوشِ بیان، وحدتِ فکر اور رفعتِ تخیل کا عمدہ تناسب وتوازن ملتا ہے۔ آپ نے زیادہ تر اخلاقی قومی اور ملی کے موضوعات کو اپنی شاعری میں پیش کیا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ حسن، خودی، عقل وعشق، تصورِ ابلیس، عورت اور فلسفہ ایمان کو بھی اپنی شاعری میں موضوع بنایا ہے۔

اقبال کی طرح امینِ حزیں کے فلسفہ حیات اور کائنات میں تصورِ خودی کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ آپ فقر وخودی کو انسانی معراج کے لئے ضروری سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک عرفانِ ذات کا حصول خودی کے طفیل ہی ہے۔ اگر خودی مغلوب ومقہور ہوگئی تو انسانی تشخص ختم ہوجاتا ہے۔ ان کی ایک مکالماتی نظم ''خودی خدائے خودی کے حضور میں'' کے آخری بند میں خودی کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:

خودی وہ جذبہ بے اختیار ذاتی ہے
ازل سے جس سے حفاظت ہے ذات کی مقصود
غرور کہتے ہیں جس کو خودی کا ہے ہمزاد
مگر وہ لغو سراپا یہ سر بسر محمود
اخوت اور سلامت روی خودی کا شعار
مثال مہر جہاں تاب اس کا ذوق نمود
خودی نے جس کو نوازا وہ با کمال ہوا
خودی سے قوموں کا اقبال لا زوال ہوا (3)

''گلبانگِ حیات'' میں ایک جگہ پر خودی کے حوالے سے بیان کرتے ہیں:

قدیم و قائم و قیوم و قادرِ مطلق
تری جناب میں حاضر ہے فخر و ناز ترا
وہی فرشتوں کی مسجود خود ہے سربہ سجود
جسے ملا تھا سرو پائے علم الاسما
نہیں ہے اہل ہی جب جبرئیل کیا جانے؟
مرے خیال کی کاوش دماغ کا سودا
خودی کی اصل اگر تیرا نور ہے یا رب
خودی بری ہو تو کس کا قصور ہے یا رب (4)

امینِ حزیں کا تصورِ عشق و عقل بھی اقبال سے ملتا جلتا ہے۔ ان کے نزدیک عقل زندگی کی راہ گزر پر انسان کے لیے روشنی فراہم کرتی ہے۔ آنکھوں کے لیے نور مہیا کر سکتی ہے لیکن دل کے اندر روشنی فراہم کرنا اس کے بس کی بات نہیں۔ زندگی کے ہر شعبہ میں بصیرت یا عشق ہر جگہ مشعل راہ ثابت ہوتا ہے۔ امین کے کلام میں عشقِ مجازی اور عشقِ حقیقی دونوں افکار کارفرما نظر آتے ہیں۔ عشق کے حوالے سے نظم ''آتش شوق'' سے کچھ اشعار پیش کئے جاتے ہیں:

آتشِ شوق فرشتوں کی تمنائے عزیز
شوق کی آگ نے ہی خاک کو بخشی ہے تمیز
آتشِ شوق سے ہے جوہرِ ہستی کی نمود
زندگی نام ہے جس کا ہے یہی چیز وہ چیز
آتش شوق ہی در اصل ہے گلزارِ خلیل
آتشِ شوق کو دیتا ہے ہوا جبرائیل
آتشِ شوق کے قائل کی جزا جلوۂ طور
آتشِ شوق کے منکر کی سزا موجۂ نیل (5)

حسن کی جھلک امینِ حزیں کے لیے باعثِ کشش ہے۔ چاہے وہ حسن عورت کا ہو یا مناظرِ فطرت کا۔ ان کی نگاہ حسن کے نظاروں کا جائزہ لیتی ہے اور ان سے لطف اندوز ہوتی ہے۔ اس حوالے سے ان کی نظم ''نگاہِ شوق'' کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

شکست کھا نہیں سکتی نگاہ شوق کبھی
ہزار پردوں میں مطلوب چھپ کے جا بیٹھے
اسی کا نام امیں ہے کمال جذبۂ شوق
کھنچا ہوا کوئی پہلو میں خود سے آ بیٹھے (6)

حسن کے حوالے سے ان کی نظم ''جمال ہم نشیں'' کے اشعار بھی قابلِ توجہ ہیں:

ہوں نئے کہ بت پرانے نہیں کچھ بگاڑ سکتے
مرے غزنوی کا جب تک ہے دل و جگر حجازی
یہ فروغ شمع محفل یہ اجالا مہر تاباں
بخدا امیں ہے فیض عمل نفس گدازی (7)

ہر بڑے شاعر کی طرح امینِ حزیں بھی فطرت کے شائق ہیں۔ ان کی نظر قدرت کے مختلف مناظر کو پسند کرتی اور ان کے حسن سے متاثر ہوتی ہے۔ حبیب کیفوی اس حوالے سے یوں رقمطراز ہیں:

> امین حزیں کی زندگی کی تینتیس بہاریں کشمیر اور گلگت کی گل بیز و گل ریز وادیوں میں بسر ہوئی تھیں۔ فطرت کے دلآویز مناظر ہر وقت ان کے سامنے رہے تھے اور وہ ان سے لطف اندوز بھی ہوتے رہے تھے۔ اس لئے یہ ممکن نہ تھا کہ رنگین نظاروں کی عکاسی نہ کرتے۔(8)

ان کی بہت سی نظموں میں حسین مناظر کی دلکش تصویر کشی موجود ہے۔ ''کوہستان قراقرم کی ایک وادی''، ''کشمیر کی صبح بہار'' اور ''حسن کی رت'' داد طلب نظمیں ہیں۔ ان نظموں کے علاوہ ''گلبانگ حیات'' اور ''سرود سرمدی'' میں شامل ان کی متعدد نظمیں فطرت سے ان کے لگاؤ اور دل بستگی کی غماز ہیں۔ امینِ حزیں فطرت کو انسان کے مدِ مقابل سمجھتے ہوئے اسے مسخر کرنے پر زور دیتے ہیں۔ وہ کائنات کے رازوں کو جاننے کے متمنی ہیں۔ تسخیر فطرت کے حوالے سے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

بیتابی نظر کو تلاش سکوں نہیں
اِک جذبہ عمل کا محرک جنوں نہیں
اِک جوہر لطیف ہے میری نگاہ میں
میں جس کی تاک میں ہوں وہ صید زبوں نہیں(9)

امینِ حزیں نے اپنی شاعری میں جن بنیادی مسئلوں پر غور و فکر کیا ہے ان میں زمان و مکاں کے حوالے سے مختلف تنقیدی نظریات ملتے ہیں۔ اس حوالے سے ان کی نظم ''دنیا بدلتی جائے گی'' کے اشعار ملاحظہ کئے جا سکتے ہیں:

آپ بدلیں یا نہ بدلیں یہ بدلتی جائے گی
دنیا بدلتی جائے گی
اپنے ہی بچوں کو یہ ناگن نگلتی جائے گی
زید و عمرو بکر کوئی ہو کسی کی بھی نہیں
دنیا امیں دنیا امیں

سب کی چھاتی پر یہ ظالم مونگ دلتی جائے گی
دنیا بدلتی جائے گی (10)

تصورِ زمان و مکاں کے حوالے سے ان کی نظم ''وقت اے وقت تجھ سے بھر پایا'' بھی ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

امینِ حزیں کی شاعری میں عموماً اور نظموں میں خصوصاً مردِ مومن اور انسان کا ذکر جا بجا ملتا ہے۔ کبھی وہ مقام مردِ مومن طے کرتے نظر آتے ہیں تو کبھی انسان کا شاندار مستقبل دکھاتے ہیں۔ ''مقام مردِ مومن'' امینِ حزیں کی ایک شاہکار نظم ہے جس میں وہ مختلف استعاروں مثلاً رند، مے، جام اور عنقا جیسی تراکیب استعمال کرتے ہوئے مردِ مومن کا مقام متعین کر رہے ہیں

مردِ مومن کا ہے مقام الگ
مہر وحدت کا ہے نظام الگ
اس ''خدا مست رند'' کی واللہ
مے الگ ہے خم الگ ہے جام الگ (11)

ایک جگہ پر نظم ''مومن'' میں مومن کے اوصاف بیان کرتے ہوئے یوں رقم طراز ہیں:

ایمان ہے مومن کا ایقان ہے مومن کا
حق کیشی و حق کوشی حق بینی و حق گوئی
اِک شانِ جمالی ہے اِک شان جلالی ہے
تدبیر خدا مومن تقدیرِ خدا مومن
پیتا ہے پلاتا ہے جیتا ہے جلاتا ہے
مومن میں نہیں رکھی پرویزی و چنگیزی
عالم کے لیے رحمت لا ریب وجود اس کا
اعجاز ہیں مومن کے اندازِ دل آویزی (12)

امینِ حزیں نے مردِ مومن کے ساتھ ساتھ اپنی شاعری میں انسانی عظمت کی بات بھی کی ہے اپنی نظم ''انسان'' میں انسانی عظمت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

فرشتے شوق سے لینے لگے ہیں نام ترا
اب ان کی آنکھ سے اوجھل نہیں مقام ترا

مجال کس کی ہے اتنی کہ تیرے منہ آئے
بلا سکوت' قیامت بکف کلام ترا
تری نمود کی فطرت بھی ہو گئی قائل
تو ہی امام ہے کوئی نہیں امام ترا (13)

امینِ حزیں انسانی زندگی میں یقین کی اہمیت کو کبھی نظر انداز نہیں کرتے بلکہ اگر کہا جائے کہ وہ ایقان کے مبلغ ہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ نظریۂ ایقان کی وہ اپنی شاعری میں جگہ جگہ تبلیغ کرتے نظر آتے ہیں۔ اپنی نظم ''یقین'' میں بھی وہ اسی نکتے کی وضاحت کرتے نظر آتے ہیں:

طلسم شاہد و شہود۔ فروغِ حسن کی نمود۔ سرِ نیاز کے سجود
یقین کا ظہور ہیں ظہور ہیں یقین کا
جمال کیا جمیل کیا۔ کلیم کیا خلیل کیا۔ بیان کیا دلیل کیا
یقین کا سرور ہیں سرور ہیں یقین کا
یقین مکان و لا مکاں یقین روحِ انساں و جاں یقین حیات جاوداں
یقین مئ طہور مئ طہور مئے طہور مئے طہور یقیں (14)

اقبال کی طرح امینِ حزیں کے نزدیک بھی بدیہیا شر انسانی فطرت کا ایک جزو لاینفک ہے۔ یہ ایک ایسی محرک قوت ہے جو انسان کو جہدِ حیات میں عمل پر اکساتی ہے۔ دنیا میں شر کی نمائندگی ابلیس کرتا ہے۔ ابلیس امینِ حزیں کی نظموں کا ایک متحرک کردار ہے۔ ''شکوہ شیطان'' امینِ حزیں کی ایک مکالماتی نظم ہے جس میں شیطان اللہ تعالی کے حضور عرض کرتا ہے:

جو اپنے ذمہ لیا تھا میں نے وہ کام انجام پا چکا ہے
ترا ''خلیفہ'' تجھے ہی پروردگار دل سے بھلا چکا ہے
مرا تو کیا ذکر خود تری ذات پاک ہی کا ہوا ہے منکر
جسے تو کہتا ہے اپنا بندہ وہ ہاتھ سے تیرے جا چکا ہے
یہ تیرے خاکی الہیٰ توبہ غضب کے بے باک ہو گئے ہیں
جو میرا فن تھا یہ اس میں مجھ سے بھی بڑھ کر چالاک ہو گئے ہیں (15)

اقبال کی طرح امینِ حزیں سیالکوٹی مغربی تہذیب کے مخالف تھے۔ وہ چاہتے تھے امتِ مسلمہ اسلامی تہذیب و تمدن کی پیروی کرے تا کہ دین و دنیا میں کامیاب و کامران ہو۔ امینِ

حزیں اپنی شاعری میں جگہ جگہ تہذیبِ مغرب کو تنقید کا نشانہ بناتے نظر آتے ہیں:

تہذیبِ فرنگ ہے سکوں سوز
اللہ اس آگ سے بچائے!
بد بخت بلا کی ہے بد آموز
اس کا نہ کوئی فریب کھائے!
ہر لمحہ عزیز اپنا ہی سود!
ہر لحظہ مفادِ خویش در پیش!
ہر وقت زباں پہ مدح اپنی
تہذیبِ فرنگ ہے ''عدو کیش''
بد بخت ہے خود غرض بلا کی
اسلام ہدف ہے ''ناسزا'' کا
یہ چاہتی ہے۔ یہی نعوذ باللہ
مٹ جائے جہاں سے گھر خدا کا (16)

امینِ حزیں مذہبی آدمی ہیں۔ انہیں مذہب سے بہت محبت ہے۔ اپنی شاعری سے وہ رشد و ہدایت کا کام بھی لیتے ہیں۔ انہیں برائی سے نفرت ہے اور نیکی سے پیار ہے۔ وہ اپنی شاعری میں جگہ جگہ خدائے بزرگ و برتر سے ڈرنے کی ہدایت کرتے نظر آتے ہیں۔ انہیں یقین کامل ہے کہ خوفِ خدا سے انسان راہ راست پر آ سکتا ہے:

کج کلاہی جہاں نہیں چلتی!
شانِ شاہی جہاں نہیں چلتی!
عذر خواہی جہاں نہیں چلتی
ایسی سرکار کے غضب سے ڈرو!
ذاتِ جبار کے غضب سے ڈرو!
گلشن ہست و بود کے لالے!
عیش و عشرت کی گود کے پالے!
تیرے سینے کے داغ ہیں

دھوانہیں آنسوؤں کی شبنم سے، چاہتا ہے نجات اگر غم سے

سب کی منزل لحد ہے تربت ہے کیا خبر کب کس کی نوبت ہے؟ آج فرصت ہے آج فرصت ہے!

رات دن ڈینگ مارنے والو!
ذاتِ جبار کے غضب سے ڈرو! (17)

امینِ حزیں کی شاعری وجدان جیسے موضوع سے بھری پڑی ہے۔ان کے نزدیک دنیا میں روشنی صرف اور صرف وجدان کی وجہ سے ہے اور وجدان کا انسانی عظمت میں اہم کردار ہے۔ وجدان کے حوالے سے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

دیکھا ہے تصور میں اِک مست تغافل کو
کونپل میں نظر آیا گلشن دلِ بلبل کو
اِک پل میں پہنچتا ہوں میں عرشِ حقیقت تک
جب ایڑہ بتاتا ہوں وجدان کے دلدل کو

وجدان کے شعلے سے دنیا میں اجالا ہے
نام آدمِ خاکی کا اس نے اچھالا ہے
تصویر مکمل ہے وجدان کی رفعت کی
کہتے ہیں نبی جس کو وجدان کا ہمالہ ہے (18)

خدائے بزرگ و برتر کی حمد وثنا کرنا ہر سچے مسلمان کی فطرت ہے۔امینِ حزیں ایک سچے اور کھرے مسلمان ہیں وہ اللہ تعالی کی حمد وثنا بھی کرتے ہیں۔مشکل وقت میں اس کے سامنے التجا بھی کرتے ہیں وہ اللہ تعالی کو مشکل کشا اور حاجت روا سمجھتے ہیں۔ان کا عقیدہ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی اور ذات حاجت روائی نہیں کرسکتی اس لئے امینِ حزیں فقط اسی ذات کے سامنے سربسجود ہوتے ہیں:

سر بہ سجدہ درِ حضور پہ ہوں
ارمغانِ عبودیت لے کر
اے غفور الرحیم حاضر ہوں
لب پہ اقرارِ معصیت لے کر

ایک پتلا خطا و نسیاں کا
عفو کی بھیک رو کے مانگتا ہے
اپنے خونِ جگر کے زمزم سے
نطق کو خوب دھو کے مانگتا ہے (19)

تیری رحمت ہی وہ سہارا ہے
بحرِ ہستی کا جو کنارا ہے
مثلِ خس بہہ نہ جاؤں طوفاں میں
لہریں بے مہر تیز دھارا ہے (20)

بے نیازی تری ہے ناز ترا!
وحدتِ ذات امتیاز ترا
تو ازل سے ہے رازِ سربستہ
ہو نہیں سکتا فاش راز ترا (21)

عشقِ مصطفٰے ہر مومن کے ایمان کا حصہ ہے۔ اقبال کی طرح امینِ حزیں بھی ایک سچے عاشق رسولؐ ہیں۔ ان کی غزلیات اور نظموں میں نعتیہ رنگ دیکھا جا سکتا ہے:

دو عالم سے بالا ہے شانِ محمدؐ
بہ روح محمدؐ بہ جانِ محمدؐ
کلامِ خدا تو ہے وحدت کا دریا
مگر رہگذر ہے زبانِ محمدؐ
وہی شاخِ طوبیٰ پہ ہیں چہچہاتے
جو بلبل کہ ہیں مدح خوانِ محمدؐ
امین کو ہے ''نور علیٰ نور مشعل''
کلامِ خدا و بیانِ محمدؐ (22)

امینِ حزیں کی نظموں میں ایسی بے شمار نظمیں بھی موجود ہیں جو قومی و ملی نظموں کے

زمرے میں شامل ہوتی ہیں۔ ڈاکٹر انور سدید اس حوالے سے یوں رقمطراز ہیں:

> اقبال کی نظموں کی مقبولیت سے متاثر ہو کر متعدد شعراء نے غزل کے ساتھ ساتھ نظم نگاری کی طرف توجہ دی۔ شوق قدوائی، بے نظیر شاہ وارثی، امجد حیدر آبادی، تاجور نجیب آبادی، ہری چند اختر، اثر صہبائی، طالب بنارسی، اوج گیاوی چند اور امین حزیں ایسے شاعر ہیں جنہوں نے مناظر فطرت، تہذیبی زندگی اور قومی مسائل پر اچھی نظمیں پیش کیں۔(23)

امینِ حزیں نے اپنی شاعری میں اپنے مفکرانہ انداز کے ساتھ تغزل کو بھی قائم رکھا ہے۔ انھوں نے اپنی شاعرانہ معنی آفرینیوں سے تقریباً تمام علامات اور شعری روایات کے مفہوم کو بدل دیا ہے۔ ان کے یہاں گل و بلبل، زلف و رخسار، جام و ساقی، عشق و محبت کا شاعرانہ تصور اور ان کی جذباتی کیفیات بالکل مختلف ہیں۔ اس حوالے سے اشعار ملاحظہ ہوں:

دل کی بیتابیوں کے عالم کا
زندگی نام رکھ دیا کس نے (24)

جن نگاہوں میں ہے سرور جہاں
ہیچ ہے ان کے آگے میخانہ (25)

پیار ہوتا ہے جس سے اے پیارے
اس کو ہی بار بار دیکھتے ہیں (26)

کیا یہی دل ہے؟ جس کو پہلو میں
ہم امیں بے قرار دیکھتے ہیں (27)

حسن کی مٹھی میں دل ہو تو غزل ہوتی ہے
سوز سے موم یہ سل ہو تو غزل ہوتی ہے (28)

امینِ حزیں کو غزل کے فن پر عبور ہے۔ وہ شعریت اور ادبیت کو اپنے مقصد پر قربان نہیں کرتے۔ جذبات کی فراوانی، تخیل کی بلند پروازی، وارداتِ قلبی کی اثر انگیزی اور اندازِ بیان

کی کرشمہ سازی امین کے اشعار میں بدرجہ اتم موجود ہے:

نفس کے سوزِ دروں سے شرار پیدا کر
جگر کی آگ سے بلبلِ بہار پیدا کر
تری نوا میں تڑپ بجلیوں کی لہرائے
نگاہِ شوق دلِ بیقرار پیدا کر (29)

وہ چشمِ مست سے کیا مسکرائے جاتے ہیں
مئ حیات کے ساغر پلائے جاتے ہیں
وہ ڈال کر مری آنکھوں میں آنکھیں کہتے ہیں
دلوں کے ساز کے یوں سر ملائے جاتے ہیں(30)

تحیر فزا پردۂ رنگ و بو ہے!
ادھر میں ہی میں ہوں ادھر تو ہی تو ہے!
مجھے دیکھتا ہے تو کیا میں نہ دیکھوں
ترے دیکھنے کی بڑی آرزو ہے
تری ہی قسم ذرے ذرے کے لب پر
ترا تذکرہ ہے تیری گفتگو ہے
پھڑک جائیں گے جس کو سن کر فرشتے
ابھی میرا وہ نغمہ زیرِ گلو ہے (31)

امینِ حزیں کی شاعری میں پابند نظم، قطعات، رباعیات، غزلیات کے ساتھ ساتھ گیت نگاری کے عناصر بھی موجود ہیں۔ ان کی بعض نظمیں موضوع اور ہیئت کے اعتبار سے گیت معلوم ہوتے ہیں۔ بعض نظموں کا عنوان ہی گیت کے نام سے دیا گیا ہے جیسے ''سرودِ سرمدی'' شعری مجموعے کی ایک نظم کا عنوان ''ماورائی نگاہ کا ایک اچھوتا گیت'' ہے۔

امینِ حزیں کے گیتوں کی موسقیت اور ہندی الفاظ کی مٹھاس قارئین کے دلوں پر جادو جیسا اثر رکھتی ہیں:

''بے کاجل کے نین رسیلے''
ہیں تیری دبدا میں گیلے
تیری ہی کارن تو راہی
ان کے سندر گال ہیں پیلے
تو سکھ پائے یہ دکھ جھیلیں
تو بن کر اگنی سے کھیلیں
اس جوتی کا دیپ ہے تو ہی
اس موتی کا سیپ ہے تو ہی
فطرت کے او ''نور العین''
''او پگلے اور بھولے راہی''
جاگ رہے ہیں تیرے کارن
سکھ ہی سکھ ہیں ان کے درشن
تو کیا جانے جاگ رہے ہیں
من موہن کے سندر نین
''او پگلے اور بھولے راہی''(32)

امینِ حزیں نے اردو شاعری کا مطالعہ اقبال اور غالب کے کلام سے شروع کیا اور وہ ان دونوں بزرگوں سے عقیدت رکھتے تھے۔ان کا کلام شوق سے پڑھتے تھے یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں جہاں اقبال کا اثر ملتا ہے وہاں غالب کے رنگِ سخن کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے۔غالب کے رنگ کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

ہم نشیں تم ہی کہو کس سے خفا ہو جایئے؟
اپنے ہاتھوں آپ کیوں وقفِ بلا ہو جایئے؟
بیت جائے کچھ بھی عاشق پر وہ کہہ سکتا نہیں
جایئے ہو جایئے مجھ سے خفا ہو جایئے (33)

محمل کی اوٹ میں لبِ لیلیٰ شفق فروش
دشتِ جنوں میں قیس ہے غوغا لیے ہوئے
اِک تو کہ بے حجاب نہ ہونا تری ادا
اِک میں کہ شوقِ دید کی دنیا لیے ہوئے
اِک تو کہ اپنے حسن کی ہے آپ ہی دلیل
اِک میں کہ تیرے عشق کا دعویٰ لئے ہوئے
اِک تو کہ تیری مست نگاہوں میں میکدے
اِک میں کہ لب پہ حسرتِ صہبا لئے ہوئے (34)

امینِ حزیں اپنی ساری زندگی اپنے آپ کو اقبال کے معنوی شاگرد کہتے رہے۔ یہ شاگردی کی ہی وجہ ہے کہ امینِ حزیں کے موضوعات اور رنگِ سخن پر اقبال کے گہرے اثرات نظر آتے ہیں۔ اقبال کے انداز کی جھلک چند اشعار میں ملاحظہ ہو:

پیتا ہے پلاتا ہے جیتا ہے جلاتا ہے
مومن میں نہیں رکھی پرویزی و چنگیزی
عالم کے لیے رحمت لا ریب وجود اس کا
اعجاز ہے مومن کے اندازِ دل آویزی (35)

نہ دے خوشی سے میری عرض کا جواب نہ دے
یہ ''بے رخی'' کا مگر بزم میں عذاب نہ دے
الٰہی! ذوق سماعت کی آبرو رکھنا
جواب دے تو کوئی ہو کے بے نقاب نہ دے (36)

امینِ حزیں کی طبیعت پر غالب رنگ اقبال کا تھا مگر اس کے باوجود امینِ حزیں نے بعد میں اپنے لئے اقلیم سخن میں نئی راہیں بھی تلاش کیں اور نئے افکار سے اپنے اشعار کو مزین کیا جس سے ان کے شاعرانہ کمال اور ناموری میں اضافہ ہوا۔ امینِ حزیں سیالکوٹی نے اردو شاعری کے دامن میں وسعت پیدا کی۔ ان کی غزلیات، منظومات، قطعات، رباعیات، گیت اور دیگر اصنافِ سخن کی تعداد ہزاروں میں ہے اور یہ تعداد معیار کے لحاظ سے بھی کسی طور پر کم نہیں۔ ان کی شاعری

کا اپنا بھی ایک الگ اندازِ سخن ہے جو اپنی پہچان رکھتا ہے۔ امینِ حزیں سیالکوٹی کو ناقدینِ ادب نے نظر انداز کیا وہ گمنامی کے پردوں میں مستور ضرور ہیں لیکن ان کا شعری سرمایہ آج بھی ان کی شناخت کو برقرار رکھے ہوئے ہے۔

حوالہ وحواشی

۱۔ ندیم احمد خان، ''سرگزشت'' مشمولہ ''نوائے سروش'' از امینِ حزیں، لاہور، الفیصل ناشران و تاجران، ۲۰۰۰ء، ص:۵

۲۔ ایضاً، ص:۶، ۷

۳۔ امینِ حزیں، ''گلبانگِ حیات''، لاہور، الفیصل ناشران وتاجران، ۲۰۰۶ء، ص:۸۱

۴۔ ایضاً، ص:۸۰

۵۔ ایضاً، ص:۱۱۷

۶۔ ایضاً، ص:۱۲۶

۷۔ ایضاً، ص:۱۰۱

۸۔ امینِ حزیں، ''سرورِ سرمدی''، لاہور، الفیصل ناشران وتاجران، ۲۰۰۶ء ص:۱۵

۹۔ حبیب کیفوی، ''امینِ حزیں۔ عبدالمسیح پال'' مشمولہ ''اقبال ریویو''، ص:۷۰

۱۰۔ امینِ حزیں، ''سرودِ سرمدی''، ص:۳۲

۱۱۔ زمینِ حزیں، ''گلبانگِ حیات''، ص:۶۹

۱۲۔ ایضاً، ص:۱۹۹

۱۳۔ ایضاً، ص:۱۲۵

۱۴۔ ایضاً، ص:۱۲۰

۱۵۔ ایضاً، ص:۱۵۱

۱۶۔ امینِ حزیں، ''سرودِ سرمدی''، ص:۲۳

۱۷۔ ایضاً، ص:۱۵

۱۸۔ امینِ حزیں، ''گلبانگِ حیات''، ص:۱۳۴

۱۹۔ امینِ حزیں، ''سرودِ سرمدی''، ص:۴۴

۲۰۔ ایضاً، ص:۴۷

۲۱۔ ایضاً، ص:۴۸

۲۲۔ ایضاً، ص:۳۲

۲۳۔ ڈاکٹر انور سدید، ''اردو ادب کی مختصر تاریخ''، لاہور، ایچ پبلشرز، اپریل ۱۹۹۶ء، ص:۳۳۷

۲۴۔ امینِ حزیں، ''گلبانگِ حیات''، ص:۱۸۱

۲۵۔ ایضاً،ص:۲۸
۲۶۔ ایضاً،ص:۱۹۷
۲۷۔ ایضاً،ص:۱۹۷
۲۸۔ امینِ حزیں،''سرودِ سرمدی''،ص:۳۹
۲۹۔ امینِ حزیں،''نوائے سروش''،ص:۹۶
۳۰۔ ایضاً،ص:۹۸
۳۱۔ امینِ حزیں،''گلبانگِ حیات''،ص:۱۸۸
۳۲۔ امینِ حزیں،''سرودِ سرمدی''،ص:۸۷
۳۳۔ ایضاً،ص:۴۹
۳۴۔ امینِ حزیں،''گلبانگِ حیات''،ص:۲۰۲
۳۵۔ ایضاً،ص:۱۲۵
۳۶۔ امینِ حزیں،''سرودِ سرمدی''،ص:۹۲

ڈاکٹر عبدالحمید عرفانی کی اقبال شناسی پر ایک نظر

ڈاکٹر خواجہ عبدالحمید عرفانی اقبال شناسی میں اہم مقام و مرتبہ رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر عرفانی نے عالمی سطح پر اقبال شناسی کی روایت میں نام کمایا۔ اقبال کو ایران میں متعارف کرانے کا سہرا خواجہ عرفانی کے سر جاتا ہے۔ عرفانی صاحب کی ادبی خدمات بے پایاں ہیں مگر ہمیں یہاں صرف عبدالحمید عرفانی کی اقبال شناسی کا جائزہ لینا ہے۔ اقبال کو ایران میں متعارف کرانے کے لیے ''رومی عصر'' جیسی مدلل کتاب، پاکستان میں جنم لینے والی مشہور عشقیہ داستانوں کو ''داستان پائے عشق پاکستان'' کے نام سے ایرانیوں کے لیے ''ضربِ کلیم'' کا فارسی ترجمہ لکھنا اور عبدالحمید عرفانی کی بے پایاں محنت اور اقبال سے محبت کی غماز ہیں۔ خواجہ عبدالحمید عرفانی نے علامہ اقبال پر ''اقبال ایرانیوں کی نظر میں''، ''اقبالِ ایران'' اور ''پیامِ اقبال'' تین کتابیں لکھی ہیں۔

''اقبال ایرانیوں کی نظر میں'' میں یہ واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اقبال سے آشنا ہونے کے بعد اہلِ علم ایرانیوں کی اقبال کے بارے میں رائے اپنے بزرگ شعرا جیسی تھی اور وہ اقبال کو حافظ، جامی، سعدی اور رومی کی صف میں شمار کرنے لگے تھے۔ ''اقبال ایران'' میں ڈاکٹر عرفانی نے اپنے قیام ایران کے دوران اقبال کو ایران میں متعارف کرانے کی جدوجہد، ایرانیوں کی اقبال سے آشنائی اور ایرانیوں کی اقبال اور پاکستان سے محبت کا اظہار کرنے کا تذکرہ کیا ہے۔ ''پیامِ اقبال'' میں ڈاکٹر عرفانی نے طلبا کی سہولت کے لیے اقبال کے پیغام کا خلاصہ چند صفحات میں پیش کیا ہے۔ اقبال کو ایران میں متعارف کرانا کوئی آسان کام نہ تھا۔ اس دوران عرفانی صاحب کو بہت سی مشکلات درپیش آئیں۔ جن کا تذکرہ انھوں نے ''اقبالِ ایران'' میں کیا ہے۔ اسی لیے سب سے پہلے ''اقبالِ ایران'' پر ایک طائرانہ نظر ڈالی جاتی ہے۔ تاکہ اقبال ایران میں متعارف کرانے اور قیام ایران کے دوران عرفانی کی مصروفیات کا اندازہ ہو سکے۔ اس کے بعد ''اقبال ایرانیوں کی نظر میں'' کا جائزہ لیا جائے گا اور ''پیامِ اقبال'' پر تبصرہ آخر میں کیا جائے گا۔

''اقبالِ ایران'' ۱۹۸۶ء میں بزمِ رومی سیالکوٹ نے شائع کی۔ اس کتاب میں عرفانی

نے اپنے قیام ایران کے یادگار لمحات، ایران کی اہم شخصیات سے ملاقاتوں اور اقبال کو ایران میں متعارف کرانے کے سلسلے میں کی گئی کاوشوں کے نقوش محفوظ کیے ہیں۔ ڈاکٹر عرفانی ایک ایسے عظیم محب وطن پاکستانی ہیں۔ جنھوں نے ایران میں پاکستان دوستی کا لازوال جذبہ پیدا کرنے کے لیے انتھک محنت کی۔ وہ فارسی لکھنے اور بولنے پر اہل زبان کی سی قدرت رکھتے تھے اور سالہا سال ایران میں رہ کر ایرانیوں کے مزاج شناس بن گئے تھے۔ اور یہ چیز ان کے مشن (یعنی ایران میں پاکستان دوستی کا لازوال جذبہ پیدا کرنا اور اقبال کو ایران میں متعارف کرانا) کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں بہت کام آئی۔ ''اقبال ایران'' میں یہ ساری باتیں ہماری سامنے آتی ہیں.

بقول ڈاکٹر محمد باقر:

> ''اقبالِ ایران'' کے اوراق پر ۱۹۴۴ء سے لے کر ۱۹۸۰ء تک کی پرارزش اور دلچسپ داستانیں بکھری نظر آتی ہیں۔''(۱)

''اقبالِ ایران'' گیارہ ابواب پر مشتمل تصنیف ہے۔ کتاب کے دیباچے میں مصنف نے ''گزارشِ احوال'' کے عنوان سے اپنے والد کی وفات، علامہ اقبال سے آشنائی، اپنے تایا مولوی الف دین، اپنی سرکاری ملازمت ایران سے روابط کا آغاز، ایران میں تقرری وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ ساتھ ہی ایران کے بعض شعرا اور ایران میں اقبال کو متعارف کرانے کے طریقے پر مختصر روشنی ڈالی ہے اور آخر میں کتاب لکھنے کے مقصد کی یوں وضاحت کی ہے:

> شاید میری کٹی پھٹی نامکمل یادداشتیں ایرانیوں کے بے لوث اور پر محبت احساسات کی تھوڑی بہت نشاندہی اور چند ممتاز ادبی شخصیتوں کے اظہارات ریکارڈ کرنے میں ممد ثابت ہوں۔(۲)

پہلے باب میں عرفانی نے قیام پاکستان سے پہلے ۱۹۴۵ء میں اپنی ایران تقرری کا ذکر کیا ہے اور قیام پاکستان سے پہلے ایران میں استقلال پاکستان کے بارے میں جو منفی رویہ پایا جاتا تھا اس کا تذکرہ بھی اس ابتدائی باب میں ملتا ہے۔

بقول ڈاکٹر عرفانی:

> اہل ایران قیام پاکستان کو فرنگی استعمار کی سازش اور مغربی ملکوں کے مفاد کا قلعہ سمجھتے تھے۔(۳)

مئی ۱۹۴۷ء میں عرفانی دلی واپس آ گئے۔ قیام پاکستان کے بعد ۱۹۴۹ء میں انھیں ایران میں پاکستان کا پہلا پریس اینڈ کلچرل اتاشی مقرر کیا گیا اور عرفانی نے نہایت نا

مساعد حالات میں اپنا کام شروع کیا۔

بقول عرفانی:

> خاکسار ایک بیرونی ملک میں پہلا پریس اتاشی تھا جس کو دفتر کلرک ،ٹائپسٹ، مترجم، قاصد تک کی مدد میسر نہ تھی۔ بس ایک میں تھا اور میرا قلم (۴)

اس کے بعد عرفانی نے ایرانی پریس کی ممتاز شخصیتوں سے اپنی ملاقات اور علمائے کرام سے براہ راست رابطہ کا ذکر کیا ہے۔ اس باب کے مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ عرفانی نے ابتدا سے ہی یہ کوشش کی کہ پاکستان کے بارے میں ایرانیوں کی رائے تبدیل کرنے کے لیے نظریہ پاکستان کا اصل مفہوم ایرانیوں پر آشکار کیا جائے اور جلد ہی اس کے مثبت آثار ظاہر ہونے لگے اور ایرانی علما جلسوں میں واضح طور پر کہنے لگے:

> ہمیں آج ہی عرفانی نے اقبال اور تحریکِ پاکستان کے پس منظر اور دشمنانِ اسلام کی سازشوں سے آگاہ کیا ہے۔ (۵)

پھر ڈاکٹر عرفانی نے ایک یادگار جلسے کا ذکر کیا ہے جس میں انھوں نے اقبال اور اسکے کلام کو پہلی مرتبہ باقاعدہ طور پر ایرانیوں سے متعارف کرایا ہے۔ دوسرے باب میں عرفانی نے راجہ غضنفر کے ایما پر ایران کے صوبائی مراکز کے دوروں کا تذکرہ کیا ہے۔ یہاں ایرانیوں نے عرفانی کے ساتھ جس عقیدت کا اظہار کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عرفانی کو ایران میں بے حد مقبولیت حاصل ہوئی۔ گورنر اصفہان کی طرف سے عرفانی کو خراجِ تحسین پیش کرنا اور سندھ شہریت عطا کرنے کی تجویز پیش کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ عرفانی سے ایران کے ہر خاص و عام کو خاص انس پیدا ہو گیا تھا۔ اس باب میں ڈاکٹر عرفانی نے تاریخی مقامات کی سیر کا بھی ذکر کیا ہے اور تخت جمشید کو روش کے پایۂ تخت پازارگاد کے کھنڈرات کی سیر کے ساتھ مزارات سعدی و حافظ کی زیارت کے واقعات کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ شیراز، تبریز اور آذربائیجان کے سفر کی روداد بھی اس باب میں ملتی ہے۔

دوران سفر انھوں نے مقامی مشاہیر سے اپنی ملاقاتوں کا ذکر بھی کیا ہے۔ اور ایران میں اپنی پہلی شائع ہونے والی تصنیف ''روس عصر'' کی اشاعت کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ جسے ایران میں بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ ایک خاص بات جو اس کتاب کے تقریباً ہر باب میں ملتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ ڈاکٹر عرفانی جہاں بھی جاتے ہیں نظریہ پاکستان کے اصل مفہوم اور اقبال کے کلام کو

ایرانیوں کے سامنے پیش کرنے کا کوئی موقع ضائع نہیں ہونے دیتے۔ ساتھ ہی پاکستان اور اقبال کے بارے میں ایرانیوں کے نئے جذبات اور احساسات بھی پیش کرتے چلے جاتے ہیں۔

تیسرے باب میں عرفانی نے ایران اور پاکستان کے علمی اور ثقافتوں کے رابطوں کی بحالی کا ذکر کیا ہے۔ اس باب میں سب سے پہلے ایران کے پہلے کلچرل اتاشی پروفیسر مشائخ فریدنی کے ۱۹۴۹ء میں پاکستان میں تقرر کا ذکر کیا ہے اور ان دو ملکوں کے مابین ڈیڑھ سو سال کی دوری اور جدائی کے بعد تجدید و توسیع و تحکیم کی روایت کی روح پرور داستان بڑے موثر انداز میں بیان کی ہے۔ اس باب میں شاہ ایران، رضا شاہ پہلوی کے تاریخی دورہ پاکستان کا مختصر ذکر بھی ملتا ہے۔ جن میں ملک الشعرا بہار اور ڈاکٹر کیکینہ کاظمی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ یہاں عرفانی نے پروفیسر مشائخ فریدنی کی ممتاز حسن اور قدرت شہاب سے بھی ملاقات کا ذکر کیا ہے۔ اور ساتھ ہی ڈاکٹر اشتیاق حسین، ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، سر ظفر اللہ اور شیخ محمد اکرام کی تہران میں آمد کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ ایران و پاکستان کلچرل سوسائٹی (انجمن دلہا) اور انجمن ادب ایران و پاکستان کے قیام کا ذکر بھی اس باب میں ملتا ہے۔

چوتھے باب میں ایران میں ڈاکٹر محمد باقر کی آمد کا ذکر کیا گیا ہے۔ اور ان کی ایران کی اہم ادبی شخصیات سے ملاقاتوں اور تقریبات میں شرکت کا تذکرہ کیا ہے۔ ساتھ ہی ملک الشعرا بہار کے دلگداز قصیدہ ''دورہ پاکستان'' کا ذکر بھی کیا ہے۔ جس میں علامہ اقبال، قائداعظم اور شہدائے پاکستان کو خراجِ تحسین پیش کیا گیا ہے اور ایران و پاکستان کے اتحاد پر زور دیا گیا ہے۔ پانچویں باب میں ڈاکٹر عرفانی نے ملک الشعرا بہار کے ساتھ گزارے گئے وقت کو محفوظ کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہاں ان کی بہار سے جذباتی وابستگی کا پتہ چلتا ہے۔ اس باب میں بہار کے پاکستان کے متعلق خیالات، بہار سے عرفانی کی پہلی ملاقات، بہار کی تحریک پر عرفانی کی مقالہ نویسی کا آغاز، بہار کے تاریخی قصیدہ، دورہ پاکستان، بہار کے آخری خطاب، بہار کے آخری خط، بہار کے نام عرفانی کے آخری منظوم خط، بہار کی سیاسی و ملی شاعری کا تذکرہ عرفانی نے نہایت عقیدت کے ساتھ کیا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ بہار سے عرفانی کو دلی وابستگی تھی اور بہار بھی عرفانی سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ چنانچہ ان کی تاریخی دو بیتی اس کا بین ثبوت ہے۔

دوش آمد پی عیادت من
ملکی در لباس اِنسانی

تعتمس چیست نام پاک تو؟ لعنت
خواجہ عبد الحمید عرفانی(۶)

اس سے ایران میں اقبال کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔ چھٹے باب میں ''شاعرِ ملی ایران'' سید صادق سرمد کے ساتھ عرفانی نے اپنی ملاقاتوں کا تذکرہ کیا ہے۔ ساتھ ہی سرمد کی شاعری پر اظہارِ رائے بھی ہوا ہے۔ سرمد اقبال کے انقلاب انگیز پیغام سے بے حد متاثر ہوئے۔ بقول عرفانی:

> راقم (عرفانی) کے خیال میں کسی ایرانی یا پاکستانی شاعر نے اقبال اور اس کی تعلیمات اور پاکستان ''اقبال'' پر اتنی نظمیں نہیں لکھیں جتنی اس فرد واحد صادق نے(۷)

اس باب کے آغاز میں اقبال کی تحلیل میں سرمد کے پہلے قصیدہ اور عرفانی کی تصنیف ''شرح احوال و آثار ملک الشعراء بہار'' کی ایران میں اشاعت پر سرمد کے تہنیتی خط کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس باب میں سرمد کی اقبال اور پاکستان سے بے پناہ محبت کا تذکرہ جا بجا ملتا ہے۔ چنانچہ سرمد کے قصائد سے جو اشعار منتخب کیے گئے ہیں ان سے عقیدت کا صاف اظہار ہوتا ہے۔ عرفانی سرمد سے بے انتہا متاثر تھے۔ چنانچہ انھوں نے سرمد کی زندگی اور شاعری پر ''سرور سرمد'' نامی کتاب بھی لکھی اور ''اقبال ایران'' کے اس باب میں بھی سرمد کی شاعری کی نمایاں خصوصیات کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ساتویں باب میں مختصراً اس پروپیگنڈہ کا تذکرہ کیا گیا ہے جو بھارتی رہنماؤں نے پاکستان کے قیام کے خلاف گھڑا تھا اور جس کی وجہ سے ایرانی پاکستان کو فرنگی استعمار کی سازش اور مغربی ملکوں کے مفاد کا قلعہ سمجھ بیٹھے تھے مگر عرفانی نے اس منفی سوچ کو تبدیل کرنے کے لیے انتھک جدوجہد کی اور موثر انداز میں قیام پاکستان کے اصل مقصد کو ایرانیوں کے سامنے پیش کیا۔ اور اس مقصد میں انھیں جو کامیابی حاصل ہوئی اس پر حیرانی بھی ہوتی ہے اور خوشی بھی۔

اگلے چار ابواب میں عرفانی نے ایران میں سفیرِ ہند سے اپنی دلچسپ نوک جھونک، وزیرِ اعظم ایران ڈاکٹر مصدق کا اپریل ۱۹۵۲ء میں یومِ اقبال پر اقبال کو خراجِ عقیدت اقبال کے منفرد عقیدت مند احمد سروش سے شناسائی اور ''کلیاتِ اقبال'' فارسی کی اشاعت ۱۹۶۸ء میں آر۔سی۔ڈی کے زیرِ اہتمام اپنے تین ماہ قیام کے ایران اور اقبال پر ڈاکٹر علی شریعتی کے طویل

مضمون کا اقتباس پیش کیا ہے۔

مذکورہ بالا ابواب کے جائزہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ڈاکٹر عرفانی نے ''اقبال ایران'' میں اپنی زندگی کے یادگار لمحات اور نقوش محفوظ کرنے کی کوشش کی ہے۔ پاکستان کے بارے میں ایرانیوں کی ابتدائی رائے (جو اچھی نہ تھی) اور عرفانی کی کوششوں سے اس رائے میں مثبت تبدیلی اور اقبال کی ایران میں مقبولیت کے اسباب کا اندازہ بھی اس کتاب کے مطالعے سے ہوتا ہے۔

بقول ڈاکٹر محمد باقر ''اقبالِ ایران'' میں:

> پاکستان کے متعدد سفیر اور عظیم شخصیتیں ایران سے مختلف النوع روابط قائم کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ ملک الشعرا بہار سے لے کر ڈاکٹر علی شریعتی تک کو عرفانی اپنی شخصیت، قوت بیان اور پاکستان و اقبال شیفتگی سے متاثر کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور انھیں پاکستان اور اقبال کا گرویدہ بنا دیتے ہیں۔(۸)

اقبال شناسی کے حوالے سے ''اقبال ایرانیوں کی نظر میں'' عرفانی کی دوسری اہم تصنیف ہے۔ جو اپریل ۱۹۵۷ء میں اقبال اکیڈمی پاکستان کراچی نے شائع کی۔ ''اقبال ایران'' پر تبصرہ میں عرفانی کی ان کاوشوں کا ذکر ملتا ہے جو انھوں نے پاکستان اور اقبال کو ایران میں مقبول بنانے کے لیے کیں۔ ''اقبال ایرانیوں کی نظر میں'' کے آغاز میں عرفانی نے ایک جامع مقدمہ لکھا ہے جو کتاب کی اہمیت پر روشنی ڈالتا ہے۔

بہار اور اقبال، اقبال اور محیط طباطبائی، اقبال اور سعید نفیس، اقبال اور ڈاکٹر حسین خطیبی، آقای محبتیں بینوی اور اقبال، ڈاکٹر گچکینہ کاظمی اور اقبال، اقتباس از مقالہ داعی الاسلام، اقتباس از سحرانی علامہ اکبر دھحر ا، انتخاب از خطابہ سید حسن تقی زادہ، خطابہ ڈاکٹر منوچہر اقبال، اقتباس سخزانی، مشایخ فریدنی، اقتباس از شامہ آقای حبیب اللہ آموزگار، اقتباس از ڈاکٹر علی صورت گر، اقتباس از مقالہ آقای صادق دشات، اقتباس از سخزانی ڈاکٹر ناظر زادہ کرمانی، اقتباس از معادہ آقای عبدالحسین نوائی، سرمد اور اقبال، قصیدہ از آقائی کاظم رجوی، قصیدہ از آقای ادیب برومند، اقتباس از قصیدہ آقای حبیب یعانی، قصیدہ ڈاکٹر قاسم رسا، قصیدہ آقای علی صدارت نسیم، اقتباس از اشعار آقای گلچین معانی، قصیدہ آقای علی خدائی، قصیدہ آقائی رجائی، قصیدہ آقائی طالعانی، ایران کے وزرا اعظم کے پیغام اور متفرقات تیس مضامین کی فہرست مقدمہ کے بعد

''اقبال ایرانیوں کی نظر میں'' شامل ہے۔

درج بالا فہرست مضامین سے واضح ہو جاتا ہے کہ اس کتاب میں وہ مضامین معاملات، قصائد شامل ہیں جس میں ایرانیوں نے اقبال کی عظمت کا واشگاف الفاظ میں اعتراف کیا ہے۔ساتھ ہی ایران کے وزرا اعظم کے پیغامات بھی کتاب میں شامل کیے گئے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال کا کلام ایران کے ہر خاص و عام کے دل پر اثر کر رہا ہے۔متفرقات میں ایران کے روزناموں میں سے ایسے اقتباس پیش کیے گئے ہیں جن میں اقبال کو پر خلوص خراج تحسین پیش کیا گیا ہے اور چند اشعار اور قصائد سے اقتباسات بھی اس حصے میں شامل کیے گئے ہیں۔

''اقبال ایرانیوں کی نظر میں'' کتاب کا عنوان اس کے موضوع پر روشنی ڈالتا ہے اور قارئین کی توجہ اس کی ظاہری صورت سے ہی اس کے مطالب کی طرف منعطف ہو جاتی ہے۔اس موضوع پر اردو زبان میں اب تک کوئی کتاب موجود نہیں تھی اور اس کا سبب یہ تھا کہ کوئی شخص پاکستان میں بیٹھ کر اس موضوع پر قلم نہیں اٹھا سکتا تھا۔۱۹۴۷ء میں دنیا کی سب سے بڑی اسلامی سلطنت پاکستان کے نام سے وجود میں آئی اور ایران سے صدیوں منطقع سیاسی اور تمدنی تعلقات از سر نو قائم ہوئے ۱۹۴۹ء میں ڈاکٹر عبدالحمید عرفانی پریس اور کلچرل اتاشی کی حیثیت سے ایران گئے۔(۹) اگرچہ اس سے قبل بھی عرفانی انگریزوں کی حکومت کے زمانے میں حکومتِ ہند کی طرف سے کلچرل نمائندہ کے طور پر ایران رہ چکے تھے لیکن ان کی موجودہ حیثیت نہ صرف جداگانہ تھی بلکہ پاکستانی ہونے کی حیثیت سے ممتاز بھی تھی۔انھوں نے قیام پاکستان کے بعد ایران میں اپنے ہفت سالہ قیام کے دوران جس تن دہی اور جس خوبی سے کام کیا وہ انھیں کا حصہیے۔اس کتاب کو مرتب کرنے کا خیال عرفانی کے دل میں کیوں آیا؟

اس بارے میں وہ یوں رقم طراز ہیں:

> میرا یہ مقدس فرض ہے کہ ایرانیوں کے پر محبت تاثرات اور ان کا نہایت دوستانہ اور بے نظیر عکس العمل جو اقبال کے متعلق میں نے گزشتہ سات سال کے عرصہ میں دیکھا۔سنا یا پڑھا اپنے ہم وطنوں کے لیے مثبت وضبط کر دوں۔(۱۰)

''اقبال ایرانیوں کی نظر میں'' میں شامل عرفانی کا مقدمہ خاص اہمیت کا حامل ہے۔جس میں عرفانی نے ان وجوہات کا ذکر کیا ہے جس کی بنا پر اقبال کو بہت کم ایرانی جانتے ہیں۔ان وجوہات سے اکثر کا ذکر اقبال ایران میں ہوا ہے۔البتہ ایک اہم بات کی طرف بھی عرفانی نے توجہ

دلائی ہے جس کا ذکر پہلے نہیں کیا گیا ہے۔ وہ یہ کہ تقسیم پاکستان تک اقبال کے کلام کا بہت ہی کم حصہ ایران پہنچ سکا تھا۔ اقبال کی نظمیں افغانستان کے بعض رسالوں کے ذریعے ایران پہنچی تھیں۔

اس حوالے سے عرفانی لکھتے ہیں:

> مجھے ڈاکٹر خانلری، پروفیسر تہران یونیورسٹی نے ایک قدیم نسخہ مجلہ سیاچن کا دکھایا جس میں اقبال کی ایک نظم درج تھی۔ جو کابل کے ایک رسالے سے نقل کی گئی تھی اور غلطی سے اقبال کو افغانستان کا شاعر تسلیم کیا گیا تھا۔ (۱۱)

ایران میں اقبال کے مقبول نہ ہونے کی ایک وجہ عرفانی کے خیال میں اقبال کا طرز بیان تھا جو معاصر ایرانی شعرا سے مختلف تھا۔ اقبال کی زبان اور طرزِ بیان قدما، متوسطین اور متاخرین شعرا کلاسیک فارسی کے مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ اقبال کی ''پیامِ اقبال'' مستقل اور مدلل تصنیف نہیں ہے بلکہ اپریل ۱۹۷۴ میں یومِ اقبال پر خواجہ عبدالحمید عرفانی نے ۱۵ صفحات پر مشتمل ایک رسالہ لکھا جسے بزمِ اقبال اسلامیہ کالج گوجرانوالہ نے شائع کیا۔ اس رسالے میں کلامِ اقبال اور پیامِ اقبال کے اہم خصائص پر اجمال کے ساتھ تبصرہ کیا گیا ہے۔ اس رسالے میں سب سے پہلے تو خواجہ عبدالحمید عرفانی نے یہ ثابت کیا ہے کہ اقبال کا پیام اور ان کا فلسفہ قرآن حکیم سے ماخوذ ہے۔ اس کے بعد اقبال نے اپنے کلام میں جن اہم عصری مسائل اور سیاسی نظامات پر تبصرہ کیا ہے۔ ان کے بارے میں خواجہ عبدالحمید عرفانی نے اجمال کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ یہ رسالہ طلبہ کے لیے تحریر کیا گیا کیونکہ عرفانی صاحب چاہتے تھے کہ طلبہ اقبال کے فلسفہ کو با آسانی سمجھ سکیں۔

ڈاکٹر عرفانی اس رسالہ کے مقدمہ میں رقم طراز ہیں:

> علامہ اقبال کی شخصیت شرح حال اور ان کے کلام و پیام کے متعدد پہلوؤں پر بلاشبہ بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور لکھا جا رہا ہے لیکن ہمارے نوجوان عدیم الفرصت طلبہ کے لیے علامہ کے بنیادی اور مرکزی عقائد و خیالات کو اختصار سے بیان کرنے کی ضرورت ہے۔ کوشش کی گئی ہے کہ بمصداق ''آفتاب آمد دلیل آفتاب'' اقبال کے واضح اور صریح اشعار بغیر کسی فلسفیانہ یا ادبی یا سیاسی تحلیل و تفسیر کے پیش کر دیئے جائیں تا کہ پڑھنے اور سننے والے اپنی اپنی صفائی دل اور پاکیزگی ضمیر کی روشنی میں براہِ راست لطف اندوز ہوں اور اپنی اپنی بساط اور استعداد کے مطابق استفادہ کر سکیں۔ (۱۲)

حوالہ جات

۱۔ ڈاکٹر محمد باقر، تبصرہ کُتب، ۹ جون ۱۹۸۷ء، ص: ۸
۲۔ ڈاکٹر عبدالحمید عرفانی، ''اقبال ایران''، سیالکوٹ، بزمِ رومی، ۱۹۸۶ء، ص: ۲۸
۳۔ ایضاً، ص: ۳۳
۴۔ ایضاً، ص: ۳۸
۵۔ ایضاً، ص: ۴۳
۶۔ ایضاً، ص: ۴۵
۷۔ ایضاً، ص: ۱۸۸
۸۔ ڈاکٹر محمد باقر، اقتباس از ''نوائے وقت''، ۹ جون ۱۹۸۷ء، ص: ۸
۹۔ ڈاکٹر عبدالحمید عرفانی، ''اقبال ایرانیوں کی نظر میں''، کراچی، اقبال اکادمی، ۱۹۵۷ء، ص: ۱۲
۱۰۔ ایضاً، ص: ۲۵
۱۱۔ ایضاً، ص: ۷
۱۲۔ ڈاکٹر عبدالحمید عرفانی، ''پیامِ اقبال''، گوجرانوالہ، بزمِ اقبال اسلامیہ کالج، ۱۹۷۲ء، ص: ۳

ریاض حسین چودھری۔ایک نعت گو شاعر

ریاض حسین چودھری (۱۹۴۱ء۔۲۰۱۷) کا اصل نام محمد ریاض حسین ہے۔آپ محلہ خراساں مسلم بازار سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔گورنمنٹ مرے کالج سے بی۔اے کیا۔ایل ایل بی اور ایم۔اے اردو پنجاب یونیورسٹی سے کیا۔آپ چھٹی کے طالب علم تھے جب آپ نے شعرو شاعری کا آغاز کیا۔(۱) شاعری میں ابتدائی رہنمائی آسی ضیائی رامپوری سے لی۔آپ نے آغا صادق کے سامنے بھی زانوئے تلمذ طے کیے۔۱۹۵۹ء میں آپ نے بچوں کے لیے ایک نظم لکھی جو ماہنامہ ''پھلواری'' میں شائع ہوئی۔ابتدا میں آپ نے نظم اور غزل میں شاعری کی لیکن نعتیہ شاعری ان کی پہچان ہے۔ان کی پہلی نعت، ہفت روزہ ''قندیل'' لاہور میں شائع ہوئی۔سید آفتاب احمد نقوی کی ترغیب پر ریاض حسین چودھری کا رجحان نعت کی طرف بڑھا پھر ایک وقت ایسا آیا کہ آپ نے اپنے آپ کو صرف نعت کے لیے وقف کر دیا۔بہترین نعت گو شاعر ہونے کی وجہ سے ۲۰۰۰ء میں آپ کو صدارتی ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔(۲)

ریاض حسین چودھری کا پہلا شعری مجموعہ ''خونِ رگِ جاں'' ہے۔جو ملی نظموں پر مشتمل ہے۔جو ۱۹۷۰ء میں شائع ہوا۔دوسرا شعری مجموعہ زرِ معتبر'' نعتوں پر مشتمل ہے۔یہ پہلی بار ۱۹۹۵ء میں اور دوسری بار ۲۰۰۰ء میں شائع ہوا۔یہ مجموعہ دوسو اٹھاسی صفحات پر مشتمل ہے۔حفیظ تائب نے اس کتاب کی نعتیہ شاعری کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ریاض حسین چودھری نے ''تحدیث نعمت'' کے عنوان سے اس کتاب پر تعارفی مضمون لکھا ہے۔اس مجموعے کا فلیپ احمد ندیم قاسمی نے لکھا ہے۔جس میں زرِ معتبر کی نعتیہ شاعری پر تبصرہ کیا گیا ہے۔تیسرا شعری مجموعہ ''رزقِ ثنا'' ہے جو پہلی بار ۱۹۹۹ء میں شائع ہوا۔اور دوسری بار ۲۰۰۰ء میں شائع ہوا۔اس نعتیہ مجموعے پر انھیں صدارتی ایوارڈ ملا۔ڈاکٹر خورشید رضوی اور حفیظ تائب نے اس کتاب کے فلیپ لکھے ہیں۔جن میں ریاض حسین چودھری کی نعتیہ شاعری کا مختصراً فکری و فنی جائزہ لیا گیا ہے۔اس کتاب میں پروفیسر ڈاکٹر عاصی کرنالی کا ریاض کی نعت نگاری پر تبصرہ بھی شامل ہے۔اس میں ریاض حسین

چودھری کا مضمون ''آیہ کائنات کا معنی دیریاب تو'' کے عنوان سے شامل ہے۔ جس میں انھوں نے عشقِ رسولؐ کے حوالے سے اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے۔ اس مجموعے کی ضخامت ایک سو چھہتر صفحات پر مشتمل ہے۔ ''تمنائے حضوری'' ریاض کا چوتھا نعتیہ شعری مجموعہ ہے۔ جو ایک سو چھہتر صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ بیسویں صدی کی آخری طویل نعتیہ نظم ہے۔ اس مجموعے کا فلیپ پروفیسر محمد اقبال جاوید نے لکھا ہے جس میں تمنائے حضوری پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ اس مجموعے میں ریاض حسین چودھری کا مضمون، ''لمحات حاضری کی تمنا لیے ہوئے'' بھی شامل ہے۔ پانچواں نعتیہ شعری مجموعہ ''متاعِ قلم'' ہے جو ۲۰۰۱ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعے کی ضخامت ایک سو چوراسی صفحات ہے۔ اس کتاب کا فلیپ ڈاکٹر سلیم اختر نے لکھا ہے۔ جس میں ریاض کی ''متاعِ قلم'' کی نعتوں کا مختصراً فکری وفنی جائزہ لیا گیا ہے۔ ''کچھ متاعِ قلم کے بارے میں'' کے عنوان کے تحت آسی ضیائی رامپوری نے اس کتاب کے بارے میں ایک تنقیدی مضمون لکھا ہے۔ جو اس کتاب میں شامل ہے۔ ''کشکولِ آرزو'' ریاض کا چھٹا نعتیہ شاعری کا مجموعہ ہے۔ جسے ۲۰۰۲ء میں القمر انٹر پرائزز لاہور نے شائع کیا۔ اس کی ضخامت ایک سو اڑسٹھ صفحات ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری اور ڈاکٹر سید محمد ابوالخیر کشفی نے اس مجموعے کے فلیپ لکھے ہیں۔

جس میں انھوں نے اس مجموعے کی نعتوں کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ پروفیسر عبدالعزیز نے ایک تنقیدی مضمون ''نعت میں تغزل اور شعریت کی ایک وہبی صورت'' کے عنوان کے تحت لکھا ہے۔ جو اس کتاب میں شامل ہے۔ جس میں مضمون نگار نے ریاض کے فکر وفن پر تبصرہ کیا ہے۔ ساتواں نعتیہ شعری مجموعہ ''سلام علیک'' نوریہ رضویہ پبلی کیشنز لاہور نے ۲۰۰۴ء میں شائع کیا۔ اس کتاب کی ضخامت ایک سو چودہ صفحات ہے۔ اس کتاب کا فلیپ ریاض مجید نے لکھا ہے۔ جس میں ''سلام علیک'' کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کتاب کا پیش لفظ ڈاکٹر ظہور احمد اظہر نے لکھا ہے۔ ''خُلد سخن'' ریاض کا آٹھواں نعتیہ شعری مجموعہ ہے۔ جسے القمر انٹر پرائزز لاہور نے ۲۰۰۹ء میں شائع کیا۔

اس مجموے کے فلیپ ابوالامتیاز، ع، س، مسلم اور ڈاکٹر طاہر القادری نے لکھے ہیں۔ جن میں خلد سخن کی نعتوں کے بارے میں تبصرہ شامل ہے۔ پروفیسر محمد اکرم رضا کا ایک تنقیدی مضمون ''خلدِ سخن میں نعتِ ریاض'' کے عنوان کے تحت بھی اس مجموعے میں شامل ہے۔ اس مجموعے کی ضخامت دوسو بتیس صفحات ہے۔ ''غزل کا سہ بکف'' ریاض کا نواں نعتیہ مجموعہ ہے۔

جسے مکتبہ تعمیر انسانیت لاہور نے ۲۰۱۳ء میں شائع کیا۔ اس مجموعے کی ضخامت دو سو تیرہ صفحات ہیں۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر ابوالخیر کشفی، احمد ندیم قاسمی، حفیظ تائب، ریاض مجید اور شیخ عبدالعزیز دباغ نے ''غزل کا سہ بکف'' کے فلیپ پر تنقیدی تبصرے لکھے ہیں۔ اس کتاب کا پیش لفظ بشیر حسین ناظم نے لکھا ہے۔ جس میں ریاض کی نعتیہ شاعری پر تبصرہ شامل ہے۔ شیخ عبدالعزیز دباغ نے ایک تنقیدی مضمون'' لکھے عروس شہر غزل، نعت مصطفیٰ'' عنوان کے تحت لکھا ہے۔ ریاض حسین چودھری نے بھی ''غزل کا سہ بکف ساکت کھڑی ہے ان کی گلیوں میں'' کے نام سے مضمون لکھا ہے۔ یہ نعتیہ مجموعہ غزل کی ہیئت میں لکھا گیا ہے۔ ''طلوع فجر'' ریاض کا دسواں نعتیہ شعری مجموعہ ہے۔ جسے القمر انٹر پرائزز لاہور نے ۲۰۱۴ء میں شائع کیا۔ طلوع فجر آقائے محتشم کے یومِ ولادت کے حوالے سے کہی گئی ۵۰۰ بنود پر مشتمل طویل نعتیہ نظم ہے۔ اس کتاب کے ۵۰۰ صفحات ہیں۔ اس کے فلیپ پر زاہد بخاری نے ایک تنقیدی تبصرہ لکھا ہے۔ اس کا ''پیش لفظ'' پروفیسر ڈاکٹر محمد اسحاق قریشی نے لکھا ہے۔ اور ایک مضمون'' تاریخِ کائنات کا سب سے بڑا دن'' ریاض حسین چودھری نے تحریر کیا ہے۔ جس کا موضوع حضورؐ کی ولادت ہے۔

ریاض حسین چودھری کی نعت کے تمام استعاروں کا خمیر دین و آئین رسالت کے ساتھ ساتھ عہدِ جدید کے معتبر حوالوں سے اٹھا ہے اور ان میں تقدس بھی ہے اور تازہ کاری بھی۔ انھوں نے نعتیہ شاعری کو آزاد اور پابند نظموں کے وسیع امکانات کے ذریعے نئے آفاق دکھائے ہیں۔ اور غزلیہ انداز کی نعتوں کو جدید اسالیب سے ہم آہنگ کر کے نیا وقار عطا کیا ہے۔ آزاد اور پابند نظموں میں جہاں سیرت کے بیکراں مضامین کا احاطہ کیا ہے وہاں ان کا ہر ہر مصرعہ اور ہر ہر سطر پیرائیہ غزل لیے ہوئے ہے۔ نعتیہ غزلیں شاعر کی جولانی طبع کی بدولت ایک طرف قصیدہ بنتی نظر آتی ہے۔ تو دوسری طرف ان میں نظم کا تسلسل در آیا ہے۔ نو بہ نو ردیفیں اور زمینیں اس پر مستزاد ہیں۔ جذبات و شعریت کا وفور اور گہرا عصری شعور ہر صنف کو آگے ہی آگے بڑھاتا نظر آتا ہے۔ ریاض کی کائنات نعت میں گھر اور وطن کا استعارہ ایک جاندار اور توانا کائی کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ ریاضؔ تاجدار کائناتؐ کی بارگاہِ میں پہنچتے ہیں تو اپنے بچوں اور وطن کی ہواؤں کا سلام بھی حضورؐ کی خدمت اقدس میں پیش کرتے ہیں۔ ریاضؔ کی نعت گوئی میں استغاثے کا انداز نمایاں ہے۔ وہ اپنے انفرادی اور اجتماعی دکھ حضور ﷺ کی عدالت عظمیٰ میں پیش کر کے نظر کرم کا ملتجی ہے۔ ریاض کا اسلوب اردو شاعری میں تمام تر جمالیات سے مستیز ہے اور اسے جدت و شائستگی کا معیار دیا جا سکتا ہے۔ احمد ندیم

قاسمی ریاض کی نعت نگاری کے حوالے سے رقم طراز ہیں:

> گزشتہ ربع صدی میں ہمارے ہاں نعت نگاری نے بہت فروغ پایا ہے۔ جن شعرا نے اس صنفِ سخن میں ہمیشہ زندہ رہنے والے اضافے کیے ہیں ان میں ریاض چودھری کا نام بوجہ روشن ہے۔ حفیظ تائب اور حفیظ لدھیانوی کی طرح ریاض نے بھی شاعری کا آغاز غزل سے کیا مگر اس کے بعد جب نعت نگاری شروع کی تو غزل کی طرف پلٹ کر نہیں دیکھا۔ ریاض اس دور کا ایک بھرپور نعت نگار ہے۔ بھرپور کا لفظ میں نے جان بوجھ کر استعمال کیا ہے۔ ان کے کلام میں محبت کی سرشاری بھی ہے۔ لفظ اور لہجے کی موسیقی بھی ہے اور وہ پھر وہ حدِ ادب بھی ہے۔ جو نعت نگاری کی اولین اور بنیادی شرط ہے۔ (۳)

ریاض حسین چودھری کا شمار ان بلند ذکر شعرا میں ہوتا ہے۔ جن کا آغاز غزل سے ہوا مگر جب نعت کے چمن زاروں میں پہنچے تو نعت کی صورت میں اپنے عہد کو معتبر کر گئے۔ تغزل ان کے ہاں بیان نہیں ہوتا۔ بلکہ چٹکتی ہوئی کلیوں کی صورت میں پھوٹتا ہے۔ دلوں کے مطلع پر الہام کی صورت اپنے وجود کو ضو بخشتا ہے۔ تغزل تعریف کا محتاج نہیں بلکہ اشعار کی تاثیر انگیزی خود تغزل سے اپنی پہچان ڈھونڈتی ہے۔ ریاض حسین چودھری کے ہاں ایسی ہی بلند پروازی جا بجا نظر آتی ہے۔

طلوعِ مہرِ شفاعت سروں پہ چھائے گا
نہیں ہیں خوفزدہ ہمنوا قیامت سے
مشامِ جاں کو معطر کریں گے محشر تک
چنے ہیں پھول سمن زارِ شہرِ رحمت سے (۴)

دل میں خیال خُلد مدینہ ہے اس لیے
دامن قلم کا چاند ستاروں سے بھر گیا
آدابِ حاضری کے تھے معلوم کب مگر
میں اپنے ساتھ لے کے یہی چشمِ تر گیا (۵)

سورج اُتر رہے ہیں فصیلِ شعور پر
نقشِ قدم کسی کا مری داستان میں ہے

معراجِ آرزو ہے غبارِ رہِ حجاز
اوجِ خیال خاکِ درِ آستاں میں ہے (۶)

ریاض حسین چودھری نے عہد حاضر کے پیمانے میں خمستان حجاز کی مئے عقیدت ڈال کر اس کے نشہ شوق کو مزید اثر انگیز بنا دیا ہے۔ ان کے ہاں جدید دور اپنی پوری والہانہ تب وتاب کے ساتھ بول رہا ہے۔ نعت فقط شاعری نہیں بلکہ یہ تو وارداتِ قلبی کا اظہار ہے۔ اور جب اس وارداتِ قلبی کو عصرِ حاضر کی جدتوں کی شرح کمال کی پہچان ہو جاتی ہے۔ تو شاعر تو ایک طرف قاری کے قلب وفکر میں نئی ہمہ رنگی، نیا جوش، نیا خروش اور جدید لہجے کی حرارت، بدولت سوز وگداز کی محبوب تر کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ ریاض کی کمند شوق سے نئی تراکیب وتشبیہات بمشکل ہی بچ کر نکلتی ہیں۔ یہ جدید پیرائیہ اظہار میں نعت کے قدیم حسن کو اس شان سے سموتے ہیں کہ افکار جھوم جھوم اٹھتے ہیں:

فصلِ یقیں اُگے جلی کشتِ خیال میں
اُمت کھڑی ہے قریۂ شام وصال میں
جیسے شعور نو سے کوئی واسطہ نہیں
حیران چشم تر ہے رہِ پائمال میں
کب سے گرفتِ حبس مسلسل میں ہیں حضورؐ!
آلودگی کا زہر ہے بادِ شمال میں (۷)

مرنے کے بعد بھی ہے عشقِ نبیؐ کا موسم
مری لحد میں اُترے یہ روشنی کا موسم
لب پر جہالتوں کے کانٹے اُگے ہوئے ہیں
شاخِ ثنا پہ مہکے اب آگہی کا موسم (۸)

ریاض حسین کے ہاں نعت کے حوالے سے وہی سوز وگداز، ادب واحتیاط، والہانہ پن، خودسپردگی، عجز ونیازمندی اور نامِ رسولؐ پر مر مٹنے کے جذبات پوری شان کے ساتھ ملتے ہیں جو اوائل سفر نعت ہی سے ان کی نعت کا امتیاز رہے ہیں۔ ان کے والہانہ پن کے انداز بے اختیار پڑھنے والوں کی آنکھوں کو عقیدت کا نم عطا کرتا ہے۔ اس مقصد کی خاطر ان کے ہاں درود وسلام

،ذوق وشوق ،عقیدت واحترام کی بدولت تازگی ،شگفتگی اور فکری تسلسل کے مظاہر اس کثرت سے ملتے ہیں۔کہ ان کی نعت گوئی اپنے کمال کو چھوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔وہ لفظوں کے سوداگر نہیں بلکہ حسنِ عقیدت کے گہر پائے گراں مایہ کے تمنائی ہیں۔

ان جواہرِ گراں بہا کو وہ اپنی خداداد جذباتیت سے حسنِ دوام عطا کرتے ہیں۔تاکہ گل ولالہ کے حسن سے رنگ ونور مستعار لینے کے بعد جب وہ انھیں بارگاہِ مصطفویؐ میں نذر کرنے کی سعادت حاصل کریں۔تو پھر حضورؐ کی چشمِ رحمت انھیں مستقبل کے نعت گووں کے نشانِ راہ عقیدت بنادے۔

ریاض چودھری لکھتے ہیں:

آرزو کے گھروندے بناتے ہوئے شہرِ طیبہ کی گلیوں میں جائیں گے ہم اور کسی کونے کھدرے میں اے ہمسفر ایک چھوٹا سا گھر خود بنائیں گے۔ہم ابرِ رحمت میں لپٹا ہوا قلم،آبِ کوثر میں ڈوبی ہوئی ہے زبان شہرِ حرف و بیان کے مضافات میں پیڑ صل علی کے لگائیں گے ہم۔(۹)

ادب کا یہ تقاضا ہے بوقتِ حاضری زائر
نگاہِ بے طلب سے لوحِ دل پر مدعا لکھے
میں ہر ساعت کے ہونٹوں پر گلاب نعت رکھتا ہوں
بہارِ جاوداں میرے مقدر میں ثنا لکھے (۱۰)

یہ حضورؐ کی کرم نوازی ہے کہ وہ ریاضؔ کو حوصلہ سخن گوئی بھی دیتے ہیں اور نوید قبولیت سے بھی نوازتے ہیں۔یہی وہ مقامِ شوق ہوتا ہے۔جب ریاضؔ کے دل میں اپنی اور ملت کی پریشان حالیوں کے سرچشمے پھوٹنے لگتے ہیں کیوں کہ وہ ایک زمانے سے بہتر جانتے ہیں کہ یہ وہ بارِ کرم بار ہے جہاں بے نام جذبوں کو رعنائی قبولیت عطا ہوتی ہے اور یہاں نہیں کا تصور ہی نہیں ہے۔ریاضؔ کا دل ایک معصوم بچے کی طرح بلکتا ہے۔ایک طائرِ بے پر کی طرح پھڑ پھڑا کر چشمِ حضورؐ کی عنایات میں کھو جاتا ہے۔لرزتے ہاتھ،خمیدہ وسر نہادہ افکار ان کی تمناؤں کی دنیا کا ہر گوشہ بارگاہِ رسالت مآبؐ میں پیش کردیتے ہیں۔

چھپا کر آپؐ کا اسمِ گرامی اپنے سینے میں
میں شہرِ ہجر میں ہوں اور رہتا ہوں مدینے میں

گناہوں کی دھری میں گھڑیاں کتنی مرے سر پر
ندامت ہی ندامت ہے ندامت کے پسینے میں(۱۱)

کوئی سکہ نہیں ہے جیب وداماں میں مگر پھر بھی
میں اٹی سوت کے لے کر سرِ بازار رہتا ہوں
مری کشتی کو بھی اُمید کا ساحل نظر آئے
پسِ گرداب بہتا ہوں سرِ منجدھار رہتا ہوں (۱۲)

ریاضؔ اُمت حضورؐ کا فسانۂ الم بھی سناتے ہیں تو خود کو الگ نہیں سمجھتے بلکہ ان کا جذبہ یہاں بھی امتِ حضورؐ کی داستان رنج والم بیان کرتے ہوئے نمایاں ہے۔ ذرہ صحرا سے، قطرہ سمندر سے اور پھول گلشن سے کس طرح الگ ہوسکتا ہے۔ ریاض کی عرض گزاری کا اندازہ دیکھیے۔ تڑپ ہے۔ سوز و گداز بھی ہے۔ والہانہ پن بھی ہے، آنسوؤں کی چمک بھی ہے۔ جذبات کی شدت کی لپک بھی ہے۔ اُمت حضورؐ کی بے بسی پر ہر شعر میں پوشیدہ کسک بھی ہے لیکن حوصلہ ہے تو یہی کہ ان سے کہوں تو کس سے کہوں:

آقا حضورؐ ،صرف ضعیفی کے جرم میں
سر پر ہمارے تاجِ فضیلت نہیں رہا
رسوائیوں کی گود میں لپٹے ہوئے بدن
قول و عمل میں نور مشیت نہیں رہا (۱۳)

جلیں گے اپنی ہتھیلی پہ کیا دیے آقاؐ
ہر ایک سمت سے طوفان نے آن گھیرا ہے
ہر ایک سمت ہوا نے کماں اٹھائی ہے
ہر ایک سمت تضادات کا اندھیرا ہے (۱۴)

جہاں تک محبت رسولؐ کا تقاضا ہے تو ریاضؔ حسین و فور شوق میں اس قدر آگے بڑھ جاتے ہیں جہاں خواہش جنم لیتی ہے کہ ان کی یہ محبت لاشریک ہو۔ ایسا ہونا ممکن تو نہیں مگر ان کی آرزوؤں کی تپش ان کے جذبوں کی دل افروزگی ان کے اشعار میں لفظ لفظ سے پھوٹتی ہوئی دید حضورؐ کی آرزو

تاریخ ادب کی بہترین تشبیہات و تراکیب کو اسمِ محمدی کی تابانیوں کی نذر کرنا عشقِ حضورؐ میں بہتے ہوئے آنسوؤں کو زمانے بھر کے عشاق کی ترجمانی کا حسن عطا کرنا خیالات و احساسات کی بلند پروازی کا مرکز و محور فقط ذاتِ حضورؐ ہی کو قرار دینا فرسودہ و پامال تراکیب، حسن عالمگیری سے مرصع کرنا، اپنے نالہ شوریدہ کو دورِ حاضر کی صدائے دردناک کی لے عطا کرنا ریاضؔ کا قلم نعت رقم کرتے کرتے جلوہ صد رنگ میں سرمست ہو جاتا ہے۔ اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ مدینہ طیبہ سے واپسی کا سفر ہے۔ کون کون سی آرزوؤں کے چراغ روشن کیے بیٹھے ہیں، دل واپسی کو چاہتا بھی ہے مگر غیر محسوس جذبے مختلف آرزوں کے حوالے انھیں واپسی سے روکتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں:

لکھا ہوا اسمِ حضورؐ جس پر قلم وہ ایسا خریدار کر لوں
میں ان کے دامن سے آج بھی کچھ حسین موسم کشید کر لوں
حروف طاقِ دل و نظر میں چراغ بن کر جلیں سحر تک
یہ چاہتا ہوں میں اپنے جذبوں کی آنچ اتنی شدید کر لوں
چراغ پلکوں پہ رکھ رہا ہوں مری شریک سفر ،ہواؤ
اگرچہ دامن تہی ہے لیکن میں کچھ تو سامانِ دید کر لوں
میں دل کے سادہ ورق پہ توصیفِ مصطفیٰؐ کی سجادوں کلیاں
شریکِ حرفِ ثناء چمن کو اے میرے ذہنِ جدید کر لوں
ازل سے اشکوں کے آئینوں میں نقوش پا کا ہے عکس روشن
میں دیدہ تر میں تیز عشقِ نبیؐ کی لو کو مزید کر لوں (۱۵)

ریاضؔ تاجدار کائنات کی بارگاہ میں پہنچتا ہے تو اپنے، بچوں، گھر کی کنیزوں اور وطن کی ہواؤں کا سلام بھی حضورؐ کی خدمتِ اقدس میں پیش کرتا ہے۔ وہ وطن عزیز کے مشرقی بازوؤ کے کٹنے کا المیہ بھی رحمتِ عالمؐ کے حضور پیش کر کے شق القمر کی مقدس حقیقت کا انجام پھر سے دیکھنا چاہتا ہے۔ ریاضؔ خاکِ وطن کے آنسو بھی طشتِ ہنر میں سجا کر حضورؐ کے قدموں میں رکھنے کی سعادت حاصل کرتا ہے:

غلامانِ محمدؐ کا حصارِ آہنی ہے یہ
وطن کے واسطے جتنی بھی ممکن ہو دعا لکھنا
جھوم کے اُٹھے گھٹا ارضِ محمدؐ سے ریاضؔ
شہرِ اقبال کی مٹی کا مقدر جاگے (۱۶)

میرے بچوں کو وراثت میں ملے حُبِ رسولؐ
یہ اثاثہ بعد میرے بھی تو گھر میں چاہیے (۱۷)

ریاضؔ نے اپنی نعت میں ہر قدم پر احساسِ غلامی کو زندہ رکھا ہے۔ اس کا شعورِ غلامی عقیدت کے انھی گہرے پانیوں میں ڈوبا ہوا ہے۔ ان کے ہاں مدینے سے دور رہ کر بھی حضوری کی کیفیتوں کی سرشاری ملتی ہے۔ اس کیفیت کے زیر اثر ان کا وجدان پکار اٹھتا ہے:

زنجیر سرہانے رکھ کر میں اس سوچ میں ڈوبا رہتا ہوں
جب شہرِ مدینہ آئے گا دیوانے کا عالم کیا ہو گا
جب میں پہنچوں گا مدینے کی گلی کوچوں میں
ایک عالم مرا پہلے سے شناسا ہو گا (۱۸)

میں اُجالوں کا مسافر ہوں کہاں جاؤں حضورؐ
ہر طرف دیوارِ شب ہے راستہ کوئی نہیں
رستہ کسی سے پوچھنا توہین ہے مری
ہر رہگذر شہرِ پیمبرؐ کو جائے ہے (۱۹)

ریاضؔ نے نظم معریٰ میں بھی اچھے خاصے تجربے کیے ہیں اور جدید نعت کے اساسی زاویوں کی بنیاد رکھی ہے، کومٹ منٹ، یکتا وتنہا، وژن، نئے دن کا سورج، حصارِ گنبد، ہجر کی پہلی صدا، اس حوالے سے خوبصورت نظمیں ہیں۔ ریاض نے نعت میں ایک عجیب وغریب پیرائے کی طرح ڈالی ہے کہ مدح کی سرسبز وادیوں میں گھومتے ہوئے اس کا دھیان عصری آشوب کی طرف مبذول ہو جاتا ہے۔ اس مرحلے میں حضورؐ سے اذنِ گزارش طلب کرتا ہے۔ نفسیاتی اعتبار سے اس عمل میں شاعر کی طبیعت کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔ جب کہ اس کا اصل مقصود طلبِ رحمت ہوتا ہے۔ ایک نعتیہ غزل میں مختلف مراحل کی صورتیں یوں بیان کرتے ہیں:

اُسی کا چہرہ نظر نظر ہے، اُسی کا جلوہ سحر سحر ہے
کتابِ دل کے ورق ورق پر اُسی کی سیرت لکھی ہوئی ہے
طلوعِ مہرِ حرا سے ٹوٹا حصارِ شب کا نظامِ باطل
تمدنوں کی جبیں کی کالک اسی کے قدموں کو ڈھونڈتی ہے

حضورؐ اپنے غلام زادوں کو اذن بخشیں گزارشوں کا
فصیلِ شہرِ دُعا پہ میری صدا بھی آ کر ٹھہر گئی ہے
مرے وطن کی گلاب گلیوں میں رنگ و بو کے کھلیں دریچے
سیاہ برگِ خزاں ادھر بھی، اُدھر بھی ڈیرے جما رہی ہے (۲۰)

ریاض حسین کا ایمان ہے کہ حضورؐ کی ثنا ہی اس کے نطق ونوا کے سارے قفل کھولتی ہے۔ آپؐ کا اسمِ مبارک دعاؤں کے طاقچوں کو ہمیشہ روشن رکھتا ہے۔ اور آپؐ ہی کی ذات بابرکات ہر عہد کے انسان کو تشخص عطا کرتی ہے:

مرے نطق کے قُفل کھولے ہیں تو نے مجھے اذن اپنی ثنا کا دیا ہے
مرے رنگ آلود افکار لے کر مجھے تو نے ہی حرفِ تازہ دیا ہے
ترا نام طاقِ دعا میں ہے روشن، ازل سے ابد تک یہ روشن رہے گا
کہ تو نے رسولؐ خدا ہر صدی، ہر زمانے کے انساں کو چہرہ دیا ہے (۲۱)

ریاض حسین چودھری کی نعتیہ شاعری کا ہر شعر محبت وعقیدت رسولؐ کی کھلی تصویر ہے۔ اور اس میں سے ریاض کے سچے، مخلصانہ، جذبات پھوٹے پڑ رہے ہیں اور ساتھ ہی، قاری یہ بھی محسوس کرتا ہے کہ نعت نگار نے اندازِ بیان میں بھی، اور فکر وخیال میں بھی، جدت طرازی کو ملحوظ رکھا ہے۔ جب کہ کہیں بھی احترام میں کوئی کمی نہیں آنے دی ہے۔ جدت اور ندرت کے حوالے سے کچھ شعر ملاحظہ ہوں:

جی چاہتا ہے مدحتِ شاہِؐ اُمم کروں
احوالِ زندگی کو سپُرد قلم کروں
نظر جاتی ہے جب سرکارؐ کے دامانِ رحمت پر
رفو پھر، خود بخود چاک گریباں ہونے لگتا ہے (۲۲)
اب کے برس بھی قریہ جاں میں کھلیں گلاب
اب کے برس بھی سر پہ ''غلامی کا تاج'' ہو
بجھا ڈالیں گے سورج علم کے اہلِ ہوس آ قاؐ
شریکِ جرم دانائی، قلمداں ہونے والا ہے (۲۳)

ریاض حسین چودھری کی اقلیم نعت تاجدار کائنات کی غلامی کے گہرے پانیوں میں ڈوبی ہوئی ہے۔ سرشاری اور سپردگی کا کیف دوام اول سے آخر تک ان کی شعری فضا میں برقرار رہتا ہے

کہ غلامی کا عمامہ باندھے وہ اپنے حضورؐ کی بارگاہ بیکس پناہ میں انفرادی اور اجتماعی مسائل اور مصائب کو پیش کر کے دربارِ مصطفویٰ سے ہدایت کی روشنی کے منتظر رہتے ہیں۔ درحضور کو امید کا آخری مرکز قرار دے کر وہ کائنات کے لیے حضور کے نعلین اقدس کو سائبان کرم سے تعبیر کرتے ہیں۔

ریاضؔ کی نعت بنیادی طور پر اس والہانہ جذبے سے عبارت ہے جو ان کے لیے زادِ سفر اور وسیلۂ بخشش کی حیثیت رکھتا ہے اور انھیں حسانؓ و کعبؓ و حاجیؒ کے قبیلے سے مربوط کرتا ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر ریاض حسین چودھری کی نعت نگاری کے حوالے سے رقم طراز ہیں:

> قیام پاکستان سے قبل صرف گنتی کے چند ہی ایسے معروف شعرا نظر آتے ہیں جنھوں نے مولانا ظفر علی خان یا علامہ اقبال کی مانند عشق رسولؐ کا تخلیقی سطح پر اظہار کیا ہو جب کہ اب گلشن شعر میں ایسی دلکشی ہوا چلی ہے کہ ہر قابل ذکر شاعر ثنائے رسول کو باعث سعادت جانتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ سب کچھ سن کر بھی بعض اوقات نعت ریڈیو اور ٹیلی ویژن تک ہی محدود رہتی ہے لیکن ریاض نام ونمود کے سراب کے لیے سرگرداں نہیں۔ انھوں نے تو نعت گوئی داخلی کیفیات کے زیر اثر اختیار کی ہے۔ اسی لیے وہ مدحتِ رسولؐ کو مقصود فن اور ثنائے رسولؐ ہی کو قبلہ فن جانتے ہیں۔ ریاض دنیا داری کے تقاضوں والے دنیادار شاعر نہیں ہیں۔ اسی لیے انھوں نے خود کو صرف نعت گوئی کے لیے وقف کر رکھا ہے۔ وہ نعت کو توشۂ آخرت تسلیم کرتے ہیں۔ (۲۴)

یہ بات بھی حقیقت پر مبنی ہے کہ ریاض حسین اپنی نعت کو وسیلہ بخشش سمجھتے ہیں جس کا اظہار ان کی نعتیہ شاعری کے متعدد اشعار میں بھی واضح طور پر ہوتا ہے۔ وہ اپنی شاعری میں دولت اور شہرت کے خواہش مند نظر نہیں آتے۔ بلکہ صرف اور صرف بخشش کے طلب گار نظر آتے ہیں:

ریاض اپنی لحد میں نعت کے روشن دیے رکھنا
چمک اٹھے گی قسمت شام رخصت کے دریچوں کی (۲۵)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری ریاض کی نعتیہ شاعری کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ریاض حسین چودھری کو شرفِ نعت گوئی منجانب اللہ ملا ہے، یہ عطیہ خدا وندی اور توفیق الٰہی ہے۔ کسب و ریاضت سے کیا کچھ حاصل نہیں ہو سکتا مگر شرفِ نعت گوئی نہیں یہ صرف اور صرف حضورِ اکرمؐ سے والہانہ اور مجذوبانہ عشق کرنے والوں کو ملتا ہے۔ یہ انھیں وافر مقدار میں میسر ہے۔ ریاضؔ کے اسلوب موضوع اور خیال سب کے سب دلکش و روح پرور ہیں۔ خاص کر ان کی نعتیہ منظومات قلب و روح کے ساتھ ذہن کو بھی خوشگوار حیرت سے ہمکنار کرتی ہیں۔ (۲۶)

حوالہ وحواشی

۱۔ راقم الحروف کا ریاض حسین چودھری سے انٹرویو، بمقام سیالکوٹ، بتاریخ ۲ مارچ ۲۰۱۱ء
۲۔ راقم الحروف کا ریاض حسین چودھری سے انٹرویو، بمقام سیالکوٹ، بتاریخ ۳ مارچ ۲۰۱۱ء
۳۔ احمد ندیم قاسمی، (سرورق)، ''زرِ معتبر''
۴۔ ریاض حسین چودھری، ''خلدِ سخن''، لاہور، القمر انٹر پرائزز، ۲۰۰۹ء، ص: ۵۸
۵۔ ایضاً، ص: ۷۵
۶۔ ایضاً، ص: ۹۳
۷۔ ایضاً، ص: ۱۳۵
۸۔ ایضاً، ص: ۱۴۱
۹۔ ایضاً، ص: ۱۲۷
۱۰۔ ایضاً، ص: ۱۳۸
۱۱۔ ایضاً، ص: ۱۴۸
۱۲۔ ایضاً، ص: ۱۵۲
۱۳۔ ایضاً، ص: ۱۷۰
۱۴۔ ایضاً، ص: ۳۹
۱۵۔ ایضاً، ص: ۳۱
۱۶۔ ریاض حسین چودھری، ''زرِ معتبر''، لاہور، خزینہ علم وادب ۲۰۰۰ء، ص: ۲۷، ۲۸
۱۷۔ ایضاً، ص: ۳۵
۱۸۔ ایضاً، ص: ۴۵
۱۹۔ ایضاً، ص: ۵۹
۲۰۔ ایضاً، ص: ۵۱
۲۱۔ ایضاً، ص: ۱۸
۲۲۔ ایضاً، ص: ۶۲، ۶۳
۲۳۔ ایضاً، ص: ۷۵، ۷۶
۲۴۔ ڈاکٹر سلیم اختر (فلیپ)، ''متاعِ قلم''، از ریاض حسین چودھری
۲۵۔ ریاض حسین چودھری، ''متاعِ قلم''، لاہور، القمر انٹر پرائزز، ۲۰۰۱ء، ص: ۳۲
۲۶۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری (فلیپ) ''کشکولِ آرزو''، از ریاض حسین چودھری، لاہور، القمر انٹر پرائزز، ۲۰۰۲

طفیل ہوشیار پوری کی قومی و مذہبی شاعری پر ایک نظر

طفیل ہوشیار پوری کا اصل نام محمد طفیل ہے جبکہ ان کی شہرت طفیل ہوشیار پوری کے نام سے ہوئی۔ طفیل ضلع ہوشیار پور کی تحصیل گڑھ شنکر کے ایک گاؤں بینے والی میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۳۴ء میں ہوشیار پور سے ہجرت کر کے سیالکوٹ میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ یہاں انھوں نے اپنے بڑے بھائی کے ساتھ مل کر منیجی (حساب کتاب) سکول قائم کیا۔ اس سکول میں سیالکوٹ کے ممتاز تاجران کے شاگرد رہے ہیں۔(1) حُبِ وطن پر مشتمل نظموں اور جنگی ترانوں پر مشتمل ''میرے محبوب وطن'' طفیل کا پہلا شعری مجموعہ کلام ہے۔ جو جنوری ۱۹۶۶ء میں شائع ہوا۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے حرفِ اول لکھا۔ جسٹس ایس۔اے رحمان نے ''پیشِ لفظ'' سید عابد علی عابد نے ''دیباچہ'' اور سید نذیر نیازی نے ''مقدمہ'' اور طفیل نے ''میں خود کہوں تو'' کے عنوان سے اپنی قومی نظموں کا پس منظر بیان کیا۔ پانچواں شعری مجموعہ ''سلام ورثا'' ہے جس میں طفیل نے اہل بیت سے اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے۔ اس کا دیباچہ ڈاکٹر سجاد باقر رضوی نے لکھا ہے۔ ساتواں شعری مجموعہ ''رحمتِ یزداں'' کے نام سے ۱۹۹۲ء میں شائع ہوا۔ یہ نعتیہ اور حمدیہ کلام پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے اس کا مقدمہ اور احمد ندیم قاسمی نے ''طفیل کی نعت نگاری'' کے عنوان سے ان کی نعت پر رائے کا اظہار کیا ہے۔

طفیل نے محض تخیلاتی باتیں نہیں کی ہیں بلکہ حقیقت نگاری کی ہے۔ زندگی کی سچائیوں کو شعر کے پیکر میں ڈھال دیا ہے۔ ان کی شاعری میں بلند حوصلگی اور نصیحت آموز باتیں بھی ہیں۔ جس میں وہ ایک پیغام دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس حوالے حسبِ ذیل اشعار ملاحظہ ہوں:

اکثر اوقات سلگتے ہوئے ماضی کے نقوش
خواب بنتے ہیں خیالات میں ڈھل جاتے ہیں
رکاوٹیں ہی تو منزل کا پیش خیمہ ہیں
یہ پیچ وخم بھی ضروری ہے رہگزر کے لیے(2)

طفیل نے حمد و نعت، گیت اور دوہا، سلام و مراثی میں اپنی شاعری کے جوہر دکھائے ہیں۔علاوہ ازیں ان کی شاعری میں موجودہ دور کی مادہ پرستی پر گہری طنز ملتی ہے۔نت نئے سائنسی اکتشافات نے انسان سے انسان کا رشتہ کمزور کر دیا ہے۔مادی ترقی نے مذہبی و روحانی تقاضوں کو یکسر فراموش کر دیا ہے۔ مذہبی و روحانی تقاضوں کو نظر انداز کر کے کی جانے والی ترقی کو کسی صورت ترقی قرار نہیں دیا جا سکتا۔طفیل نے اس نام نہاد ترقی پر کھل کر اظہار خیال کیا ہے۔کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

ابھی تو خاک کے پردے التفات طلب
ابھی ارادہ تسخیر کائنات نہ کر
ذروں کے جگر چیر دیئے فکر و نظر نے
مستور ہے وہ جلوہ گہ ناز ابھی تک(3)

1 اگست ۱۹۴۷ء کو جب آزادی کا سورج طلوع ہوا تھا۔تو خیال تھا کہ آزادی کے ثمرات سے ہر شخص یکساں طور پر بہرہ ور ہوگا لیکن بدقسمتی سے ایسا نہ ہو سکا اور آج آزادی کی نصف صدی گزر جانے کے باوجود طفیل کے یہ شعر اپنی تمام تر صداقت کے ساتھ ذہن و فکر پر تازیانہ بن کر برستے ہیں۔

طفیل لکھتے ہیں:

طلوع صبح مسرت کو مدتیں گزریں
تجلیوں کو مگر بام و در ترستے ہیں
مسافر تھک گئے ہیں چلتے چلتے
مسافت کا کہیں انجام آئے (4)
پھولوں کے طلب گار تھے ہم موسم گل میں
شعلے سے ہر اک شاخ پہ لہرائے ہوئے ہیں(5)

طفیل ایک محب وطن پاکستانی تھے۔انھوں نے سقوطِ ڈھاکہ پر جہاں اپنی نظموں میں آنسو بہائے۔وہاں نعتوں میں بھی نبی رحمتؐ کے حضور'' دیارِ پاک سے بنگال ہو چکا ہے جدا'' ایسے مصرعے کہہ کر سیاست دانوں کی منافقت کا پردہ چاک کیا ہے۔غزل میں چونکہ ایسے مضامین کو بیان کرنا ممکن نہیں ہوتا۔اس لیے طفیل نے استعارے کے پردے میں اس سانحہ کے ذمہ دار

سیاست دانوں کے غلط طرزِ عمل پر اپنے دلی جذبات کا اظہار کیا ہے۔ کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

جو نا خداؤں کی فکر و نظر سے ڈوبے ہیں
کہاں سے ڈھونڈ کے لاؤں میں ان سفینوں کو
نا خداؤں کا کرم کہیے طفیلؔ
رہ گئی طوفاں میں کشتی ڈول کر (6)
ڈوبتی کشتی کو ساحل پر لگاتے کس طرح
نا خداؤں میں تلاطم آشنا کوئی نہ تھا (7)

طفیل نے اپنی شاعری کے ذریعے پاکستانی قوم کو عالی حوصلگی اور بلند ہمتی کا درس دیا ہے۔ وہ کارزارِ حیات میں مشکلات کے مقابل حوصلہ نہ ہارنے اور عزم فولادی سے مسلح ہونے کا پیغام دیتے ہیں۔ کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

بلند جن کے عزائم ہوں حوصلے بے باک
وہی تو وقت کے دھارے کا رخ بدلتے ہیں(8)

طفیل کی شاعری میں انقلابی آہنگ موجود ہے۔ اس انقلابی آہنگ پر اقبال کے حرکی افکار کی چھاپ نظر آتی ہے۔ کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

تابہ کے جام و سبو کیہ روایات کہن
میکدے میں انقلاب اے پیر میخانہ کوئی
ہاں مہر لگا سکتے ہو تم میرے لبوں پر
زنجیر خیالات کو پہنا نہیں سکتے (9)

طفیل کی شاعری میں عرفان وتصوف کے مضامین کا بیان بھی بکثرت ملتا ہے۔ چند صوفیانہ اشعار ملاحظہ ہوں:

اب نہیں دل میں تمنا کا نشاں تک باقی
آئینہ عکس رخِ یار تک آ پہنچا ہے
دل کے آئینے میں آئے تو نظر آئے طفیلؔ
وہ ہے بے مثل بھلا کیسے مثالوں میں ملے(10)

طفیل محب وطن تھے۔ وطن و مذہب پر جان نچھاور کرنے کا جذبہ رکھتے تھے۔ وہ وطن و مذہب کے سچے بہی خواہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستانی قوم یا ملت اسلامیہ پر کوئی مشکل آتی تو وہ انتہائی رنجیدہ ہوجاتے۔ انھوں نے اپنے پیارے وطن کے لہلہاتے کھیتوں، گیت گاتے آبشاروں ،فلک بوس پہاڑوں ،گل رنگ وادیوں اور حسین لالہ زاروں کے نغمے گائے ہیں۔ جن نظموں میں انھوں نے مادرِ وطن سے اپنی محبت کا اظہار کیا ہے۔ ان میں ان کی رومان پسندی اور حسن پرستی صاف جھلکتی ہے۔ جب وہ وطن کے حسن و دلکشی کی تعریف کرتے ہیں تو یوں لگتا ہے جیسے وہ کسی محبوبہ کے حسن کے جلووں کے سحر میں گرفتار ہوکر اس کی تعریف کر رہے ہوں۔ سید عابد علی عابد ان کی نظموں کی پیکر تراشی کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں: یوں معلوم ہوتا ہے جیسے شاعر نے اپنے وطن کو محبوب نہیں بلکہ محبوبہ بنا دیا ہے۔(11) رومانوی رنگ میں ڈوبے ہوئے طفیل کے قومی اشعار میں وطن کو ایک محبوبہ دل نواز کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ اس حوالے درج ذیل اشعار ملاحظہ ہوں:

مر مریں جسم ،پوشاک دھانی تری
ہے فروغ گلستاں جوانی تری
اللہ اللہ تری نکہت پیرہن
اے نگارِ وطن اے نگارِ وطن (12)

طفیل نے اپنی آنکھوں کے سامنے وطنِ عزیز پاکستان کو بنتے دیکھا۔ وہ ان قربانیوں سے واقف تھے جو حصول آزادی کے لیے مسلمانوں کو دینا پڑی۔ ان کو سینے میں اس سرزمیں سے محبت کا لافانی جذبہ موجزن تھا۔ وہ تعمیر پاکستان کے لیے غیروں کا دست نگر بننے کے بجائے اپنے زور باطن پر بھروسہ کرنے کا عہد کرتے ہیں۔

غیروں کے سہارے ہمیں جینا نہیں آتا
ہم اپنے سدا آپ مددگار رہیں گے
رگ رگ میں رواں کیف مئے حب وطن ہے
تاحشر اس کیف میں سرشار رہیں گے (13)

طفیل اپنی نظموں میں قارئین کو اسلاف کے کارہائے نمایاں سے سبق حاصل کرنے کا درس دیتے بھی نظر آتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر ہم اپنے آباؤ اجداد کی تقلید کو اپنا شعار بنالیں تو کوئی وجہ نہیں ہماری عظمت اور شوکت گم گشتہ پھر سے لوٹ آئے۔ طفیل ہمیں ماضی کی طرف

جھانکنے کی یوں دعوت دیتے ہیں:

ملت کے جوانو تمہیں ملت کی قسم ہے
اجداد کے کردار کی رفعت کی قسم ہے
ماضی پہ تو ڈالو ذرا تحقیق کی نظریں
ماضی کی تمہیں عظمت وسطوت کی قسم ہے(14)

علامہ اقبال کی شاعری قومی و مذہبی مضامین سے بھرپور ہے۔ طفیل کے دور کے تقریباً اکثر شعرا فکرِ اقبال سے متاثر نظر آتے ہیں۔ طفیل کا بھی اقبال سے متاثر ہونا فطری بات تھی۔ پھر اس پر مستزاد یہ کہ طفیل ہوشیار پور سے سیالکوٹ چلے آئے۔ قیامِ سیالکوٹ کے دوران طفیل کو امینِ حزیں سیالکوٹی کی صحبت میسر آئی۔ انھوں نے امینِ حزیں سے باقاعدہ اصلاح بھی لی۔ امینِ حزیں اقبال سے بہت متاثر تھے۔ اولاً اقبال کا اس دور میں چرچا، ثانیاً، امینِ حزیں کی شاگردی اور ثالثاً ان کا قومی شاعری کی طرف میلانِ طبع۔ ان کی قومی و مذہبی شاعری مذکورہ تینوں عناصر سے تشکیل پاتی ہے۔

طفیل کے ہاں اقبال کی فکر کو پیش کرنے کا رنگ درج ذیل اشعار میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے:

عمل کمند ستاروں پہ ڈال سکتا ہے
سمندروں سے جواہر نکال سکتا ہے
عمل کا وقت ہے جذبِ عمل میں ڈھل جاؤ
رہِ وفا میں صفیں باندھ کر نکل آؤ (15)

۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کو بھارت اپنے شرپسند جارحانہ عزائم کی تکمیل کے لیے رات کی تاریکی میں وطنِ عزیز پاکستان پر چڑھ دوڑا۔ جہاں ہماری بہادر افواج نے ہر محاذ پر دشمن کے دانت کھٹے کیے وہاں ہمارے شعرا نے جہاد بالقلم کے ذریعے اس جنگ میں بھرپور حصہ لیا۔ طفیل نے بھی اس کڑے وقت میں اپنی نظموں اور ترانوں کے ذریعے اپنی جاں باز اور سرفروش افواج کا خون گرمایا۔ کون ہے جس نے ان کا مشہور زمانہ ترانہ ''توحید کا پرچم لہرایا'' نہ سنا ہو۔ یہ ترانہ سن کر خود بخود جذبہ شوقِ شہادت مچلنے لگتا ہے۔ بڑے اعزاز کی بات ہے کہ ہماری پاک افواج اس ترانے کی دھن پر مارچ پاسٹ کرتی ہے۔ طفیل کو زندہ رکھنے کی لیے یہ ترانہ ہی کافی ہے۔ اسی ترانے کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

سر رکھ کے ہتھیلی پر آنا
ہے ظلم سے تجھ کو ٹکرانا
ایمان کا ہے رکھوالا تو
اسلام کا ہے متوالا تو
ایمان ہے تیرا سرمایہ
اے مردِ مجاہد جاگ ذرا (16)

طفیل شاعری کی قوم و مذہب سے محبت کا مخزن ہے جسکی اہم خوبی ان کا رجائی اسلوب ہے۔ وہ کسی بھی مشکل مرحلے پر یاس و ناامیدی کا تاثر نہیں دیتے۔ ان کی شاعری میں مایوسی کا نام ونشان دکھائی نہیں دیتا۔ ان کی شاعری ایک خوشحال، دل کش اور روشن پاکستان کی منظر کشی کرتی ہے۔ ان کے اشعار میں پاکستانیت کا عنصر بھی جگہ جگہ ملتا ہے۔

ہوں گی نہ اب خزاں کی کہیں چیرہ دستیاں
سونے کے گھر بنائیں گے چاندی کی بستیاں(17)

انہوں نے مسلمانوں میں اتحاد و یگانگت کی تبلیغ کی اور ہمیشہ مسلم امت کے درمیان فرقہ وارانہ تعصّبات کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے پر زور دیا کیونکہ یہی عالم اسلام کی سلامتی اور استحکام کا راز ہے۔ وہ مسلمانوں کو آپس میں برسرِ پیکار رہنے کے بجائے گردش حالات کی رفتار پہنچاننے کا پیغام دیتے ہیں۔ وہ مسلمانوں کو عالم کفر میں ان کے خلاف کی جانے والی سازشوں سے باخبر کرتے ہیں:

امتیازات رنگ و نسب سب غلط
نفرت انگیزیوں کے یہ ڈھب سب غلط
جذب اثیار سے حسن کردار سے
عام رنگِ اخوت کرو دوستو
ایک اللہ ہے ایک قرآن ہے
ایک ہادیؐ ہے ایک اس کا فرمان
مختلف راستے کس لیے ہو گئے
سوچنے کی تو زحمت کرو دوستو(18)

مشتعل گردش ایام ہے کچھ فکر کرو
دوستو حشر کا ہنگام ہے کچھ فکر کرو
کس کو معلوم سحر آئے گی کس عالم میں
خون آلود رخ شام ہے کچھ فکر کرو
سازش کفر ہے ہر بزم میں سرگرم عمل
اک جہاں دشمنِ اسلام ہے کچھ فکر کرو(19)

کشمیر پاکستان کی شہہ رگ ہے۔کشمیر کا تنازعہ قومی مسئلہ ہے۔کشمیری مسلمانوں پر بھارتی افواج نے عرصہ حیات تنگ کر رکھا ہے۔کئی شعرا خصوصا سیالکوٹ کے شعرا نے اپنی شاعری میں کشمیر پر بھارتی تسلط اور ظلم وتشدد کا تذکرہ کیا ہے اور اس کی بھرپور مذمت کی ہے۔ طفیل نے بھی کشمیر پر خوب صورت نظمیں کہی ہیں۔وہ اپنی نظموں میں کشمیر کے پاؤں میں پڑی ہوئی زنجیر کا شر دہ سناتے ہیں۔ان کی نظم''اے وادی کشمیر'' سے ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے :

اے وادی کشمیر
ہر رنگ میں ہم کر کے رہیں تجھے تسخیر
اے وادی کشمیر
اللہ کا فرمان ہے ایمان ہمارا
ہم سے تو یہی کہتا ہے قرآن ہمارا
جنت کبھی ہو سکتی نہیں کفر کی جاگیر
اے وادی کشمیر(20)

علامہ اقبالؒ نے اپنی شاعری میں مغربی تہذیب پر تنقید کی ہے۔طفیل نے بھی طنز کے حربے استعمال کرتے ہوئے ان عوامل پر روشنی ڈالی ہے۔جن کے باعث مسلمان قوم اسلامی تہذیب وتمدن سے بیزار ہوتی جارہی ہے اور اپنے گلے سے مغربی تہذیب کی غلامی کا جوا اُتار پھینکنے پر تیار نہیں۔

طفیل لکھتے ہیں:

حقیقتوں پہ ہے مبنیہ بات اے اقبال
ملی ہے مغربی تہذیب میں ہمیں تو پناہ

حدیث ساغر و مینا ہو جب متاعِ حیات
کہاں سے آئے صدا لا الہ الا اللہ (21)
ہمارا دل نہ کیوں تہذیب نو سے روشنی لیتا
نئی تعلیم سے آنکھیں چُرا لینا تھا نادانی
نہ کیوں دل جلوہ افرنگ سے مسحور ہو جاتے
فرنگی شیشہ گر کے فن سے پتھر ہو گئے پانی (22)

طفیل کی شاعری میں مذہبی اور قومی رنگ نمایاں ہے۔ان کی قومی و مذہبی شاعری کا ایک دھارا ان کا وہ کلام ہے۔جس میں انھوں نے اخلاقیات کی تعلیم دی ہے۔ان کی اخلاقی شاعری کا منبع و مصدر سراسر اسلامی تعلیمات ہیں۔وہ اللہ تعالیٰ سے لو لگانے اور اس کے حضور سجدہ ریز ہونے کا درس دیتے ہیں۔انھوں نے اپنی شاعری میں دنیا کی بے ثباتی اور ناپائیداری کا مضمون بارہا باندھا ہے۔

تم رشتہ جاں رب جہاں سے رکھو
تم ربط نہاں سر نہاں سے رکھو
یہ عمر رواں ساتھ نہ دے گی ہرگز
اُمید نہ کچھ عمر رواں سے رکھو (23)
اللہ سے ڈر بندہ الحاد نہ بن
پیرو نہ ہو فرعون کا شداد نہ بن
نمرود کی تقلید کو ایماں نہ بنا
قارون زمانہ کا تو ہمزاد نہ بن (24)

طفیل نے مرثیے کو عمل خیر کا پیغام بنانے کے لیے طفیل نے مرثیے سے محض رونے دھونے کا نام نہیں دیتے۔بلکہ ان کے نزدیک مرثیے کا اصل مقصود اس پیغام کے اصل مدعا تک پہنچنا ہے جس کا امام حسین نے کربلا کی سرزمین پر اپنے اہل وعیال کی قربانی کی شکل میں عملی نمونہ پیش کیا ہے۔ایک مرثیے کے دو بند ملاحظہ ہوں:

واقعات کربلا کوئی لب پہ لائے کیا
بیتی ہے کیا حسینؓ پر اب بھی کوئی بتائے کیا

اہل سوز و ساز کو اشک خوں رلائے کیا
ظلم اور جور کی داستاں سنائے کیا
راہ حق میں لُٹ گیا قافلہ حسین کا
خیرو شر کی جنگ تھی کائنات دنگ تھی
آسمان دور تھا اور زمین تنگ تھی
کربلا کی خاک تھی اور خون رنگ تھی
لشکر یزید کے دل کبیہ امنگ تھی
حق میں ہو یزید کے فیصلہ حسینؓ کا (25)

حمد نگاری، نعت نگاری، بلند حوصلگی کا درس، انفاق فی سبیل اللہ کی ترغیب، بے ثباتی دہر اور رنگینی دہر میں نہ کھونے کا سبق اور اخلاقی پند و نصائح طفیل کے دوہوں کے اہم موضوعات ہیں ۔ان کے دوہوں میں پاکستان کے معاشرتی و سیاسی حالات کے حوالے سے عصری شعور بھی جھلکتا نظر آتا ہے۔ کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

ہر بندہ ہے ایک مسافر دنیا ایک سرائے
سانجھ سویرے لگا ہے تانتا اِک آئے اِک جائے
پگ پگ پر ہیں سندریوں نے روپ کے جال بچھائے
روپ نگر سے کوئی مسافر بچ کر کبھی نہ جائے (26)

پگ پگ سندر سندر مکھڑے پگ پگ نین کٹورے
رس چھلکا چھلکا کر ڈالیں دل پر پیار کے ڈورے
سچائی کا مول نہ کوئی جھوٹ کی جے جے کار
بے ایمان کو کہے زمان آج دیانت دار (27)

حوالہ جات

1۔زاہدہ پروین رضوی،"طفیل ہوشیار پوری" مقالہ برائے ایم ۔اے اردو ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور ،۱۹۸۸ء،ص:۸

2۔طفیل ہوشیار پوری،شعلہ جام پر ایک نظر،مشمولہ''شعلہ جام''از طفیل ہوشیار پوری ،احسان اکیڈمی،لاہور ،۱۹۷۸ء،ص:۲۰۱،۲۰۲

3۔طفیل ہوشیار پوری،شعلہ جام پر ایک نظر،ص:۲۱۲

4۔طفیل ہوشیار پوری،شعلہ جام پر ایک نظر،ص:۴۰،۴۱

5۔طفیل ہوشیار پوری،شعلہ جام پر ایک نظر،ص:۱۵۴

6۔شعلہ جام پر ایک نظر،ص:۱۳۱،۱۳۲

7۔ہوشیار پوری،شعلہ جام پر ایک نظر،،ص:۸۹

8۔شعلہ جام پر ایک نظر،،ص:۱۹۶،۱۹۷

9۔شعلہ جام پر ایک نظر،،ص:۱۰۸،۱۰۹

10۔ہوشیار پوری،شعلہ جام پر ایک نظر،،ص:۶۶،۶۷

11۔سید عابد علی عابد،دیباچہ''مشمولہ''محفل طفیل ہوشیار پوری نمبر،ص:۱۲۲

12۔طفیل ہوشیار پوری،میرے محبوب وطن،لاہور،احسان اکامی،۱۹۷۷ء،ص:۱۵

13۔ایضاً،ص:۲۳

14۔ایضاً،ص:۱۰۸

15۔ایضاً،ص:۵۶

16۔ایضاً،ص:۶۶

17۔ایضاً،ص:۵۳،۵۴

18۔ایضاً،ص:۹۹

19۔ایضاً،ص:۱۱۸

20۔طفیل ہوشیار پوری،اے وادی کشمیر،مشمولہ" جاگ رہا ہے پاکستان"،ص:۴۶۷

21۔طفیل ہوشیار پوری،تجدید شکورہ،احسان اکادمی،لاہور،۱۹۸۷ء،ص:۶۷

22۔ایضاً،ص:۶۸

23۔طفیل ہوشیار پوری،جامِ مہتاب،احسان اکیڈمی،۱۹۷۵ء،لاہور،ص:۳۰

24۔ایضاً،ص:۴۶

25۔ایضاً،ص:۱۲۹

26۔طفیل ہوشیار پوری،" سوچ مالا" ،احسان اکیڈمی،لاہور،۱۹۹۱ء،ص:۴۳

27۔ایضاً،ص:۴۹

علامہ اقبال اور دیگر ادبی مشاہیر کی رثائی شاعری

مرثیہ (1) ایسی نظم کو کہتے ہیں جس میں وفات پانے والی شخصیت کی صفات بیان کی جاتی ہیں۔ اردو مرثیہ ایک ایسی صنف ادب ہے جس میں کربلا کے حالات و واقعات پیش کئے جاتے ہیں۔ بالخصوص حضرت امام حسین ؓ اور ان کے خانوادے کی شہادت کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔ مرثیہ میں کسی مذہبی، قومی پیشوا یا کسی محبوب شخصیت کی موت پر غم کا اظہار بھی کیا جاتا ہے اور اس کی خوبیاں اس طرح بیان کی جاتی ہیں کہ قارئین بھی متاثر ہوں۔ مرثیہ کے لئے کسی مخصوص ہئیت یا ترتیب قوافی کی کوئی شرط نہیں۔ قصیدہ، مثنوی، رباعی، مربع، مخمس، مسدس، ترجیع بند، ترکیب بند غرض کہ شاعر جس ہئیت میں چاہے مرثیہ تحریر کرسکتا ہے۔ اردو ادب میں مرثیے کا ایک خاص مفہوم بھی ہے یعنی شہدائے کربلا کا مرثیہ خود ایک نہایت وقیع صنفِ ادب کی حیثیت سے اپنا مقام منوا چکا ہے۔

مرثیہ گوئی کی روایت میں ایک بڑا نام فرزندِ سیالکوٹ علامہ اقبال کا بھی ہے۔ اقبالؒ نے بھی مرثیہ نگاری میں اپنے تخلیقی جوہر پیش کئے ہیں۔ ان کے ہاں شخصی مرثیے کا اظہار زیادہ ہے جیسا کہ 1905ء میں داغ کی وفات پر انہوں نے 23 اشعار پر مشتمل ایک مختصر مرثیہ لکھا جو ایجاز و اختصار، رمز و کنایہ، تاثیر و بلاغت اور دیگر شعری محاسن سے مزین ہے۔ علامہ اقبالؒ نے اپنے مخصوص طرزِ سخن کو بروے کار لاتے ہوئے داغ کی جذبات نگاری کو بہترین خراج تحسین پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ ان کا مرثیہ "والدہ مرحومہ کی یاد میں" اردو مرثیے کے حوالے سے ایک اہم اثاثہ ہے۔ یہ نظم انہوں نے اپنی والدہ کی وفات پر ان کی یاد میں لکھی۔ اقبالؒ کی شعری دنیا میں شخصی مرثیوں کے علاوہ کربلا کا شعوری سفر اپنے لامحدود تناظر کے ساتھ موجود ہے۔ اقبالؒ نے اپنے مفرد اشعار میں "حسین ؓ" اور "شبیری" کے استعارے کے ذریعے شہادت کے اثرات و رموز اور معنویت کو اجاگر کیا ہے۔ ان کی یہ فکر روایت سے ہٹ کر تھی اگرچہ اقبالؒ نے مختلف نظموں اور غزلوں میں فرزندِ سیدہ زہرہ اور شہدائے کربلا کی لازوال قربانی کا ذکر کیا ہے تاہم

اشعار کا ایک تسلسل" درمعنی حریت اسلامیہ وسر حادثہ کربلا" کے عنوان کے تحت علامہ اقبالؒ نے" رموز خودی" میں قلم بند کیا ہے۔اقبالؒ امام حسین کوظلم واستبداد کے خلاف ایک مثالی کردار بنا کر پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ آپ نے قیامت تک ظلم واستبداد کے راستے بند کرتے ہیں۔ اقبالؒ واقعہ کربلا کے حوالے سے لکھتے ہیں:

حقیقت ابدی ہے مقام شبیری
بدلتے رہتے ہیں انداز کوفی و شامی2

اقبالؒ کی شاعری میں امام حسین اور کربلا،ظلم وستم کے خلاف استقامت اور اسلام کے حقیقی رہبر کی نشان دہی کا ایک استعارہ ہے۔وہ کربلا اور امام عالی مقام کوحق ووحدت کا معیار اور حق و باطل کی میزان قرار دیتے ہیں۔وہ اس واقعے کے بنیادی کردار حضرت حسین کے صبر کو عشق کا نشانِ راہ مانتے ہیں۔صدقِ خلیل،صبر حسین اور معرکہ بدر وحنین یہ سب کچھ اقبالؒ کے نزدیک ایمان وعشق کی کیفیات کا عملی مظہر ہے۔

صدقِ خلیلؑ بھی ہے عشق،صبر حسین بھی ہے عشق
معرکہ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق3

اقبالؒ جہاں واقعہ کربلا کے حماسی اور انقلابی پہلو کو انتہائی پہلو کو انتہائی خوب صورت انداز میں بیان کرتے ہیں:

غریب و سادہ و رنگین ہے داستانِ حرم
نہایت اس کی حسینؓ، ابتدا ہے اسمٰعیلؑ 4

اقبالؒ بال جبریل میں بیان کرتے ہیں:

اک فقر سکھاتا ہے صیاد کو نخچیری
اک فقر سے کھلتے ہیں اسرار جہاں گیری
اک فقر سے قوموں میں مسکینی و دل گیری
اک فقر سے مٹی میں خاصیت اِکسیری
اک فقر ہے شبیری اس فقر میں ہے میری
میراث مسلمانی ،سرمایہ شبیری!5

واقعہ کربلا نے ہر بڑے ادیب وشاعر کو متاثر کیا۔اہل بیت سے محبت ہر مسلمان کے

ایمان کا مرکز و محور ہے۔ مولانا ظفر علی خاںؒ نے اپنی اس محبت کا اظہار میدان کربلا میں امام حسینؑ کی شجاعت کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے یوں بیان کرتے ہیں:

اک وہ بھی حسین ابن علی تھا کہ سر اس نے
مر کر بھی نہ فاسق کی حضوری میں جھکایا
خود چل کے گیا معرکہء کرب و بلا میں
دنیا کو قیامت کا سماں جس نے دکھایا
تھا سینہ سپر ایک ہزاروں کے مقابل
باطل کے اس انبوہ نے اس کو نہ ڈرایا6

اردو ادب میں رثائی شاعری زیادہ تر سانحہ کربلا تک محدود رہی۔ تاہم بعض شعرا نے اپنے اعزہ واحباب کی وفات پر شخصی مرثیے کہہ کر اپنے غم والم کا اظہار کیا ہے۔ مولانا ظفر علی خان ؒ نے اپنے بھائی کی وفات مرثیہ کہا:

میں آج سنانے کو ہوں مژگاں کی زبانی
پہلو میں گداز جگر و دل کی کہانی
کرنا ہے مجھے آج جواں بھائی کا ماتم
بنیاد فلک ہے مجھے منظور ہلانی
وہ شمع کہ تھا اس سے مرے گھر میں اجالا
صرصر کو نہ لازم تھا سر شام بجھانی7

فیض احمد فیض نے ایک شاہکار مرثیہ لکھ کر مرثیہ نگاری کی روایت میں اپنا حصہ ڈالا ہے۔ فیض احمد فیض شب عاشور کے حوالے سے یوں بیان کرتے ہیں:

رات آئی ہے شبیر پہ یلغار بلا ہے
ساتھی، نہ کوئی یار، نہ غم خوار رہا ہے
مونس ہے تو ایک درد کی گھنگھور گھٹا ہے
مشفق ہے تو اک دل کے دھڑکنے کی صدا ہے
تنہائی کی ،غربت کی ، پریشانی کی شب ہے
یہ خانہ شبیر کی ویرانی کی شب ہے8

حکیم خلیق حسین ممتاز کے تخلیقی وجدان کو واقعہ کربلا سے گہری مناسبت ہے۔اس لئے واقعہ کربلا ان کی شعری شناخت کا اہم حصہ بن گیا ہے۔انہوں نے شعر کو کربلا کے پس منظر سے لفظی اور معنوی سطح پر ایک نئے اسلوب اظہار کے فن کدے سے روشناس کرایا ہے۔سخن وری میں زود گوئی ان کی فطرت کی حصہ رہی ہے جملہ اصناف سخن میں ان کا قلم یکساں رواں ہے۔حمد ،نعت،سلام،منقبت،غزل،مسدس،مرثیہ،قطعہ،رباعی،نظم،نوحہ،سہرا اور رخصتی میں قلم موزوں نظر آتا ہے۔حکیم ممتاز کا ادبی سفر طویل ہے۔سیالکوٹ میں مشاعروں میں شمولیت کے سبب بہت ساری غزلیات لکھیں۔ان غزلیات میں بھی لفظ کے پس پردہ کربلا کا عکس لاشعوری طور پر جھلکتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

ہے میرے سر پہ مصائب کا آسمان کھلا
زمیں کے ساتھ ہے میرا بھی امتحاں کھلا9

ہیچ ہے ان کے سامنے ہر ظلم
جو رہِ کربلا میں رہتے ہیں 10

قریہ جاں پہ لہو رنگ فضا طاری ہے
مقتل ہجر ہے جذبوں کی عزاداری ہے11

کون آیا سر مقتل ممتاز
آج قاتل کا دل بھی ڈوبتا ہے12

غزل میں مہارت کے باوجود حکیم ممتاز حبِ اہل بیت کی وجہ سے سلام اور مرثیہ کی طرف زیادہ راغب رہے اور 300 کے قریب سلام اور چند مرثیے بھی لکھے جو تا حال غیر مطبوعہ ہیں ۔حمد،نعت،منقبت اور سلام پر ایک مجموعہ "تقلید مؤدت" 2014ء میں شائع ہوا۔ سلام کے چند منتخب اشعار پیش کئے جاتے ہیں:

عظمت شاہ شہیداں کو سلام
جس نے دکھلایا بقا کا رستہ13

اس شان سے شہید ہوئے کربلا میں آپ
قربان گاہِ عشق کو حیران کر دیا 14

سید زاہد حسین بخاری کی پہچان نعت گو شاعر کے طور پر ہے لیکن انہیں مرثیہ و سلام میں

بھی ملکہ حاصل ہے۔سید بخاری نے آٹھ مرثیے لکھے ہیں جن میں سے ایک مرثیہ غیر مطبوعہ ہے۔سرخیِ خونِ شہیداں کے عنوان سے 2019ء میں سات مرثیوں پر مشتمل مجموعہ شائع ہوا۔ان مراثی کے عنوانات درج ذیل ہیں۔

1۔سجدہ شبیری 2۔مفارقت 3۔امن وسلامتی 4۔عدل واحسان 5۔کعبہ واہل بیت 6 معجزہ 7۔جناب رقیہ بنت علی۔آٹھواں مرثیہ قرآن واہل بیت کے عنوان سے لکھا گیا ہے۔سید بخاری کا سب سے پہلا مرثیہ خاصہ طویل ہے اور 170 بندوں پر مشتمل ہے۔یہ "سجدہ شبیری" کے نام سے 1996ء میں منظر عام پر آیا تھا۔اس میں احمد ندیم قاسمی اور سرور انبالوی جیسے شعرا نے اپنے تاثرات قلم بند کئے ہیں۔اس مرثیے کا ایک بند پیش کیا جاتا ہے جس میں صبح عاشور امام حسین کی اقتدا میں جاں نثاروں کی نماز فجر ادا کرنے کا منظر کھینچا گیا ہے:

پیدا ہوا ہے دل میں گداز اور زیادہ
رقت سے ہوا لطفِ نماز اور زیادہ
جھکنے لگی پیشانی ناز اور زیادہ
خالق سے ہوئے رازو نیاز اور زیادہ
روحوں میں عبادت کا سرور اور زیادہ
چہروں پہ اتر آیا ہے نور اور زیادہ 15

سید زاہد حسین بخاری کے مرثیے میں کربلا کے کرداروں کا بیان بھی وضاحت سے ملتا ہے۔یوں سید بخاری بطور مرثیہ نگار بیک وقت خارجی اور داخلی دونوں پہلوؤں پر یک ساں تخلیقی حسن کا مظاہرہ کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

سیالکوٹ میں مرثیہ نگاری میں ایک نمایاں نام رشید آفریں کا ہے۔ان کے سات شعری مجموعے شائع ہو کر قبولیت کی سند حاصل کر چکے ہیں۔رشید آفریں نے مذہبی اعتقادات کے مضامین کو تقدس اور احترام کے سارے لوازمات سمیت اپنے شعروں میں جگہ دی ہے۔ان کی شاعری میں مذہب اور ایمان کی لہریں ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔حمد،نعت،منقبت اور مرثیہ نگاری جیسی اصنافِ سخن کی تخلیق میں جوش وجذبے کی بہتات کے ساتھ فنی پختہ کاری نمایاں ہے۔

رشید آفریں کے چند اشعار درج ہیں:

چار سو ہیں امام کی باتیں
سبطِ خیر الانام کی باتیں
لب پر قرآن سر تھا نیزے پر
شاہ کے اس قیام کی باتیں
اس کے جہاد کو خدا کیوں نہ کرے پسند
جس کی صفوں میں ایک پسر شیر خوار ہے
ڈوبا ہوں آفریں غمِ اہل بیت میں
جس کے اثر سے روح بھی میری نڈھال ہے16

سیالکوٹ کے معروف شاعر سید عدید نے 19 بندوں پر مشتمل ایک مرثیہ لکھا ہے۔ یہ بڑا جان دار مرثیہ ہے جو قاری کے دل کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ اس سننے والا انسان متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

سید عدید لکھتے ہیں:

خدّامِ خاص، خاص برادر چلے گئے
عون و محمد اور علی اصغر چلے گئے
قاسم چلے گئے ،علی اکبر چلے گئے
مقتل میں ایک دن میں بہتر چلے گئے
کاندے پہ سب کے لاشے اٹھائے حسین نے
وعدے رسول کے تھے نبھائے حسین نے 17

تعظیمِ خاکِ کرب وبلا چاہتے تھے آپ
بے بس نہیں تھے رب کی رضا چاہتے تھے
کیا پوچھتے ہو مجھ سے کہ کیا چاہتے تھے آپ
دینِ محمدی کی بقا چاہتے تھے آپ
عظمت ہے یہ دلیل امامِ شہید کی
بیعت حسینی کرتے نہیں ہیں یزید کی18

جب روضہء رسول سے رو کر چلے حسین
دربار بھائی اشکوں سے دھو کر چلے حسین
کیسے جدا بتول سے ہو کر چلے حسین
کتنے گہر لڑی میں پرو کر چلے حسین
یہ سوچ کر تو روتے تھے سبطِ رسول ﷺ بھی
اس قافلے میں ساتھ ہے بنت بتول بھی 19

سید عدید کے ان اشعار میں بلندیِ مضمون اور خوبیِ زبان واضح ہے۔ان کے ہاں تخلیقی عمل میں شعور کے ساتھ ساتھ لاشعور کی کارفرمائی بھی نظر آتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں کربلا سے متعلق بالواسطہ اشعار بھی ہیں اور بلاواسطہ اشعار بھی۔انہوں نے غزل گو شاعر ہونے کے باوجود اپنی پہچان بنائی ہے۔

سیالکوٹ کے جن شعرا نے واقعہ کربلا کے تناظر میں سلام و مرثیہ کو اپنی شاعری میں ایک مستقل موضوع کے طور پر اختیار کیا، ان میں اعجاز عزائی، سید اقبال رضوی، ڈاکٹر راشد شیرازی کے نام نمایاں ہیں۔سیالکوٹ میں پروفیسر ضمیر حیدر نقوی بھی فروغِ مرثیہ کے لیے قابل تحسین خدمات انجام دے رہے ہیں۔ان شعرائے کرام نے اس واقعہ اور اس کی جزئیات کو معنوی توسیع وتقلیب عطا کرنے کے ساتھ ساتھ غزل کے فنی محاسن کو مجروح نہ کرتے ہوئے، کربلا کی لفظیات کی مؤثر اور معنی خیز استعمال کر کے شاعری میں نئی وسعت کے امکان روشن کئے جس سے سیالکوٹ کی علمی فضا میں تخلیق ہونے والے مرثیے میں اردو شاعری کی مختلف اصناف کا رنگ ایک دھنک کی صورت میں نظر آتا ہے۔مرثیہ گو شعرا کے ساتھ ساتھ سیالکوٹ کے کچھ غزل گو شعرا ایسے بھی ہیں جن کے لئے واقعہ کربلا شعری شناخت نامے کی حیثیت رکھتا ہے۔ان غزل گو شعرا نے اپنے کلام میں واقعہ کربلا مختلف کیفیتوں، متعدد ابعاد اور ان گنت شکلوں کے ساتھ کچھ اس انداز میں سمویا ہے کہ یہ واقعہ ان کے کلام کی پہچان قرار پا گیا ہے۔ان کے چند اشعار بطور مثال نذر قارئین ہیں:

محمود حیدر پیر زادہ لکھتے ہیں:

لائے کہاں سے ڈھونڈ کے کس کی مجال ہے
دنیا میں بے مثال محمدؐ کی آل ہے

پورے جہاں میں ایک درِ اہل بیت ہے
جینا کمال ہے جہاں مرنا کمال ہے
دراصل کائنات میں آلِ رسول ہیں
جن کے لہو سے دیں کا تنفس بحال ہے20

اعجاز عزائی لکھتے ہیں:

وہ کس کا باپ ساقی کوثر ہے یاد کر
کرب و بلا میں تشنہ دہن کس کا لال ہے21

واقعہ کربلا تاریخ کا ایک ایسا بڑا سانحہ ہے جس نے ہر بڑے ادیب و شاعر کو متاثر کیا۔ یہ حق و باطل کے درمیان ایک ایسا معرکہ تھا جس میں حق کی کمان حسینؓ ابنِ علیؓ کے پاس تھی۔ اہلِ بیت سے محبت ہر مسلمان کے ایمان کا حصہ ہے۔ مولانا ظفر علی خان بھی نواسۂ رسولؐ سے محبت کا اظہار میدانِ کربلا میں امام حسینؓ کی بہادری اور شجاعت اس طرح بیان کرتے ہیں:

اک وہ بھی حسینؓ ابنِ علیؓ تھا کہ سر اس نے
مر کر بھی نہ فاسق کی حضوری میں جھکایا
خود چل کے گیا معرکۂ کرب و بلا میں
دنیا کو قیامت کا سماں جس نے دکھایا
تھا سینہ سپر ایک ہزاروں کے مقابل
باطل کے اس انبوہ نے اس کو نہ ڈرایا22

اردو شاعری میں مرثیے کی صنف زیادہ تر سانحہ کربلا کے بیان تک محدود رہی تاہم بعض شعرا نے اعزہ و احباب کے مرنے پر تاریخی قطعوں کے علاوہ شخصی مرثیے کہہ کر اپنے غم و الم کا اظہار کیا ہے۔ مولانا ظفر علی خان نے اپنے والد، بھائی محمد اکرم خان، سید محمود، نواب داغ دہلوی، مولانا گرامی، سر فضل حسین، لاجپت رائے، ڈاکٹر مختار انصاری، مولانا محمد علی جوہر اور علامہ اقبال کی وفات پر مرثیے تحریر کئے ہیں۔ مولانا ظفر علی خاں نے اپنے بھائی کی وفات پر مرثیہ بھی کہا جس کے کچھ اشعار حسبِ ذیل ہیں۔

میں آج سنانے کو ہوں مژگاں کی زبانی
پہلو میں گداز جگر و دل کی کہانی

کرنا ہے مجھے آج جواں بھائی کا ماتم
بنیاد فلک ہے مجھے منظور ہلانی
وہ شمع کہ تھا اس سے مرے گھر میں اجالا
صرصر کو نہ لازم تھا سر شام بجھانی23

طفیل ہوشیار پوری نے غزل، نظم گیت کے ساتھ ساتھ مرثیہ بھی لکھا ہے۔ مرثیے کو عمل خیر کا پیغام بنانے کے لیے طفیل نے مرثیے سے صرف رونے رلانے کا کام نہیں لیا۔ بلکہ ان کے نزدیک مرثیے کا اصل مقصد اس پیغام کی روح کو سمجھنا ہے جو امام حسین نے سرزمین کربلا پر اپنے اہل خاندان اور مخلص ساتھیوں کی قربانی کی صورت میں پیش کیا ہے۔ ایک مرثیے کے دو بند درج ذیل ہیں:

راہ حق میں لُٹ گیا قافلہ حسین کا
خیرو شر کی جنگ تھی کائنات دنگ تھی
آسمان دور تھا اور زمین تنگ تھی
کربلا کی خاک تھی اور خون رنگ تھی
لشکر یزید کے دل کبیہ امنگ تھی
حق میں ہو یزید کے فیصلہ حسینؓ کا 24

غزل گو شاعر ایوب صابر کے ہاں بھی رثائی شاعری کے عناصر بدرجہ اتم موجود ہیں۔ ان کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

چشم فلک نے دیکھا ہے جذبہ حسین کا
صبرو رضا ہی ٹھہرا ہے لہجہ حسین کا
کربل کی ریت کو ہے مصلّیٰ بنا لیا
بھاری ہے ساری قوم پہ سجدہ حسین کا
مغلوب کرنے آئے جو عبرت نشاں بنے
قائم ہے آج تک یہاں غلبہ حسین کا25

طاہر شادانی نے رثائی نظمیں لکھیں جن میں ادبی قومی اور علمی مشاہیر کی وفات پر اظہار کیا گیا ہے۔ شادانی نے جن شخصیات کے مرثیے لکھے ان میں اقبالؒ محمد علی جناح، مولانا ظفر علی

خانؒ ،مولانا مودودی ،عبدالمجید سالک ، پروفیسر حمید احمد خان ،مولانا صلاح الدین ،احسان دانش،محمد طفیل (مدیر نقوش) اور ان کی والدہ مرحومہ اہم ہیں ۔شادانی نے قومی وملی اور ادبی شخصیتوں کو اس لیے موضوع بنایا ہے کہ ان کے دل میں قوم کا درد موجود ہے۔ان کے مرثیوں میں موزونی الفاظ خاص طور پر متاثر کن ہیں۔وہ شخصیات کے شایان شان الفاظ استعمال کرتے ہیں۔

حواشی وحوالہ جات

1۔ مرثیہ عربی زبان کا لفظ ہے۔مرثیے کا لفظ رثا سے نکلا ہے۔"رثا" کے معنی وفات پانے والے فرد پر غم والم کا اظہار کرنا اور اس کی خوبیاں بیان کرنا ہے۔مرثیہ کی صنف عربی ادب سے فارسی ادب اور فارسی ادب سے اردو ادب میں آئی ہے۔اردو ادب میں بہت سی عظیم شخصیات کے مرثیے پائے جاتے ہیں۔

2۔ علامہ اقبال،کلیاتِ اقبال،اقبال اکادمی، پاکستان،لاہور،2009ء،ص۔398

3۔ ایضاً،ص۔439

4۔ ایضاً،ص،391

5۔ ایضاً،ص۔490

6۔ مولانا ظفر علی خان،حبسیات،مولانا ظفر علی خان ٹرسٹ،لاہور،2008ء،ص،97

7۔ مولانا ظفر علی خان،کلیاتِ ظفر علی خان(بہارستان)،الفیصل ناشران،لاہور،2007ء،ص،566

8۔ فیض احمد فیض،نسخہ ہائے وفا،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،دہلی،1986ء،ص،215

9۔ خلیق حسین ممتاز،اساس فکر،طٰہٰ پبلی کیشنز،لاہور،2005ء،ص،52

10۔ ایضاً،ص58

11۔ ایضاً،ص66

12۔ ایضاً،ص158

13۔ خلیق حسین ممتاز،فکر مؤدت،اردو بازار لاہور،2014ء،ص114

14۔ ایضاً،ص158

15۔ سید زاہد حسین بخاری،سرخی خون شہیداں،سرخیِ خون شہیداں اردو بازار،لاہور،ص،70

16۔ رشید آفریں،فخر دو عالمؐ،الحمد پبلی کیشنز لاہور،2013ء،ص،145

17۔ سید عدید،پیار بے اختیار ہوتا ہے،الحمد پبلی کیشنز،لاہور،1999ء،ص۔150

18۔ ایضاً،ص۔130

19۔ ایضاً،ص۔135

20۔ محمود پیرزادہ،مسودہ(کمالِ کن)،زیر طبع،انٹرویو،24دسمبر 2021ء

21۔ اعجاز عزائی،مسودات،عزائی،اعجاز عزائی کے کافی مسودات ہیں جو زیر طبع ہیں۔انٹرویو:محمود حید

ر پیرزادہ،24دسمبر 2021ء

22۔ ظفر علی خاں، ''کلیاتِ ظفر علی خاں''(بہارستان)،لاہور:الفیصل ناشران،2007ء،ص۔38

23۔ ظفر علی خاں، ''کلیاتِ ظفر علی خاں''،ص۔50

24۔ طفیل ہوشیار پوری، ''جامِ مہتاب''احسان اکیڈمی،لاہور،1975ء،ص:129

25۔ ایوب صابر،مسودہ سلام،انٹرویو ایوب صابر،24دسمبر 2021ء

سیالکوٹ میں اردو غزل (اقبال سے صابر ظفر تک)

علامہ اقبالؒ کی شاعری کا ایک بڑا حصہ غزلیہ اشعار پر مشتمل ہے۔ بانگِ درا، بالِ جبریل اور ضربِ کلیم شعری مجموعوں میں اقبالؒ کی کثیر تعداد میں غزلیں ملاحظہ کی جاسکتی ہیں۔ ان میں کچھ مسلسل غزلیں بھی ہیں جن میں ایک ہی طرح کے مضامین ملتے ہیں۔ اقبالؒ داغ دہلوی کے شاگرد تھے ان کی ابتدائی شاعری پر داغ کے اثرات دیکھے جاسکتے ہیں۔ "باقیاتِ اقبال" کے نام سے مختلف محققین نے اقبالؒ کا جو منسوخ کلام مرتب کیا ہے ان پر بھی داغ کا رنگ واضح نظر آتا ہے۔ بانگِ درا کی کچھ غزلوں میں بھی داغ کا اندازِ بیان دیکھا جاسکتا ہے۔ اگرچہ اقبالؒ کی غزل کے مضامین کلاسیکل اور روایتی شاعری سے منفرد ہیں لیکن کہیں کہیں کلاسیکل اور روایتی رنگ دیکھا جاسکتا ہے۔ اس حوالے سے کلامِ اقبال ملاحظہ ہو:

مانا کہ تیری دید کے قابل نہیں ہوں میں
تو میرا شوق دیکھ میرا انتظار دیکھ
کھولی ہیں ذوقِ دید نے آنکھیں تری اگر
ہر رہگزر میں نقشِ کفِ پائے یار دیکھ1

نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی
مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی
تمہارے پیامی نے سب راز کھولا
خطا اس میں بندے کی سرکار کیا تھی
بھری بزم میں اپنے عاشق کو تاڑا
تری آنکھ مستی میں ہشیار کیا تھی
تامل تو تھا ان کو آنے میں قاصد
مگر یہ بتا طرزِ انکار کیا تھی2

موت کا نسخہ ابھی باقی ہے اے درد فراق
چارہ گر دیوانہ ہے ،میں لادوا کیونکر ہوا
میرے مٹنے کا تماشا دیکھنے کی چیز تھی
کیا بتاؤں ان کا میرا سامنا کیونکر ہوا3
انوکھی وضع ہے سارے زمانے سے نرالے ہیں
یہ عاشق کون سی بستی کے یارب! رہنے والے ہیں
رلاتی ہے مجھے راتوں کو خاموشی ستاروں کی
نرالا عشق ہے میرا ،نرالے میرے نالے ہیں4

اقبالؒ کی غزل میں نظم کا رنگ بھی نمایاں ہے جو موضوعات نظم میں پیش کئے گئے ہیں ان کا اظہار غزل میں بھی ملتا ہے۔اس حوالے سے اقبالؒ کی مسلسل غزلیں ملاحظہ کی جاسکتی ہیں۔ اقبالؒ کی بال جبریل اور ضربِ کلیم کی غزلوں کا رنگ ابتدائی غزلیہ شاعری سے مختلف ہے۔ابتدائی غزلیہ شاعری میں عشقِ مجازی جبکہ بعد کی غزلوں میں عشق حقیقی کے مضامین دیکھے جاسکتے ہیں۔ آخری دور کی غزلوں میں صوفیانہ تصورات،عقل وعشق،مشاہدہ کائنات،تسخیرِ کائنات،فکر وتدبر، فلسفہ خودی،کلاسیکیت ،مذہب،اخلاقیات،مناجات،استغاثہ اور سیاست جیسے موضوعات نظر آتے ہیں۔اس حوالے سے کلامِ اقبال ملاحظہ ہو:

گلزار ہست و بود نہ بیگانہ وار دیکھ
ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ
آیا ہے تو جہاں میں مثالِ شرار دیکھ
دم دے نہ جائے ہستی ناپائدار دیکھ5
لاؤں وہ تنکے کہیں سے آشیانے کے لئے
بجلیاں بے تاب ہوں جن کو جلانے کے لئے
وائے ناکامی فلک نے تاک کر توڑا اسے
میں نے جس ڈالی کو تاڑا آشیانے کے لئے
اس چمن میں مرغِ دل گائے نہ آزادی کا گیت
آہ ! یہ گلشن نہیں ایسے ترانے کے لئے 6

ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں
مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں
یہ جنت مبارک رہے زاہدوں کو
کہ میں آپ کا سامنا چاہتا ہوں
ذرا سا تو دل ہوں مگر شوخ اتنا
وہی لن ترانی سنا چاہتاہوں 7

اے بادِ صبا! کملی والے سے جا کہیو پیغام مرا
قبضے سے امت بیچاری کے دیں بھی گیا دنیا بھی گئی
نکلی تولبِ اقبال سے ہے،کیا جانئے کس کی ہے یہ صدا
پیغامِ سکوں پہنچا بھی گئی،دل محفل کا تڑپا بھی گئی8

پختہ ہوتی ہے اگر مصلحت اندیش ہو عقل
عشق ہو مصلحت اندیش تو ہے خام ابھی
بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی9

گیسوئے تاب دار کو اور بھی تاب دار کر
ہوش و خرد شکار کر،قلب و نظر شکار کر
عشق بھی حجاب میں ،حسن بھی ہو حجاب میں
یا تو خود آشکار ہو یا مجھے آشکار کر
باغ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں
کارِ جہاں دراز ہے،اب مرا انتظار کر10

مٹا دیا مرے ساقی نے عالمِ من و تو
پلا کے مجھ کو مے ءلاالہ الاھو11

لا پھر اک بار وہی بادہ و جام اے ساقی
ہاتھ آجائے مجھے مرا مقام اے ساقی!
تین سو سال سے ہیں ہند میخانے بند
اب مناسب ہے،ترا فیض ہو عام اے ساقی12

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں
طرب آشنائے فروش ہو تو نوائے محرم گوش ہو
وہ سرود کیا کہ چھپا ہوا ہو سکوتِ پردہ ساز میں
تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے ترا آئینہ ہے وہ آئینہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں
نہ کہیں جہاں میں اماں ملی جو اماں ملی تو کہاں ملی
مرے جرمِ خانہ خراب کو ترے عفو بندہ نواز میں13

حکیم شجر طہرانی کی غزل اپنے دور کے تمام رجحانات وموضوعات سے مزین ہے۔شجر نے غزل کی جس فضا میں آنکھ کھولی اس میں غالب کا تفکر' مومن کی نفسیاتی معاملہ بندی' ذوق کا صاف ستھرا انسانی ذوق' حالی کی جدتِ فکر' داغ کی زبان اور عشق بازیاں موجود تھیں۔شجر کی غزل صرف روایتی غزل نہیں بلکہ طرزِ بیان کی جدت و ندرت نے اس میں ایک نیا پن پیدا کر دیا ہے۔شجر محبوب کے لب ورخسار' تل' پیرہن' غنچہ' دہن' گیسو اور اعضائے جسمانی کے حسن کے ذکر سے اپنے غزلیہ اشعار کو مزین کرتے ہیں۔اس حوالے سے کچھ شعر ملاحظہ ہوں:

آئینہ اور آئینہ وش اس طرح ہیں رو برو
اِک مجسم نور ہے اِک نور کی تصویر ہے14
یہ شام و سحر اور شب و روز کیا ہیں
تری زلف کی تیرے آنچل کی باتیں15
مثال لعل و گہر ہیں ترے لب و دنداں
نظر نے لعل کو دل نے گہر کو چوم لیا16

شجر کی غزل میں جمالیاتی پہلو اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ یہ جمال ہیئت' معانی اور صورت کی رعنائیوں سے اجاگر ہوتا ہے۔شجر کی غزل موضوع' مواد' ہیئت اور جمالیاتی مقتضیات سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔اس حوالے سے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

کلیاں قبا دریدہ ہیں گل چاک پیرہن
لاتا ہے رنگ جوشِ بہاراں نئے نئے 17

تم حسن ہو یا حسن کے انداز کا اعجاز
سو سحر کا اِک سحر ہے اعجاز کا اعجاز18

جدید شعرا کی اکثریت شعر کو ابہام اور جدیدیت کی چاہ میں مبہم اور پیچیدہ بنا دیتی ہے۔ شجر کا تعلق اس گروہ سے ہے جو شعر کو معمہ اور چیستاں نہیں بناتے بلکہ وہ اپنی قلبی واردات کا انکشاف سیدھے سادے لفظوں اور اسلوب سے کرتے ہیں۔شجر کی غزل میں بے ساختگی اور سادگی پائی جاتی ہے۔اسی ہنر کی وجہ سے ان کی شاعری میں سہل ممتنع کی خوبی پیدا ہوئی ہے۔اس حوالے سے اشعار ملاحظہ ہوں:

آپ ہم سے ملا نہیں کرتے
ہم تو اس کا گلہ نہیں کرتے 19
تم کتنے بے وفا ہو تم کتنے دلربا ہو
کچھ آپ اپنے دل سے کچھ میرے جی سے پوچھو20
پکار اٹھے گا ہر قطرہ لہو کا
مگر زخمی تمہارے لب رہیں گے 21
ساری دنیا کے الجھاؤ
اِک تمہاری زلف کی الجھن 22

شجر کو زندگی میں پے در پے مشکلات کا سامنا کرنا پڑا لیکن وہ کبھی مایوس نہیں ہوئے ہر حال میں رجائیت اور امید پرستی کا دامن تھامے رکھا۔وہ شام سے مایوس نہیں ہوتے کیونکہ انہیں یہ امید ہے کہ ہر شام کے بعد ایک سحر بھی آتی ہے۔شجر کی غزل میں رجائیت کا عنصر ان کے حوصلے اور عزم کی دلیل ہے۔اس حوالے سے اشعار ملاحظہ ہوں:

گر جلایا کہیں نشیمن پر نشیمن بجلیاں
ہم بناتے ہی رہے کاشانہ کاشانے کے بعد 23
ایک تغیرِ مسلسل ہے نظامِ زندگی
شام آتی ہے تو آئے کہ سحر بھی ہو گی24
چشمِ خونبار کو ہے گریۂ پیہم سے یقیں
اشکِ نیساں میں کوئی بوند گہر بھی ہو گی25

شجر کے شعر میں غنائی لہجہ بھی موجود ہے۔ ان کی غزل میں الفاظ کے علاوہ موسیقیت اور غنائیت کا احساس کثرت سے ہوتا ہے۔ شجر نے غنائی الفاظ لمبی بحروں اور متناسب و مترنم ردیفوں اور مصرعوں کے متناسب ٹکڑوں سے غنائیت پیدا کی ہے۔ کچھ اشعار ملاحظہ فرمائیں:

یہ بھوک بھی' پیاس بھی' یہ اضطراب و بے کلی
بہرِ خدا پئے رضا صبح سے لے کے شام تک
غنچہ و گل ہیں خشک لب' باغ و فضائے باغ سب
تھکی تھکی ہوئی ہوا' صبح سے لے کے شام تک 26

شجر نے اپنی طویل عمر میں متعدد انقلابات دیکھے۔ اجڑے لوگوں کو بستے اور ہنستے بستے لوگوں کو روتے اور ویران ہوتے دیکھا۔ حالات کے بدلتے تیوروں نے دنیا اور زندگی پر سے ان کا اعتماد متزلزل بنا دیا تھا۔ ان کی غزل میں زندگی سے کسی قدر بیزاری اور دنیا کی بے ثباتی کا احساس بھی ملتا ہے بے ثباتی کے حوالے سے شجر یوں رقمطراز ہیں

آسماں سے کر نہ باتیں' سربلندی پر نہ پھول
خاک ہونا ہے شجر سب کچھ ابھر کر خاک سے 27
رات کی رات ہے اور زندگی بھر کے ارماں
کیسے نپٹے گا قیامت کا سفر رات کی رات 28
آسماں ' آسماں نہیں ہوگا
اور نہ ہوگی زمیں' زمیں کل تک 29

شجر غزل میں تغزل کو لازم و ملزوم سمجھتے ہیں۔ شجر کی شاعری میں تغزل کے سبھی رنگ' انداز اور مضامین پائے جاتے ہیں۔ تغزل کے حوالے سے شجر کے مسودات میں سے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

رات کو تارے مرے حال پہ روئیں' دن کو
چشم خورشید میں نم ہو تو غزل کہتا ہوں 30
غزل رنگ میں ہے لالائے صحرا
غزل گنگا کا جل کومل کنول ہے 31

شجر نے اپنی غزل میں فنی محاسن سے بھی کام لیا ہے۔ صنائع بدائع اور تشبیہ و استعارات

کے استعمال نے غزل کے معنوی اور صوری حسن کو دوبالا کر دیا ہے۔ شجر کی تشبیہ زندگی سے مربوط ہے اور استعارے بھی ہمارے سامنے کے ہیں۔ شجر کی شاعری میں ضرب المثل، تلمیحات اور محاورات کا بھرپور استعمال ملتا ہے۔ کچھ شعری مثالیں دیکھئے:

آنکھ کی کشتی میں، نظارہ دریا بھی کر
دیدنی ہے سیلِ اشک اب تو امڈ آنے کے بعد32

جنوں کی داستاں کیسے سناؤں
بگولے مانگ کر صحرا سے لاؤں33

اندھیرے میں اڑا جگنو کہ آنسو آنکھ سے چھوٹا
کہ ٹوٹا آسماں سے کوئی تارا غور سے دیکھو34

کوئی تیل اور تیل کی دھار دیکھے
کہ بہتے لہو کا ہے دھارا زمانہ 35

گڑ کھا کر جو مرے ہے اسے سنکھیا نہ دے
ہو مارنا تو ماریئے کتے کو گھی کے ساتھ 36

تمام رات جو آنسو بہاتے رہتے ہیں
تمہاری یاد کی شمعیں جلاتے رہتے ہیں37

شجر نے ہندی فارسی تہذیب میں زندگی گزاری ان کی غزل پر ہندی تہذیب اور زبان کے گہرے اثرات دیکھے جاسکتے ہیں۔

موہن کے مدھ ماتے نیناں تیکھے بان چلائیں
پریم کے لوبھی، مورکھ پنچھی تن من بھینٹ چڑھائیں
پھول تیرے نینوں کی مدھرتا، ہونٹوں کا رس پائیں
پریم کی لے میں ایسے جھومیں، کانٹوں پر سو جائیں38

شجر اپنے پیش روؤں اور ہم عصر شعرا خصوصاً غالب، داغ اور اقبال سے بہت زیادہ متاثر نظر آتے ہیں۔ اقبال کا اثر شجر کی غزل اور نظم پر زیادہ ہے۔ شجر داغ سے براہِ راست اور غالب سے بالواسطہ متاثر ہیں۔ غالب کے مختلف شعروں کے مفاہیم شجر کی شاعری میں واضح نظر آتے ہیں۔ اس حوالے سے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

چاہیے انسان تو ملتا ہے کوئی ڈھونڈے سے
یوں تو سب آدمی انسان نظر آتے ہیں39
اسے صدف حاصلِ اولاد شکم چاکی ہے
تجھ پہ کھل جائے گا قطرے کے گہر ہونے تک40
اِک بار نکلے خلد سے پر تیری بزم سے
ہم سے تو یہ سلوک مگر بارہا ہوا41

مولانا ظفر علی خان کی شاعری میں بھی غزلیہ عناصر پائے جاتے ہیں۔جنگِ عظیم کے بعد کی تاریک فضا میں جہادِ آزادی کے لیے جذبۂ ایمانی اور سرفروشی تھا جس کی بدولت ترکوں اور افغانوں کو اغیار کے پنجۂ ستم سے نجات ملی۔ظفر نے انہی واقعات سے متاثر ہو کر پرتاثیر اشعار لکھے ہیں۔پس منظر ہنگامی واقعات کا ہے مگر فکر و احساس میں آفاقی رنگ جھلک رہا ہے۔قطع نظر موضوع کی وسعت و ہمہ گیری کے ان اشعار میں تغزل کا انداز بھی لطف و کیف پیدا کر رہا ہے۔اشعار ملاحظہ ہوں:

غمِ امت میں ہے چشمِ پیغمبرؐ اشکبار اب بھی
گہر بیزی میں ہے معروفِ ابر نو بہار اب بھی
ہوا ہے دامن گل چیں ہی کوتہ ورنہ گلشن میں
وہی ہیں لالہ و گل اور وہی ان کی بہار اب بھی
سلیقہ مے کشی کا ہو تو کر سکتی ہے محفل میں
نگاہ لطف ساقی مفلسی کا اعتبار اب بھی
فضائے بدر پیدا کر فرشتے تیری نصرت کو
اتر سکتے ہیں گردوں سے قطار اندر قطار اب بھی42

مولانا ظفر علی خان نے فنی لحاظ سے غزل یا قطعے کے پیمانے کو زیادہ اختیار کیا ہے۔ظفر کے کلام میں چند غزلیں بھی مل جاتی ہیں مگر بے کیف۔حسن و عشق کے معاملات سے انہیں کوئی طبعی مناسبت نہ تھی۔وہ کوچہ ہوا و ہوس سے دور رہے۔غزل کے پیرائیہ بیانیعنی تغزل کو اپنے کلام میں اس طرح برتا ہے کہ اس کی مثال یا تو اکبر کے ہاں ملتی ہے اور یا ہم عصر اقبال کے ہاں۔تغزل کی وضاحت کے لیے ان کی نظم ''انتظارِ سحر'' کے استعاروں' کنایوں اور تلمیحوں پر غور کرتے ہوئے اس کے ایمانی انداز پر غور کریں اور پھر ظفر کے اشعار میں حسنِ تغزل کو دیکھا جا سکتا ہے۔

غمِ امت میں ہے چشم پیغمبرؐ اشکبار اب بھی
گہر بیزی میں ہے مصروف ابر بہار اب بھی
ہوا ہے دامن گل چیں ہی کو تہ ورنہ گلشن میں
وہی ہیں لالہ و گل اور وہی ان کی بہار اب بھی
دل وحشی سے اس پھندے میں الجھا ہی نہیں جاتا
ہے برہم ورنہ پہلے کی طرح زلف نگار اب بھی43

مولانا ظفر علی خان کسی زمین میں بند نہیں تھے۔کوئی موضوع ہو کوئی اسلوب ہو وہ ہر جگہ قادرالکلام تھے۔اُن کے کلام میں آمد ہے آورد کو دخل نہیں ہے وہ بدیہہ گو شاعر تھے۔قافیہ اور ردیف پر انہیں بڑی قدرت تھی۔وہ قافیہ پیمائی نہیں کرتے۔تشبیہہ' استعارہ' تلمیح' تمثیل اور شعری صنائع بدائع ان کے ہاں التزاماً نہیں آتے بلکہ بحرِ سخن کی روانی میں خود بخود بہتے چلے آتے ہیں۔وہ اپنے فن پر خود بھی دعویٰ کرتے ہیں۔

مبرا ہے کلام آورد کے اسقام سے میرا
مرے اشعار کی آمد میں دریا کی روانی ہے

ظفر کا شعری اسلوب ان کی صحافت اور خطابت سے بہت متاثر ہے۔صحافت اور خطابت کے ان تقاضوں نے ظفر میں بدیہہ گوئی کے وصف کو خوب اجاگر کیا جس کے لیے وہ اردو شاعری میں اپنا کوئی ثانی نہیں رکھتے۔سنگلاخ زمینوں' مشکل قوافی سے عہدہ برآ ہونے کے علاوہ بندش الفاظ' روزمرے اور محاورے کا جس فنی مہارت سے استعمال کیا اس کی مثال اردو شاعری میں کم ہی ملے گی۔نادر اور اچھوتے قافیے لانے اور ان کو برجستگی کے ساتھ کلام میں کھپانے میں ظفر کو یدطولیٰ حاصل تھا۔سنگلاخ زمین اور کچھ نادر قافیے ملاحظہ ہوں:

زمین سنگلاخ اکبر نے کیسی منتخب کی ہے
کہ مشکل ہو گیا اس میں قوافی نو بہ نولانا
چلی لندن سے اک آندھی چمن میرا اڑانے کو
غضب ہے اس میں کرزن کا بگولا بن کر بولانا
بہایا کفر کو جس نے خس وخاشاک کی صورت
اسی دریا کی ہاں اے نا خدا پھر ایک رولانا44

محمد دین فوق کی غزلیہ شاعری میں تغزل کے نمونے بکثرت ملتے ہیں۔تغزل غزل کی بنیادی خوبی ہے۔فوق کی غزل میں فکر وخیال کے متعدد زاویے موجود ہیں اور انہوں نے ان زاویوں کو حسنِ اظہار کے متنوع اسالیب میں بیان کیا ہے اور تغزل کا دامن بھی ہاتھ سے چھوٹتا نظر نہیں آتا

کہہ نہیں سکتے زور سے کچھ ہم
بات مانو تو مہربانی ہے45
آیا بھی گیا بھی دم زدن میں
جھونکا تھا کہ تھا شباب کا جوش
اے شرمِ گنہ نہ کر کنارہ
اے رحمتِ خاص کھول آغوش46

فوق کی غزل میں روایت بھی موجود ہے۔موضوعات غزل میں اور اسالیب اظہار و بیان میں ان کے ہاں روایت کی چھاپ بہت گہری ہے روایت کے حوالے سے کچھ اشعار پیش کئے جاتے ہیں:

کہتے ہیں قصہ ترا سنتے کس لئے
وہ کوئی افسانہ آرائشِ محفل نہ تھا
ہم بڑی مدت سے سنتے تھے کہ ہے دیندار فوق
جب اسے پرکھا تو وہ دنیا کے بھی قابل نہ تھا47

ہر شاعر اپنے معاشرے کا عکاس ہوتا ہے۔معاشرتی احساس ہی مقیاس فن اور معیارِ ہنر ہے۔فوق کی غزل میں بھی گہرے معاشرتی احساس کی جھلک دیکھی جاسکتی ہے۔

بتائے زورِ فہم و عقل سے راز نہاں تو نے
خدائی کی دکھائی شان مشت استخواں تو نے
کبھی سرمایہ داروں کو بھی کھینچ اپنے شکنجہ میں
غریبوں پر زمیں کیوں تنگ کردی آسماں تو نے48
آگے چل کر ابھی دیکھو گے جو ہیں فعل یہی
دہر پر فتنہ میں آفت ابھی کیا آئی ہے49

فوق نے اپنی نظم کے ساتھ ساتھ اپنی غزل میں بھی داخلی اور ذاتی حالات تفصیلاً بیان

کئے ہیں۔فوق کے ذاتی حالات کی عکاسی زیادہ تر ان کے مقطعوں میں ہوئی ہے۔ان اشعار سے ان کی زندگی کے کئی گوشے ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔اس حوالے سے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

فوق پھر تیرا سخن مقبول عام کیوں نہ ہو
فیض ہو تجھ پر اگر کچھ داغ سے استاد کا50

اے فوق شاعری کو ادب سے سلام کر
صورت نکال جا کے کہیں روزگار کی51

انگلش زبان ہی سے جو آشنا ہو تم
اے فوق پھر ایڈیٹر اخبار کیوں ہوئے52

نظم اقبال بھی بے چین تو کرتی ہے مگر
تیرے اشعار بھی اے ذوق مزا دیتے ہیں53

غزل میں حمدیہ ونعتیہ اشعار کہنا اردو غزل کی مسلمہ روایت ہے۔فوق کی بے شمار غزلوں میں حمدیہ ونعتیہ اشعار پائے جاتے ہیں۔

باغ عالم میں عجب رنگ دکھایا تو نے
درس عرفان ورق گل میں پڑھایا تو نے

طور پر حضرت موسیٰؑ کو جو آیا تھا نظر
مجھ کو ہر رنگ میں وہ جلوہ دکھایا تو نے 54

یوسف مصر بھی گر آئے زلیخا ہو کر
آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھوں ترا شیدا ہو کر

مدد اے جلوہ نظارہ محبوبِ خدا
آنکھیں بے کار ہوئی جاتی ہیں بینا ہو کر55

امینِ حزیں نے اپنی شاعری میں اپنے مفکرانہ انداز کے ساتھ تغزل کو بھی قائم رکھا ہے۔انھوں نے اپنی شاعرانہ معنی آفرینیوں سے تقریباً تمام علامات اور شعری روایات کے مفہوم کو بدل دیا ہے۔ان کے یہاں گل وبلبل 'زلف ورخسار' جام وساقی 'عشق ومحبت کا شاعرانہ تصور اور ان کی جذباتی کیفیات بالکل مختلف ہیں۔اس حوالے سے اشعار ملاحظہ ہوں:

دل کی بیتابیوں کے عالم کا
زندگی نام رکھ دیا کس نے56
جن نگاہوں میں ہے سرور جہاں
ہیچ ہے ان کے آگے میخانہ57
پیار ہوتا ہے جس سے اے پیارے
اس کو ہی بار بار دیکھتے ہیں58
کیا یہی دل ہے؟ جس کو پہلو میں
ہم امیں بے قرار دیکھتے ہیں59
حسن کی مٹھی میں دل ہو تو غزل ہوتی ہے
سوز سے موم یہ سل ہو تو غزل ہوتی ہے60

امینِ حزیں کو غزل کے فن پر عبور ہے۔ وہ شعریت اور ادبیت کو اپنے مقصد پر قربان نہیں کرتے۔ جذبات کی فراوانی، تخیل کی بلند پروازی، وارداتِ قلبی کی اثر انگیزی اور اندازِ بیان کی کرشمہ سازی امین کے اشعار میں بدرجہ اتم موجود ہے۔

تری نوا میں تڑپ بجلیوں کی لہرائے
نگاہِ شوق دلِ بیقرار پیدا کر61
وہ ڈال کر مری آنکھوں میں آنکھیں کہتے ہیں
دلوں کے ساز کے یوں سر ملائے جاتے ہیں62
تری ہی قسم ذرے ذرے کے لب پر
ترا تذکرہ ہے تیری گفتگو ہے
پھڑک جائیں گے جس کو سن کر فرشتے
ابھی میرا وہ نغمہ زیرِ گلو ہے63

فراق اردو کلاسیکی و روایتی شاعری کا ایک اہم موضوع ہے۔ میلا رام وفا بھی روایتی شاعر ہیں ان کی غزل میں فراق کے حوالے سے بکثرت اشعار دیکھے جا سکتے ہیں۔

زندگی بھر یہ بلا پیچھا نہ چھوڑے گی مرا
آج جائے گی تو پھر آئے گی کل فرقت کی رات

صبح کا منہ دیکھنا میرے مقدر میں نہ تھا
میرا اندیشہ نہ تھا کچھ بے محل فرقت کی رات64

فلسفۂ تخیل کی گہرائی اور مبالغہ آرائی بھی وفا کی شاعری کا حصہ ہیں۔خصوصاً ان کی غزل میں اس کی جھلک دیکھی جاسکتی ہے۔

سرد سرد آہوں سے یوں آنسو مرے جمتے گئے
ہو گیا تعمیر اک موتی محل فرقت کی رات
کچھ نہیں کھلتا کہ آخر اس قدر لمبی ہے کیوں؟
وصل کے دن کا ہے جب ردِعمل فرقت کی رات65

اردو کے ہر بڑے شاعر کے ہاں خاموشی ایک اہم موضوع رہا ہے۔وفا کی غزل میں بھی خاموشی کے عناصر ملتے ہیں۔

رہتا ہے وہ بت شکوۂ اغیار پہ خاموش
کہتا ہے تو کہتا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا
کہلاؤ نہ کچھ غیر کے تعارف میں تجھ سے
سمجھو تو یہ تھوڑا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا
کہنے کا تو اپنے ' ہے وفاؔ آپ بھی قائل
کہنے کو یہ کہتا ہے' کہ میں کچھ نہیں کہتا66

میلا رام وفا کی غزل میں خصوصاً عشق وجنوں کا اظہار بکثرت ملتا ہے۔عشق وجنون ہماری روایتی اور جدید شاعری کا اہم موضوع ہے۔وفا سچے عاشق ہیں اور عشق میں اپنی جان بھی قربان کرنے سے پیچھے نہیں ہٹتے۔

آندھیوں اور بگولوں سے کم نہیں تیرے دیوانے
خاک اڑاتے آتے ہیں خاک اڑاتے جاتے ہیں
آج سحر سے غیر بہت حال تیرے بیمار کا ہے
افسردہ افسردہ ہیں لوگ جو آتے جاتے ہیں67

اثر صہبائی کی غزلیں سوز وگداز سے بھرپور ہیں۔غمِ محبت یا زندگی کی ناکامیوں کا غم چشمِ بصیرت کو بہت تیز کر دیتا ہے۔حقائق ومعارف کا صحیح احساس' انسانی جذبات کی عمیق ترین

گہرائیوں سے شناسائی اور تخیل کی بلند ترین چوٹیوں تک رسائی اس غم کی بدولت ہوتی ہے۔ اثر کے شعری مجموعے ''راحت کدہ'' کی غزلیں جس قدر سوز و گداز سے پر ہیں دوسرے مجموعوں کی غزلیں اس درد کو نہیں پہنچتیں۔'' راحت کدہ'' سے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

رات کا قصہ مختصر ہے
صبح ہونے تک اشکبار رہی
راز سمجھا نہ کچھ گل خنداں
کس لیے شبنم اشکبار رہی68
دل بیٹھ نہ جائے یار غم سے
بیچارے کی کائنات کیا ہے
ہے چپ سی لگی ہوئی اثرؔ
معلوم نہیں کہ بات کیا ہے69

کیف وسرور و مستی غزل کا جزو اعظم سمجھی گئی ہے لیکن شاعر نے اس کا مفہوم اپنے اپنے خیال کے مطابق سمجھا ہے۔ اثرؔ کے تمام کلام میں خواہ وہ غزلیں ہوں نظمیں ہوں یا قطعات و رباعیات سب میں کیف و مستی پائی جاتی ہے۔

پلائے جا ساقیا ! پلائے جا انتظار کیا ہے
جو لڑکھڑا جائے ایک دو ساغروں میں وہ بادہ خوار کیا ہے
چمن میں رقص طرب ہے برپا اٹھا لے اپنا رباب مطرب
عبثیہ انجمن ہے تیرے دل میں کہ پھول کیا ہیں بہار کیا ہے
ازل سے خورشید و ماہ کے جام بزمِ ساقی میں چل رہے ہیں
مرید پیرِ مغاں کی نظروں میں دور لیل و نہار کیا ہے 70

فلسفہ کی روح عقل مذہب کی روح عمل اور شاعری کی روح جذبات ہیں۔ اثرؔ جذبات پرست ہیں لیکن اثرؔ کی طبیعت میں خوشگوار توازن اور اعتدال پایا جاتا ہے۔ جذبات کی پاکیزگی انداز بیان کی شگفتگی اور مضامین کی تازگی ان کی شاعری کی خاص خصوصیت ہے

پھر خندہ زیرِ لب آتا ہے اے اثرؔ
پھر جھک رہا ہے سر میرا عجزِ نیاز سے

پھر جگمگا رہی ہے مری بزمِ آرزو
دیکھا کسی نے پھر نگہ دل نواز سے
آنکھیں بجھی ہوئی ہیں تیری راہ گزر میں
آغوشِ شوق وا ہے تیرے انتظار میں 71

اثرؔ کی شاعری میں تغزل کی جھلک بھی دیکھی جاسکتی ہے۔ان کا تغزل رچا ہوا اور پوری سنجیدگی ومتانت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔یہ ایسا تغزل ہے جسے خلوص کی شدت نے پرتاثیر بنادیا ہے۔اثرؔ کے مندرجہ ذیل اشعار سے صحیح تغزل کی مثال واضح طور پر سمجھ میں آجاتی ہے۔

ڈوبی ہوئی نگاہ ہے رنگ حجاب میں
یا کوئی نوشگفتہ کلی نیم خواب میں
رنگینیوں میں غرق ہوئی ہے نقاب بھی
تم ہو کہ آفتاب چھپا ہے سحاب میں
زیرِ نقاب بھی تو بہت بے نقاب ہو
ہو جاؤ بے نقاب کہ تم آفتاب ہو 72

عبدالحمید عرفانی نظم اور غزل کے شاعر ہیں۔ان کی غزلیات چھوٹی بحروں میں ہیں کلام میں جاذبیت اور اختصار ہے۔عرفانی کی غزل میں روایتی رنگ نہیں ملتا۔ان کی غزل میں محبت اور وارداتِ محبت کا بیان کم ہے۔ان کی غزل پر عارفانہ رنگ غالب نظر آتا ہے۔

عرفانی کے عارفانہ کلام کے حوالے سے رخشہ نسیم اپنے مقالہ میں لکھتی ہیں:

ان (عرفانی) کے کلام میں جگہ جگہ عارفانہ رنگ غالب نظر آتا ہے۔کلام میں اتنی تاثیر ہے کہ ہر شخص کے دل کی گہرائیوں میں اتر جاتا ہے۔73

اختصار و جاذبیت اور معرفت کے حوالے سے ''کلیاتِ عرفانی'' سے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

حسن صبح بہار ہے تیرا
لالہ زر نگار ہے تیرا
میں ہوں اور کچھ شکستہ امیدیں
اور جہاں پر بہار ہے تیرا

جس کو اپنی خبر نہیں کوئی
کیا وہی راز دار ہے تیرا74

بشیر چونچال سیالکوٹی نے صنفِ غزل کو اپنا ذریعہ اظہار بنایا ہے۔غزل اور بالخصوص مزاحیہ غزل بڑی ریاضت مانگتی ہے۔چونچال نے زلف غزل کی مشاطگی میں بڑی ہنرمندی کا ثبوت دیا ہے۔بالعموم چھوٹی بحر استعمال کی ہے۔زبان نہایت چست اور انداز بیان نہایت نپا تُلا ہے۔غزل کے لطیف تلازموں کی رعایت کا ملاً ملحوظ رکھی ہے۔کمیت سے زیادہ کیفیت کو پیشِ نظر رکھا ہے۔اور اپنے نظریہ فن پر بھرپور عمل کیا ہے۔کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

مت پڑھو بزم میں غزل جب تک
گیسوئے شعر کو سنوار نہ لو
شعر دو چار ہوں مگر ستھرے
قافیہ ہائے بے شمار نہ لو 75

چونچال کی غزل میں کہیں تقصید نظر نہیں آتی۔زبان کے سادہ اور فطری بہاؤ میں کوئی گرہ دکھائی نہیں دیتی۔اس حوالے سے اشعار ملاحظہ ہوں:

نازو ادا و غمزہ و چشم فسوں طراز
دل کا مقابلہ ہے ترا آدمی کے ساتھ 76

اُردو غزل فارسی کا تسلسل ہے۔فارسی زبان کا سہارا لیے بغیر اب بھی اس کا قدم اُٹھانا محال ہے۔چونچال نے اس روایت کو اس قدر ملحوظ رکھا ہے کہ ببانگ دہل اعلان کیا ہے کہ میں نے غزل کو اصفہان کی سڑک پر چلایا ہے۔ان کی ترکیب سازی پر فارسی کا ہی نہیں عربی کا بھی گہرا اثر ہے اور اس سلسلے میں انھوں نے بڑی ہُنر مندی کا ثبوت دیا ہے۔ان کے استعمال کی ہوئی کچھ تراکیب؛چشمِ بم فگن، بارِ سنگِ اخراجات، خنجرِ تکفیر، بیمارِ خودستائی، وقفہِ اظہارِ مدعا، ہنگامہِ افرائش تولید، قفلِ حسد، تلقینِ ریش، جرأتِ تکذیبِ حق، محرومِ ذکرِ ربِّ صمد، گنجینۂ شبہات، کشتِ مملکت، درِلب ہیں۔اُن کے ہاں لفظی مزاح کے حوالے سے بھی اشعار دیکھے جاسکتے ہیں:

نظم لکھ کر وہ نظامی بن گئے
میں غزل کہہ کر غزالی ہو گیا77

فیضا حمد فیض نے غزل میں کلاسیکی انداز کو قائم رکھا اور نئے مضامین بھی پیش کیے

۔انھوں نے سیاسی مضامین وموضوعات بیان کرنے میں بھی تعزل کا سہارا لیا ہے۔فیض ایک منفرد لہجے اور جمالیاتی ورومانی انداز کے شاعر ہیں۔وہ بیسویں صدی کے ایک ایسے انقلابی شاعر ہیں جن کے ہاتھوں پر رومانیت اور سماجیت کے چراغ فروزاں ہیں۔ان کے غنائی لہجے میں اتنی تاثیر ہے کہ انھیں ہیتی تجربوں کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔فیض کے ہاں رومان اور انقلاب یکجا ملتے ہیں۔فیض نے اپنی غزلوں میں وطن سے محبت اور مظلوم انسانوں سے محبت کا ذکر خالص رومانی لہجے میں کیا ہے۔ان کے ہاں جس محبوب کا ذکر ملتا ہے۔اس کی ایک ہتھیلی پر حنا اور دوسری ہتھیلی پر لہو کی چمک نظر آتی ہے۔فیض کی شاعری کا بڑا موضوع محبت اور زندگی کی اجتماعی جدوجہد کی واردات ہے۔

مقام فیض کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے78

فیض کی شاعری کے ابتدائی دور میں فیض کا موضوع جنسی محبت ہی ہے۔اس میں کوئی اعلیٰ وارفع جذبہ موجود نہیں ہے۔فیض کے ہاں غمِ دوراں اور غمِ جاناں ایک ہی پیکر شعر میں یکجا ہیں۔فیض کے نزدیک ادب کی دنیا ٹھوس خارجی دنیا ہے۔رومانویت،انقلاب،اور حسن وعشق کی وارداتیہ سب زندگی کے حوالے سے فیض کی شاعری کا جزو بنتے ہیں۔فیض کا فنی کمال یہ ہے کہ انھوں نے کلاسیکیت اور رومانویت کو قالب شعر میں ڈھال کر ایک منفرد اسلوب اور لہجہ تخلیق کیا ہے۔فیض نے تشبیہات واستعارات رومانی استعمال کیے ہیں۔وطن کو اپنا محبوب قرار دے کر وطن سے محبت کا اظہار اس طرح کیا ہے۔جس طرح کوئی اپنے محبوب سے عشق کر رہا ہو۔

تیرے ہونٹوں کے پھولوں کی چاہت میں ہم
دار کی خشک ٹہنی پہ وارے گئے
تیرے ہاتھوں کی شمع کی حسرت میں ہم
نیم تاریک راہوں پہ مارے گئے
جب کھلی تری راہوں میں شامِ ستم
ہم چلے آئے لائے جہاں تک قدم
لب پہ حرفِ غزل دل میں قندیل غم
اپنا غم تھا گواہی ترے حسن کی

دیکھ قائم رہے اس گواہی پہ ہم
ہم جو تاریک راہوں پہ مارے گئے79

فیضؔ میر تقی میرؔ کی طرح عشق کے زخم خوردہ تھے۔ اپنی زندگی کے پہلے ہی عشق میں ناکامی کا غم فیض کو ساری زندگی رہا۔ اس عشق کا اظہار طرح طرح ان کی شاعری میں نظر آتا ہے۔

ویراں ہے مے کدہ ، خم و ساغر اُداس ہیں
تم کیا گئے کہ روٹھ گئے دن بہار کے
دنیا نے تیریاد سے بیگانہ کر دیا
تُجھ سے بھی دل فریب ہیں غم روزگار کے80

فیض کی غزل میں غنایت، شگفتگی اور رنگینی ورعنائی بھی پائی جاتی ہے۔ وہ زندگی کی سچی مسرتوں سے ہم کنار ہونے کو زندگی کا حاصل سمجھتے ہیں۔ فیض کے ہاں صرف بزمِ حبیب میں جانے کے خیال سے رنگینی پیدا ہوجاتی ہے۔ اس حوالے سے اشعار ملاحظہ ہوں

رنگ پیراہن کا خوشبو زلف لہرانے کا نام
موسم گل ہے تمہارے بام پر آنے کا نام
دوستو! اس چشم و لب کی کچھ کہو جس کے بغیر
گلستاں کی بات رنگین ہے نہ مے خانے کا نام81

فیض کی غزل جمالیاتی عناصر سے بھی بھری ہوئی ہے۔ زنداں میں فیض کا جمالیاتی مشاہدہ انھیں ایک خوبصورت ذوقِ جمال کا مالک بنا دیتا ہے۔ جمالیات کے حوالے سے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

قفس ہے بس میں تمہارے، تمہارے بس میں نہیں
چمن میں آتشِ گل کے نکھار کا موسم
ہماری بلا سے ہم نے نہ دیکھا تو اور دیکھیں گے
فروغِ گلشن و صوت ہزار کا موسم82

طفیل ہوشیار پوری بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ طفیل کی شاعری میں اعلیٰ درجے کا تغزل ملتا ہے۔ سادہ سی بات کو غزل کے لب ولہجہ میں اظہار کی توانائی اور اثر انگیزی کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ طفیل کی غزلوں کے علاوہ ان کی نظموں میں بھی متغزل کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ طفیل کی غزلوں میں موجود تغزل ہی کے باعث ان کے اشعار دل کی گہرائیوں تک اتر جاتے

ہیں۔ان کی کچھ غزلیہ اشعار ملاحظہ ہوں:

اب تو آ جاؤ کہ رسوا ہو نہ جائے ظرف دل
ضبطِ غم کے مرحلے آہ و فغاں تک آ گئے83
طے کر رہا ہوں دشتِ محبت کی منزلیں
غم کے بغیر کوئی شریکِ سفر نہیں
وقت کی گہرائیوں میں ڈوب کر اُبھرا ہے کون
اب کے بچھڑے ہم ملیں گے پھر خدا جانے کہاں84

طفیل کی شاعری میں مادہ پرستی پر گہری طنز ملتی ہے۔نت نئے سائنسی اکتشافات نے انسان سے انسان کا رشتہ کمزور کر دیا ہے۔مادی ترقی نے روحانی تقاضوں کو یکسر فراموش کر دیا ہے۔روحانی تقاضوں کو نظر انداز کر کے کی جانے والی ترقی کو کسی صورت ترقی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ طفیل نے اس موجودہ دور کی نام نہاد ترقی پر کھل کر تنقید کی ہے۔چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ابھی تو خاک کے پردے التفات طلب
ابھی ارادہ تسخیر کائنات نہ کر
ذروں کے جگر چیر دیئے فکر و نظر نے
مستور ہے وہ جلوہ گہ ناز ابھی تک85

طفیل ایک محب وطن انسان تھے۔انھوں نے سقوطِ ڈھاکہ کے سانحہ پر اپنے دلی احساسات وجذبات کا یوں اظہار کیا ہے:

جو نا خداؤں کی فکر و نظر سے ڈوبے ہیں
کہاں سے ڈھونڈ کے لاؤں میں ان سفینوں کو
نا خداؤں کا کرم کہیے طفیلؔ
رہ گئی طوفاں میں کشتی ڈول کر86

اصغر سودائی کی غزل میں کلاسیکی روایت کا ایک بھرپور احساس ملتا ہے۔اس میں اردو غزل کے نمایاں لہجوں کا دلکش رچاؤ ہے۔جسے انھوں نے اپنی ذہنی پختگی کی بنا پر بڑے فنکارانہ انداز میں اپنی غزل میں سمویا ہے۔کلاسیکی شعرا میں غالب ان کے پسندیدہ ترین شاعر ہیں۔ ابتدائی شاعری پر غالب کے اثرات ملتے ہیں۔اصغر نے ان کے رنگ میں شاعری بھی کی ہے۔

اپنے زخموں کو کریدیں تو ہمیں چین آئے
کوئی ہم سا بھی نہ آزاد طلب ہو جائے
ہائے وہ ہنگامہ ہائے روز و شب
ہم کہاں ہیں وہ نہ تھے جن کے لیے87

اصغر سودائی کی غزل میں عشق مجازی کی جھلک بھی ملتی ہے۔ان کا محبوب بھی اردو غزل کا روایتی محبوب لگتا ہے۔ جو عاشق پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑتا ہے۔ان کی شاعری میں عشقیہ اشعار دیکھیں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ کوئی روایتی عشقیہ داستان بیان کی جارہی ہے۔ان کے ہاں حسرت کا سا انداز ابھرتا ہے کہ محبوب خود کو چھپاتا بھی ہے اور ظاہر بھی ہوتا ہے۔

جو دل کی بات زباں تک نہ لا سکے دونوں
ادھر حیا کا تکلف ادھر حجاب سا تھا
اس جان تماشا کو محتاط اگر دیکھو
رہ رہ کے نظر اٹھے بھر بھر کے نظر دیکھو88

تاب اسلم اردو غزل کو حیاتِ دوام، جدت، انفرادیت اور استحکام دینے والوں میں سر فہرست ہیں۔ وہ استعارے، اشارے اور علائم کے پردے میں اپنی قلبی وارداتیں، جذبات اور ذہنی امور کی اس طرح ترجمانی کرتے ہیں کہ ان کے ہر قاری کو ان کی اپنی داستان کا گمان گزرتا ہے۔ زندگی کے نئے تقاضوں اور ضرورتوں نے تاب کو موضوعاتِ شعری کی ایک نئی جہت عطا کی ہے۔

صورتِ مرگ ہے شہروں پہ شبِ درد محیط
اے نئے دن میں کہاں تک ترا رستہ دیکھوں
فاصلے پھیل گئے راہ میں صدیوں کی طرح
اب تو شاید مرا تجھ سے کبھی ملنا ہی نہ ہو89

تاب کی غزل میں جمالیاتی پہلو اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ یہ جمال ہیئت، معانی اور صورت کی رعنائیوں سے اُجاگر ہوتا ہے۔ان کی غزل داخلیت سے عبارت ہے۔داخلیت ہی سے سوز و گداز پیدا ہوتا ہے۔ اسی داخلیت اور سوز و گداز سے رمزیت اور ایمائیت، موسیقی اور غنائیت جیسی خصوصیات پیدا ہوتی ہیں جن کے ہاتھوں غزل کی جمالیاتی ہیئت کا وجود ہوتا ہے۔تاب کی غزل موضوع، مواد، ہیئت اور جمالیاتی حسن سے پوری طرح ہم آہنگ

ہے۔اس حوالے سے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

عکس جس کے حُسن دلآویز کا پھولوں میں ہے
وہ کرن مہتاب کی اب تک مری آنکھوں میں ہے
رنگ دھنک کے چاند کی کرنیں تیرے نام
میرے خواب اور میری آنکھیں تیرے نام 90

تاب کی شاعری میں حسن و عشق کے عناصر بھی جا بجا ملتے ہیں۔حسنِ محبوب ان کی شاعری کا ایک اہم موضوع بھی ہے۔وہ حیات کے شاعر ہیں۔وہ رنگ، لمس، خوشبو اور زندگی کے مختلف رنگوں کے عکاس ہیں۔وہ محبوب کے حسن کو بڑے خوبصورت انداز میں پیش کرتے ہیں۔

نرم و نازک تیرے قامت کی طرح
پھول بھی ہیں تیری صورت کی طرح
ہونٹ تیرے، تیری آنکھیں، ترا چہرہ دیکھوں
میں تریا د میں کھو جاؤں تو کیا کیا دیکھوں 91

صابر ظفرؔ کے ہاں غزل حسن کاری اور حقیقت نگاری کا ایک دلآویز سنگم بن کر نمودار ہوئی ہے۔صابر کی غزل یقیناً غزل کی کلاسیکی روایت سے پھوٹی ہے مگر اس نے اپنے دوسرے ہم سفروں کی طرح اس روایت میں اپنی شخصیت، اپنا منفرد رویہ اور اپنے ہم عصر کی روح شامل کر کے ایک نئی روایت کی داغ بیل پڑنے کا امکان بھی پیدا کر دیا ہے۔ڈاکٹر وزیر آغا صابر ظفرؔ کی غزل کے بارے میں لکھتے ہیں:

> نئی اردو غزل کا ذکر چھڑے تو بات صابر ظفرؔ تک ضرور پہنچتی ہے۔وجہ یہ ہے کہ اس نے نئی غزل کی سمفنی میں ایک ایسی آواز کا اضافہ کیا ہے جو اس سے ہم آہنگ ہی نہیں۔آوازوں کے جھرمٹ سے الگ بھی ہے۔صابر ظفرؔ کے کلام میں ابھی سے ایک پائیدار نقش بننے کا وصف نمایاں ہو رہا ہے۔92

اردو غزل میں تسلسل بیان کے نئے قرینوں کی تلاش کے سلسلے میں صابر ظفرؔ نے بڑے متنوع تجربے کیے ہیں۔اس حوالے سے پہلی کوشش ان کا شعری مجموعہ ''بارہ دری میں شام'' ہے جو طویل غزلیات پر مشتمل ہے۔اس کی تمام غزلیں رومانی طرز احساس کی حامل ہیں۔جن میں عاشق و معشوق کی وصل و فراق سے سرشاری کے ساتھ ساتھ مختلف کیفیات محبت کو نظم کیا گیا ہے۔

جدید حسیت سے مملو شاعری میں یہ اپنی نوعیت کا غالباً واحد تجربہ ہے جس میں آتشِ عشق کا گداز اور لذت گریہ کا تسلسل ایک خاص کیفیت پیدا کرتا ہے:

وہ پہلا پہلا تجربہ تھا عشق میں وصال کا
چلی جو سسکیوں بھری ہوا ،عجب عجب طرح
ہم ایک دوسرے کے سنگ سنگ بھیگتے رہے
اُٹھایا لطف بوند بوند کا عجب عجب طرح
سمجھ رہا تھا میں کہ وہ بہت کھٹور ہے
شباب سے عیاں ہوئی حیا عجب عجب طرح93

اُن کی غزلوں میں محض ایک عاشق کی آپ بیتی نہیں اس میں معشوق کا احوال بھی رقم ہے۔ جہاں عاشق کلام کرتا ہے وہاں معشوق بھی اپنی کیفیتوں کا اظہار ایک سرور، گداز اور سرشاری کے ساتھ کرتا ہے۔ گویا یہ سلسلہ غزلیات عشق کا صحیفہ ہے۔ جس میں عاشق اور اس کے محبوب دونوں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔

رات ساری جاگتی سوتی رہی میں
ایک میٹھے درد میں ڈوبی رہی میں
رہ گئی تھی اس کی خوشبو پاس میرے
اپنی سانسیں اس سے مہکاتی رہی میں
فصل ایسی تھی ، سہاگن کوئی جیسے.....
بیج وہ بوتا رہا اگتی رہی میں.....
مہرباں بھنورا تھا یوں مجھ پر کہ جیسے
سارے گلشن میں فقط کھلتی رہی میں94

حواشی وحوالہ جات

1 ڈاکٹر محمد اقبال، کلیاتِ اقبال، اقبال اکادمی، لاہور، 2009ء، ص:124
2 ایضاً، 124۔125
3 ایضاً، ص:126۔127
4 ایضاً، ص:127

5 ایضاً،ص:124
6 ایضاً،ص:۔126۔125
7 ایضاً،ص:131
8 ایضاً،ص:309
9 ایضاً،ص:310
10 ایضاً،ص:347
11 ایضاً،ص:352
12 ایضاً،ص:351
13 ایضاً،ص:312
14 شجر طہرانی،نوائے سروش(مسودہ)،ص:20
15 ایضاً،ص:30
16 ایضاً،ص:40
17 ایضاً،ص:53
18 ایضاً،ص:55
19 ایضاً،ص:68
20 ایضاً،ص:70
21 ایضاً،ص:72
22 ایضاً،ص:58
23 شجر طہرانی،مسودہ نمبر ا،ص:15
24 ایضاً،ص:18
25 ایضاً،ص:20
26 ایضاً،ص:25
27 ایضاً،ص:30
28 ایضاً،ص:27
29 ایضاً،ص:10
30 شجر طہرانی،مسودہ نمبر 11،ص:20
31 ایضاً،ص:35
32 شجر طہرانی،مسودہ نمبر ۲۴،ص:45
33 ایضاً،ص:15
34 ایضاً،ص:75
35 ایضاً،ص:50

36 ایضاً،ص:35
37 ایضاً،ص:20
38 ایضاً،ص:60
39 شجر طہرانی، مسودہ نمبر ۱۱،ص:27
40 ایضاً،ص:40
41 ایضاً،ص:50
42 ظفر علی خاں، کلیاتِ ظفر علی خاں (بہارستان)، لاہور: الفیصل ناشران، ۲۰۰۷ء، ص:414
43 ایضاً،ص:106
44 ایضاً،ص:78
45 محمد دین فوق، نغمہ و گلزار، ص:120
46 ایضاً،ص:124
47 ایضاً،ص:229۔230
48 محمد دین فوق، نغمہ و گلزار، ص:69
49 محمد دین فوق، کلامِ فوق، ص:103
50 ایضاً،ص:11
51 ایضاً،ص:23
52 ایضاً،ص:60
53 ایضاً،ص:63
54 ایضاً،ص:123
55 ایضاً،ص:135
56 امین حزیں، گلبانگِ حیات، ص:181
57 ایضاً،ص:28
58 ایضاً،ص:197
59 ایضاً،ص:197
60 امینِ حزیں، سرودِ سرمدی، ص:39
61 امینِ حزیں، نوائے سروش، ص:96
62 ایضاً،ص:98
63 امینِ حزیں، گلبانگِ حیات، ص:188
64 ایضاً، غزل نمبر 3
65 ایضاً، غزل نمبر 3
66 ایضاً، غزل نمبر 4

67 ایضاً، غزل نمبر 2
68 اثر صہبائی، راحت کدہ، لاہور، تاج کمپنی لمیٹڈ ۱۹۴۲، ص:11
69 ایضاً، ص:35
70 ایضاً، ص:50
71 ایضاً، ص:77
72 اثر صہبائی، روحِ صہبائی، تاج کمپنی لیمیٹڈ، لاہور، 1945ء، ص:11
73 رخشندہ نسیم، سیالکوٹ میں اردو شاعری بیسویں صدی کے دوران، مقالہ برائے ایم اے اردو، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، 1979ء، ص:60
74 ڈاکٹر عبدالحمید عرفانی، کلیاتِ عرفانی، ص:150
75 بشیر احمد چونچال سیالکوٹی، منقار، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، 2000ء، ص:51
76 ایضاً، ص:68
77 ایضاً، ص:40
78 فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا (زنداں نامہ)، مکتبہ کارواں، لاہور، 2010ء، ص:25
79 ایضاً، ص:82-83
80 ایضاً، (نقش فریادی)، ص:57
81 ایضاً، (دستِ صبا)، ص:55
82 ایضاً، ص:32
83 طفیل ہوشیار پوری، ''شعلہ جام پر ایک نظر'' مشمولہ ''شعلہ جام'' از طفیل ہوشیار پوری، لاہور، احسان اکیڈمی، 1978ء، ص:191
84 ایضاً، ص:156-157
85 ایضاً، ص:202:201
86 ایضاً، ص:131-132
87 اصغر سودائی، ''چلن صبا کی طرح''، لاہور، صدیقی پبلی کیشنز، ۱۹۹۹ء، ص:53-54
88 ایضاً، ص:71-72
89 تاب اسلم، ''نقشِ آب''، لاہور، مکتبہ عالیہ، 1975ء، ص:80-81
90 ایضاً، ص:58-59
91 ایضاً، ص:54-55
92 ڈاکٹر وزیر آغا (سرورق)، ''ابتدا''، از صابر ظفر، لاہور، التحریر 1974ء
93 صابر ظفر، ''بارہ دری میں شام''، کراچی، دانیال، ۱۹۹۶ء، ص:37
94 ایضاً، ص:56

مولانا ظفر علی خان کی ادبی خدمات

مولانا ظفر علی خان (۱۹۵۶۔۱۸۷۳ء) سیالکوٹ کے ایک چھوٹے سے دیہات کوٹ مہر تھ میں پیدا ہوئے (1) آپ کے والد کا نام مولوی سراج الدین تھا۔ ابتدائی تعلیم مشن اسکول وزیر آباد سے حاصل کی۔ علی گڑھ کالج سے بی۔اے کیا۔(2)

علامہ شبلی نعمانی اور پروفیسر آرنلڈ آپ کے بہترین اساتذہ میں سرِ فہرست تھے۔(3) مولانا ظفر علی خان کو حیدر آباد میں داغ دہلوی کی صحبت بھی میسر آئی لیکن علامہ شبلی کی نصیحت پر داغ کا رنگ اختیار نہ کیا۔(4) شاعری کے ساتھ ساتھ آپ نے صحافت میں بھی بڑا نام پیدا کیا۔ آپ نے ''زمیندار'' اور ''ستارہ صبح'' کے علاوہ بہت زیادہ اخبارات و رسائل نکالے جن کی شہرت سارے برصغیر میں پھیلی۔

ظفر علی خان کا پہلا شعری مجموعہ ''بہارستان'' کے نام سے شائع ہوا۔ اس مجموعہ میں ان کی شاعری کا ابتدائی اردو اور فارسی کلام شامل ہے۔ یہ مجموعہ حمد باری 'نعت و استغاثہ' اسلام' اسلامی روایات' ستارہ صبح کے دور کی نظمیں' نوحے اور مرثیے جیسی ترتیب سے مرتب کیا گیا ہے۔

دوسرے شعری مجموعے کا نام ''نگارستاں'' ہے۔ اس مجموعہ کلام میں سیاسی و فلسفیانہ شاعری' طنزیہ نگاری اور صحافتی شاعری کے ساتھ ساتھ ادبی مرصع کاری کے شاہکار نظر آتے ہیں۔ اس میں بہت سے معاصرین کے تذکرے اور قلمی خاکے موجود ہیں۔ ''چمنستان'' آپ کا تیسرا شعری مجموعہ ہے اس مجموعے میں رطب و یابس شامل نہیں ہے بلکہ یہ مجموعہ ان کے منتخب کلام پر مشتمل ہے۔ اس مجموعے میں ان کی وہ بہترین نظمیں اور قطعات ہیں جن کی سیاسی' اسلامی اور معاشرتی لحاظ سے بڑی اہمیت ہے۔

ظفر علی خان کا چوتھا شعری مجموعہ ''خیالستان'' کے نام سے شائع ہوا۔ اس مجموعے میں سیاسی نظمیں بالکل نہیں ہیں البتہ چھ غزلیں سیاسی و ادبی رنگ لئے ہوئے ہیں۔ یہ مجموعہ نعت کے اہم حصوں پر مشتمل ہے۔ نعت گوئی ظفر علی خان کا پسندیدہ اور قابلِ فخر کارنامہ ہے جس سے انہوں نے

شہرتِ عام اور بقائے دوام کا درجہ حاصل کیا۔ آپ کا پانچواں شعری مجموعہ ''حسبیات'' کے نام سے موسوم ہے۔ یہ مجموعہ ان اشعار پر مشتمل ہے جو آپ نے اپنی اسیری اور نظر بندی کے دوران کہے۔ اس مجموعہ میں حمد' نعت' اخلاق' سلف صالحین' اخلاق مرتضوی' انسان کی آزادی' اسلامی تصور' صلیب و ہلال کی آویزش' ایمان کی شناخت' برطانوی سیاست پر چوٹیں جیسے آزادی کا بگل' تخت یا تختہ کلیسا سے عیسوی اور گاندھی اہم نظمیں ہیں۔'' ارمغانِ قادیاں'' ظفر علی خان کا چھٹا شعری مجموعہ ہے۔ ابتدائی ایڈیشن میں قادیانیت کے متعلق نظمیں اور قطعات بہارستان میں شامل تھے۔ بعد میں اس حصے کو الگ کر کے اس نام سے شائع کیا ہے۔ یہ اشعار قادیانیت کے خلاف قلمی جہاد کا نمونہ ہیں۔

ظفر علی خان کی شاعری سکول کے زمانے سے شروع ہوتی ہے۔ آپ نے علی گڑھ کالج کے ادبی ماحول میں اردو اور فارسی شاعری کی مشق کو جاری رکھا۔ حیدر آباد کے علمی و ادبی ماحول میں ظفر علی خاں کی شاعری میں پختگی پیدا ہوئی۔ ادبی رسائل'' مخزن'' '' دکن ریویو'' '' پنجاب ریویو'' '' زمیندار'' اور ستارۂ صبح'' میں آپ کا کلام چھپتا رہا۔ جس سے انہیں ملک کے ادبی حلقوں کے ساتھ ساتھ حالی و شبلی جیسے شاعروں سے خوب داد ملی۔

جب ۱۹۰۵ء میں ان کی معرکتہ الآرا طویل نظم'' شورِ محشر'' مختلف رسائل میں شائع ہوئی اور الگ کتابچے کی صورت میں چھپی تو ادبی حلقوں میں ان کی شہرت کا آغاز ہوا۔ (5)

حمد و نعت ظفر علی خان کا محبوب موضوع ہے۔ حمد' نعت اور تاریخِ اسلام کے روشن ماضی کے اخلاق آموز واقعات کا بیان ظفر علی خان کی شاعری کا مرکزی موضوع ہے جہاں ان کا قلم عقیدت و محبت کی پنہائیوں میں ڈوب کر گوہر آبدار تلاش کرتا ہے اور عالم انسانی کی رہنمائی کیلئے پیش کرتا ہے۔

خدا کی حمد' پیغمبرؐ کی مدح' اسلام کے قصے
مرے مضمون ہیں جب سے شعر کہنے کا شعور آیا

ظفر علی خان نے حمد و نعت میں متقدمین کی روایت کو بڑے جذبہ و شوق' فکر و احساس کے علاوہ اپنے پرشکوہ لہجے اور دلآویز انداز میں آگے بڑھایا ہے یہاں حمد'' رب العالمین'' کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

بنائے اپنی حکمت سے زمین و آسماں تو نے
دکھائے اپنی قدرت کے ہمیں کیا کیا نشاں تو نے

تری صنعت کے سانچے میں ڈھلا ہے پیکرِ ہستی
سمویا اپنے ہاتھوں سے مزاج جسم وجاں تو نے(6)

خدائے بزرگ و برتر کی حمد کے ساتھ ساتھ ظفر علی خان نے سرورِ کون ومکانؐ کی نعت کے سلسلے کو بھی جاری رکھا اور اعلیٰ پائے کی نعت گوئی میں بلند مقام و مرتبے پر فائز رہے۔ اس حوالے سے ظفر علی خان کا ایک نعتیہ مخمس ''نذرِ محقر بحضور خواجۂ دو جہاں سرورِ کون ومکان محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم'' کا ایک بند ملاحظہ ہو:

اے کہ ترا شہود ہے وجۂ کائنات
اے کہ ترا فسانہ ہے زینت محفل حیات
اے کہ تیری ذات میں جمع زمانہ کے صفات
سب ملکی تصرفات سب فلکی تجلیات
سلطنت اک جہاں کی ہے تیری نگاہ التفات(7)

ظفر کے نعتیہ کلام میں ان کی مشہور نعت ''شمع وحرا'' بڑی دل آویز اور معنوی رفعت میں بے مثال ہے۔ اس نعت کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

وہ شمع اجالا جس نے کیا چالیس برس تک غاروں میں
اک روز جھلکنے والی تھی سب دنیا کے درباروں میں
رحمت کی گھٹائیں پھیل گئیں افلاک کے گنبد گنبد پر
وحدت کی تجلی کوندگئی آفاق کے سینہ زاروں میں(8)

جب ظفر علی خاں امتِ مسلمہ کو ذلت و رسوائی سے دوچار دیکھتے ہیں تو وہ بے چین ہو جاتے ہیں۔ اسلام دشمن عناصر جب سلطنت عثمانیہ کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے ہیں۔ تو اس کے ساتھ ہی عظیم خلافتِ عثمانیہ کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ ان حالات میں ظفر خاموش تماشائی نہیں بن سکتے۔ وہ رسولِ مکرمؐ کے دربار میں اپنی نظم ''التجا بحضور سرورِ کائناتؐ'' میں یوں فریاد کناں ہوتے ہیں:

جاگ او یثرب کے میٹھی نیند کے ماتے کہ آج
لٹ رہا ہے آنکھوں آنکھوں میں تیری امت کا راج
سر چھپانے کا ٹھکانہ بھی انہیں ملتا نہیں
جب کہ ہیبت لے چکی ہے ایک عالم سے خراج

تیرے بچے ہو رہے ہیں ساری دنیا میں ذلیل
کیا نہیں اے قبلہ عالم تجھے بچوں کی لاج
ہم ہیں ننگے سر اٹھ اے شانِ عرب آنِ عجم
اور پہنا دے ہمیں پھر سطوتِ کبریٰ کا تاج
تشنہ کا مانِ خلافت کو خود اپنے ہاتھ سے
بھر کے وہ ساغر پلا ہے انگبیں جس کا مزاج
اب دوا سے کام کچھ چلتا نہیں بیمار کا
اب تو ہے تیری دعا ہی تیری امت کا علاج(9)

ترکوں کی پہلی جنگِ عظیم میں شکست کے بعد عثمانی سلطنت کی شکست وریخت مقامات مقدسہ اور دارالاخلافت پر اتحادیوں کا قبضہ 'سمرنا پر یونانیوں کا قبضہ اور ترک آبادی کا قتلِ عام' ان دلخراش واقعات نے ہندی مسلمانوں کو آتش بداماں کر دیا تھا۔ خلافتِ عثمانیہ کے خاتمے پر اسلامیانِ ہند کے غم وغصے اور جوش وخروش کی جو حالت تھی اس کی ایک جھلک ''خروشِ مسلم'' کے کچھ اشعار میں بھی ملاحظہ کی جاسکتی ہے:

زمین تھر تھرا گئی آوازہ اللہ اکبر سے
خروشِ مسلم شوریدہ شرماتا ہے تندر سے
جلایا اس نے مردوں باذن اللہ قم کہہ کر
جگایا اس نے ایک آواز میں ہندستان بھر کو
مسیحیت مسلمانی سے ٹکرائی تو ہے لیکن
کسی نے آج تک شیشے سے توڑا بھی ہے پتھر کو(10)

مسلم قومیت کے جس شعور کو حالی' شبلی اور اکبر نے واضح کیا ظفر اور اقبال کی شاعری اس شعور احساس کی نمائندگی اپنے اپنے انداز میں کرتی ہے۔ اسلامیانِ ہند جہاں اپنی آزادی کی جدوجہد میں حصہ لے رہے تھے وہاں ان کے جذبات عالمِ اسلام کی دھڑکنوں سے بھی ہم آہنگ تھے۔ یہی جذبہ واحساس حالی کے ہاں مرثیے' اقبال کے ہاں فکر اور ظفر کے ہاں رجز کے رنگ میں ظاہر ہوا ہے۔ ظفر کی نظم ''مسلم کی شان'' میں مسلم قومیت کی اس مقامی اور آفاقی حیثیت کو ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔

تو نے اے مسلم کچھ اپنی قدر پہچانی بھی ہے
تو ہے انسان تجھ میں لیکن شانِ یزدانی بھی ہے
فرش پر ہیں پاؤں تیرے عرش پر ہے سر ترا
نصف تو خاکی ہے لیکن نصف تو نورانی بھی ہے
جس تمدن سے ہوئی ہے خیرہ چشم روزگار
سرمہ اس کا تیرے نقش پا کی حیرانی بھی ہے
نیل کی موجیں اگر کرتی ہیں تیری جستجو
ڈھونڈتی پھرتی تجھے گنگا کی جولانی بھی ہے(11)

جنگِ عظیم کے بعد کی تاریک فضا میں جہادِ آزادی کے لیے جذبۂ ایمانی اور سرفروشی تھا جس کی بدولت ترکوں اور افغانوں کو اغیار کے پنجۂ ستم سے نجات ملی۔ظفر نے انہی واقعات سے متاثر ہوکر پرتاثیر اشعار لکھے ہیں۔پس منظر ہنگامی واقعات کا ہے مگر فکر و احساس میں آفاقی رنگ جھلک رہا ہے۔قطع نظر موضوع کی وسعت و ہمہ گیری کے ان اشعار میں تغزل کا انداز بھی لطف و کیف پیدا کر رہا ہے۔اشعار ملاحظہ ہوں:

غمِ امت میں ہے چشمِ پیغمبرؐ اشکبار اب بھی
گہر بیزی میں ہے معروفِ ابر نو بہار اب بھی
ہوا ہے دامن گل چیں ہی کوتہ ورنہ گلشن میں
وہی ہیں لالہ وگل اور وہی ان کی بہار اب بھی
سلیقہ مے کشی کا ہو تو کر سکتی ہے محفل میں
نگاہ لطف ساقی مفلسی کا اعتبار اب بھی
فضائے بدر پیدا کر فرشتے تیری نصرت کو
اتر سکتے ہیں گردوں سے قطار اندر قطار اب بھی(12)

جلیانوالہ باغ جیسے خونی سانحے نے ہندستانیوں کے دلوں میں انگریز سرکار کے ظلم وستم کے خلاف نفرت کا جذبہ پیدا کر کے سیاسی انقلاب کی راہ ہموار کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ان حالات میں شہداء کے لہو کا ایک ایک قطرہ قصرِ آزادی کی آرائش کا سامان بننے لگا۔ظفر کی نظم ''فانوسِ ہند کا شعلہ''ہندستانی مسلمانوں کے انہی جذبات کا آئینہ دار ہے۔

زندہ باش اے انقلاب ! اے شعلہ فانوس ہند
گرمیاں جس کی فروغ منتقل جان ہو گئیں
جن بلاؤں میں گھرے رہتے تھے صبح و شام ہم
تیرے آتے ہی وہ انگریزوں کی درباں ہو گئیں
مرحبا' اے نو گرفتارانِ بیداد فرنگ
جن کی زنجیریں فروش افزائے زنداں ہو گئیں
جتنی بوندیں تھیں شہیدانِ وطن کے خون کی
قصرِ آزادی کی آرائش کا سامان ہو گئیں(13)

ظفر اور اقبال کی شاعری کی ایک خاص اہمیت ہے کہ ان شعرا نے اپنی شاعری میں سیاسی' تہذیبی' معاشرتی اور معاشی مسائل کو موضوع بنانے کے ساتھ ساتھ غیر معتدل رومانی رجحانات پر تنقید کر کے ادب اور زندگی کے رشتے کو جوڑنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ اقبال نے اپنی شاعری کی عمرانی حیثیت کو واضح کیا ہے۔ ظفر نے بھی اس نقطہ نظر کو اپنی نظم ''سخنورانِ عہد سے خطاب'' میں خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔ اشعار ملاحظہ ہوں:

اے نکتہ وران سخن آرا و سخن سنج
اے نغمہ گران چمنستانِ معنی
مانا کہ دل افروز ہے افسانہ عذرا
مانا کہ دل آویز ہے سلمیٰ کی کہانی
مانا کے اگر چھیڑ حسینوں سے چلی جائے
کٹ جائے گا اس مشغلہ میں عہدِ جوانی
مانا کے حدیث خط و رخسار کے آگے
بیکار ہے مشائیوں کی فلسفہ دانی(14)

ظفر علی خان نے اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ نظر بندی اور زندان کی تنہائیوں میں گزارا۔ جدوجہدِ آزادی کے سلسلے میں کرم آباد کی نظر بندی کے علاوہ لاہور سنٹرل جیل' منٹگمری جیل اور گجرات اسپیشل جیل میں انہوں نے کئی سال گزارے۔ ظفر علی خان کی شاعری حبسیات کے عنوان سے پہلی بار ۱۹۶۷ء میں شائع ہوئی جس میں زندانی زندگی کے گہرے تاثرات پائے

جاتے ہیں۔اس حوالے سے چند شعر ملاحظہ کریں:

بس کہ تنہائی میں تھا شوق غزل خوانی مجھے
کر دیا قسمت نے انگریزوں کو زندانی مجھے
جو مضامین آج تک تھے برتر از فکر بلند
بیٹھے بیٹھے سوجھ جاتے ہیں بآسانی مجھے
سالہا سال اتباعِ اسوہ یوسف کیا
دولتِ ایمان کی حاصل ہے فراوانی مجھے
راہِ حق میں سر جو کٹ جاتا تو تھی اک بات بھی
کیا تسلی دے گی یہ تھوڑی سی قربانی مجھے(15)

واقعہ کربلا تاریخ کا ایک ایسا بڑا سانحہ ہے جس نے ہر بڑے ادیب وشاعر کو متاثر کیا۔ یہ حق و باطل کے درمیان ایک ایسا معرکہ تھا جس میں حق کی کمان حسینؓ ابنِ علیؓ کے پاس تھی۔اہلِ بیت سے محبت ہر مسلمان کے ایمان کا حصہ ہے۔مولانا ظفر علی خان بھی نواسۂ رسولؐ سے محبت کرتے ہیں۔وہ اس محبت کا اظہار میدانِ کربلا میں امام حسینؓ کی بہادری اور شجاعت بیان کرتے ہوئے اس طرح کرتے ہیں:

اک وہ بھی حسینؓ ابنِ علیؓ تھا کہ سر اس نے
مر کر بھی نہ فاسق کی حضوری میں جھکایا
خود چل کے گیا معرکۂ کرب و بلا میں
دنیا کو قیامت کا سماں جس نے دکھایا
تھا سینہ سپر ایک ہزاروں کے مقابل
باطل کے اس انبوہ نے اس کو نہ ڈرایا(16)

اردو شاعری میں مرثیے کی صنف زیادہ تر سانحہ کربلا کے بیان تک محدود رہی تاہم بعض شعرا نے اعزہ واحباب کے مرنے پر تاریخی قطعوں کے علاوہ شخصی مرثیے کہہ کر اپنے غم والم کا اظہار کیا ہے۔ظفر نے اپنے والد' بھائی محمد اکرم خان' سید محمود' نواب داغ دہلوی' مولانا گرامی' سر فضل حسین' لاجپت رائے' ڈاکٹر مختار انصاری' مولانا محمد علی جوہر اور علامہ اقبال کی وفات پر مرثیے لکھے ہیں۔ظفر نے اپنے جواں مرگ بھائی کا مرثیہ بھی کہا جس کے کچھ اشعار پیش کئے جاتے ہیں۔

میں آج سنانے کو ہوں مژگاں کی زبانی
پہلو میں گداز جگر و دل کی کہانی
کرنا ہے مجھے آج جواں بھائی کا ماتم
بنیاد فلک ہے مجھے منظور ہلانی
وہ شمع کہ تھا اس سے مرے گھر میں اجالا
صرصر کو نہ لازم تھا سر شام بجھانی(17)

سماجی اداروں اور جماعتوں میں انگریزی تہذیب' آریہ سماج' اہلِ طریقت اور قادیانی فرقہ ظفر کی طنز کا ہدف بنے رہے۔ افراد کی مدح و ذم بھی ان کا خاص موضوع رہا۔ اس کا معیار ذاتی نہیں بلکہ سیاسی نظریات یا مذہبی و معاشرتی عقائد پر مبنی تھا۔ ظفر کی طنز کی لپیٹ میں بڑی بڑی شخصیات آئی ہیں۔ گاندھی جی' جواہر لال نہرو' ابوالکلام آزاد' محمد علی' شوکت علی' محمد علی جناح' سر امام' سر محمد شفیع' ڈاکٹر محمد اقبال' لالہ لاجپت رائے' پنڈت مدن موہن مالوی' داؤد غزنوی' افضل حق' عطاءاللہ شاہ بخاری' سر عمر حیات ٹوانہ' سر سکندر حیات اور لندنی معشوقہ اور دہلوی عاشق میں طنز و ظرافت کا وہی انداز ہے جو اکبر کا مخصوص رنگ ہے۔ طنز و ظرافت کے حوالے سے ایک نظم کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

اک سنہرے بالوں والی میم نے ہنس کر کہا
اپنے اک ہندستانی عاشق مفتون سے
میں نے یہ مانا کہ تم کھاتے چھری کانٹے سے ہو
شوق رکھتے ہو قمیض و کالر و پتلون سے
بنگلے میں رہتے ہو اور چڑھتے ہو موٹر کار پر
بیٹھتے ہو پاٹ پر دھوتے ہو منہ صابون سے(18)

مجلس احرار کے قیام میں ظفر علی خاں بھی پیش پیش تھے۔ پھر مجلس سے اختلاف شروع ہوا۔ مسجد شہید گنج کے مسئلے پر مجلسِ احرار الگ تھلگ رہی اور تحریکِ پاکستان کے دوران مجلسِ احرار کے رہنما کانگرس کے خیمہ برادر بن کر مسلم مفادات سے بے وفائی کرنے لگے۔ ظفر اس موقعے پر مجلسِ احرار کو اپنی طنز کا نشانہ یوں بناتے ہیں:

اللہ کے قانون کی پہچان سے بیزار
اسلام اور ایمان اور احسان سے بیزار

ناموس پیغمبرؐ کے نگہبان سے بیزار
کافر سے سوالات مسلمان سے بیزار
اس پر ہے یہ دعویٰ کہ ہیں اسلام کے احرار
امرا کہاں کے یہ ہیں اسلام کے غدار
پنجاب کے احرار ! اسلام کے غدار! (19)

ظفر علی خان کی طنزیہ شاعری کا ایک بڑا ہدف قادیان کا مرزائی یا غلام احمدی گروہ ہے۔ان کا ایک پورا شعری مجموعہ ''ارمغانِ قادیان'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ان کی شعری طنزیات میں شعریت اور تغزل بھی ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔قادیان پر طنز کے حوالے سے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

حقیقت قادیاں کی پوچھ لیجئے ابنِ جوزی سے
نکوکاری کے پردے میں سیہ کاری کا حیلا ہے
یہ وہ تلبیس ہے ابلیس کو خود ناز ہے جس پر
مسلمان کو اس رندے نے اچھی طرح چھیلا ہے
پلی ہے مغربی تہذیب کی آغوش عشرت میں
نبوت بھی رسیلی ہے پیغمبر بھی رسیلا ہے(20)

فنی لحاظ سے ظفر نے غزل یا قطعے کے پیمانے کو زیادہ اختیار کیا ہے۔ظفر کے کلام میں چند غزلیں بھی مل جاتی ہیں مگر بے کیف۔حسن و عشق کے معاملات سے انہیں کوئی طبعی مناسبت نہ تھی۔وہ کوچہ ہوا و ہوس سے دور رہے۔غزل کے پیرائیہ بیان یعنی تغزل کو اپنے کلام میں اس طرح برتا ہے کہ اس کی مثال یا تو اکبر کے ہاں ملتی ہے اور یا ہم عصر اقبال کے ہاں۔تغزل کی وضاحت کے لیے ان کی نظم'' انتظارِ سحر'' کے استعاروں' کنایوں اور تلمیحوں پر غور کرتے ہوئے اس کے ایمانی انداز پر غور کریں اور پھر ظفر کے اشعار میں حسنِ تغزل کو دیکھا جاسکتا ہے۔

غمِ امت میں ہے چشم پیغمبرؐ اشکبار اب بھی
گہر بیزی میں ہے مصروف ابر بہار اب بھی
ہوا ہے دامن گل چیں ہی کوتہ ورنہ گلشن میں
وہی ہیں لالہ و گل اور وہی ان کی بہار اب بھی

دل وحشی سے اس پھندے میں الجھا ہی نہیں جاتا
ہے برہم ورنہ پہلے کی طرح زلف نگار اب بھی(21)

ظفر کسی زمین میں بند نہیں تھے۔ کوئی موضوع ہو کوئی اسلوب ہو وہ ہر جگہ قادر الکلام تھے۔ اُن کے کلام میں آمد ہے آورد کو دخل نہیں ہے وہ بدیہہ گو شاعر تھے۔ قافیہ اور ردیف پر انہیں بڑی قدرت تھی۔ وہ قافیہ پیمائی نہیں کرتے۔ تشبیہہ' استعارہ' تلمیح' تمثیل اور شعری صنائع بدائع ان کے ہاں التزاماً نہیں آتے بلکہ بحرِ سخن کی روانی میں خود بخود بہتے چلے آتے ہیں۔ وہ اپنے فن پر خود بھی دعویٰ کرتے ہیں:

مبرا ہے کلام آورد کے اسقام سے میرا
مرے اشعار کی آمد میں دریا کی روانی ہے

ظفر کا شعری اسلوب ان کی صحافت اور خطابت سے بہت متاثر ہے۔ صحافت اور خطابت کے ان تقاضوں نے ظفر میں بدیہہ گوئی کے وصف کو خوب اجاگر کیا جس کے لیے وہ اردو شاعری میں اپنا کوئی ثانی نہیں رکھتے۔ سنگلاخ زمینوں' مشکل قوافی سے عہدہ برآ ہونے کے علاوہ بندش الفاظ' روزمرے اور محاورے کا جس فنی مہارت سے استعمال کیا اس کی مثال اردو شاعری میں کم ہی ملے گی۔ نادر اور اچھوتے قافیے لانے اور ان کو برجستگی کے ساتھ کلام میں کھپانے میں ظفر کو یدطولیٰ حاصل تھا۔ سنگلاخ زمین اور کچھ نادر قافیے ملاحظہ ہوں

زمین سنگلاخ اکبر نے کیسی منتخب کی ہے
کہ مشکل ہو گیا اس میں قوافی نو بہ نو لانا
چلی لندن سے اک آندھی چمن میرا اڑانے کو
غضب ہے اس میں کرزن کا بگولا بن کر بولانا
بہایا کفر کو جس نے خس وخاشاک کی صورت
اسی دریا کی ہاں اے ناخدا پھر ایک رولانا(22)

اظہارِ خیال کے لیے ظفر نے جہاں نئے الفاظ' تراکیب' استعارے اور تشبیہات دریافت کی ہیں وہاں محاورات کے استعمال میں بھی بڑی جدت دکھائی ہے۔ عام محاوروں کو انوکھے انداز سے باندھ کر ان میں جاذبیت پیدا کی ہے۔

ظفر نے مناظر اور سراپا پر بھی عمدہ نظمیں لکھی ہیں۔ وہ مناظر قدرت اور فطری جذبات

کی عکاسی کرنے میں حد درجہ مہارت رکھتے تھے۔ وہ ہر واقعہ یا منظر کی جزئیات بیان کر کے اس کی پوری تصویر الفاظ میں کھینچ دیتے ہیں۔ اس حوالے سے ان کی نظم ''برما کی برسات'' کے اشعار ملاحظہ ہوں:

آئی ہے دبے پاؤں صبا اس کو جگانے
انگڑائیاں لیتے ہوئے سبزے کی ادا دیکھ
سورج کا پتا پوچھتی پھرتی ہے خدائی
بادل کو اس انداز سے گردوں پہ گھرا دیکھ(23)

مولانا ظفر علی خان کی شاعری ایک ایسے قادر الکلام اور بدیہہ گو شاعر کا کلام ہے۔ جس کے خیالات میں سمندروں کا سا طوفان اور دریاؤں کی سی روانی ہے جس نے طوفان آفریں جذبات کو اشعار کے نازک آبگینوں میں بند کر دیا ہے۔ داغ اور حالی نے بھی ظفر کی زبان اور قدرت زبان کو سراہا ہے۔

حوالہ جات

1۔ ڈاکٹر نظیر حسنین زیدی، ''مولانا ظفر علی خان احوال و آثار''، لاہور: مجلسِ ترقی ادب، طبع اول، ۱۹۸۶ء، ص: ۳۳
2۔ ایضاً، ص: ۴۱
3۔ ایضاً، ص: ۴۵
4۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، ''مولانا ظفر علی خاں، حیات، خدمات و آثار''، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۳ء، ص: ۴۲
5۔ ایضاً، ص: ۵۱۵
6۔ ظفر علی خان، ''کلیاتِ ظفر علی خان'' (بہارستاں)، لاہور، الفیصل ناشران، ۲۰۰۷ء، ص: ۳
7۔ ایضاً، ص: ۲۴
8۔ ایضاً، ص: ۱۳
9۔ مولانا ظفر علی خان، ''بہارستان''، لاہور، مولانا ظفر علی خان ٹرسٹ، ۲۰۰۸ء، ص: ۲۳
10۔ ظفر علی خان، ''کلیاتِ ظفر علی خاں'' (حبسیات)، لاہور، الفیصل ناشران ۲۰۰۷ء، ص: ۹۲
11۔ ظفر علی خاں، ''کلیاتِ ظفر علی خاں'' (بہارستان)، لاہور، الفیصل ناشران، ۲۰۰۷ء، ص: ۴۵
12۔ ایضاً، ص: ۲۱۴
13۔ ایضاً، ص: ۳۱۵

14۔ ایضاً،ص:۴۶۲
15۔ ایضاً،ص:۹۴
16۔ مولانا ظفر علی خان، ''حبسیات''، لاہور، مولانا ظفر علی خان ٹرسٹ، ۲۰۰۸ء،ص:۹۷
17۔ مولانا ظفر علی خان، '' کلیاتِ ظفر علی خان'' (بہارستان)،ص:۵۶۶
18۔ ایضاً،ص:۵۰
19۔ ایضاً،ص:۱۸۲
20۔ ایضاً،ص:۳۸
20۔ ایضاً،ص:۱۰۶
21۔ ایضاً،ص:۷۸

مولوی ابراہیم میرؒ سیالکوٹی کی ادبی خدمات

مولوی ابراہیم میر سیالکوٹیؒ (۱۸۷۴ء، ۱۹۵۶ء) سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔آپؒ سکاچ مشن ہائی سکول گندم منڈی سیالکوٹ میں علامہ محمد اقبال کے ہم جماعت تھے۔(1) سکول کی تعلیم کے دوران ہی انھوں نے سیالکوٹ کے ایک متقی و متجر عالم مولانا ابوعبداللہ المعروف غلام حسن (یہ عالم دین علامہ اقبال کے ابتدائی اُستاد تھے) کے سامنے زانوئے شاگردی تہہ کیا۔(2) مرے کالج سیالکوٹ میں آپ کو مولوی میر حسن کی شاگردی بھی میسر آئی۔آپ نے عربی کے ساتھ ساتھ فارسی زبان میں بھی مہارت حاصل کر لی، سکول کی طرح کالج میں بھی آپ کو علامہ اقبال کی ہم نشینی و صحبت حاصل رہی۔(3)

مولوی ابراہیم سیالکوٹی انتہائی ذہین و فطین اور قوی حافظہ کے مالک تھے۔انھوں نے صرف ایک ماہ کے قلیل عرصہ میں پورا قرآن پاک حفظ کیا۔(4) مولانا موصوف نے اپنی تعلیم کا آغاز دنیاوی تعلیم سے کیا لیکن دینی تعلیم کے حصول کے لیے بیسویں صدی کے عالم باعمل مولانا عبدالمنان وزیر آبادیؒ کے حلقہ درس میں داخل ہو گئے۔(5) جہاں تفسیر، حدیث اور دیگر علوم دینیہ اور عربی زبان پر مہارت تامہ حاصل کی۔بعد ازاں سید نذیر حسین محدث دہلویؒ کے حلقہ درس میں شامل ہو کر مسند و اجازۂ حدیث سے متفخر ہوئے۔(6)

مولانا سیالکوٹی نہ صرف نامور مشاہیر کے شاگرد تھے۔بلکہ ان کے مراسم عظیم شاعر فیض احمد فیضؔ کے والد محترم سلطان محمد خان کے ساتھ بھی تھے۔یہی وجہ ہے کہ فیض احمد فیض نے قرآن مجید کے ابتدائی پارے مولانا موصوفؒ کے مدرسے میں حفظ کیے اور اسکاچ مشن ہائی سکول میں ان سے علوم مشرقی کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی۔(7)

مولوی ابراہیم میر سیالکوٹی عالم باعمل ہونے کے ساتھ ساتھ مذہبی و دینی نثر نگار تھے۔ان کی اُردو نثری کتابیں تفسیرِ قرآن مجید، سیرت النبیؐ، مناظروں اور تقابل ادیان پر مشتمل ہیں۔مولوی موصوف عربی، فارسی اور اردو زبان پر دسترس رکھتے تھے۔ڈاکٹر وحید قریشی مولوی ابراہیم

کے حوالے سے رقمطراز ہیں:

برطانوی عہد کے آغاز میں بھی سیالکوٹ میں عربی فارسی اور اردو کی روایت خاصی مستحکم دکھائی دیتی ہے۔ مولانا غلام حسن اور شمس العلماء مولوی میر حسن کی علوم مذہبی میں دسترس اور فارسی زبان و ادب پر قدرت کے چرچے آج تک سنے جاتے ہیں۔ دینی تحریکوں میں سیالکوٹ اہلِ حدیث کا بہت بڑا مرکز بنا اور مولوی ابراہیم میر کے نام کا ڈنکا آج بھی بجتا ہے۔ 8 تفسیر، حدیث، فقہ و اُصول، سیرت، تاریخ و تذکرہ، فلسفہ و منطق، لغت، علوم بلاغت اور تقابل ادیان سے متعلق ان کا ذخیرہ معلومات بہت وسیع و عمیق تھا۔ آپ ایک مبلغ، خطیب، مناظر اور بہت بڑے مصنف تھے۔ مولانا سیالکوٹیؒ کی تمام تصنیفات اُردو زبان میں ہیں لیکن ان میں سے اکثر کے نام عربی زبان میں ہیں۔

عبدالرشید عراقی مولانا سیالکوٹیؒ کی کتب کی تعداد کے بارے میں لکھتے ہیں: آپ نے اپنی ۸۲ سالہ زندگی میں گرانقدر کتب و رسائل تصنیف کیے۔ جن کی تعداد نوے تک بتائی جاتی ہے۔(9) مولانا محمد اسحاق بھٹی کے مطابق مولانا ابراہیم میر سیالکوٹی کی کتب کی تعداد ۸۴ ہے۔ ان کی کچھ کتب غیر مطبوعہ بھی ہیں۔(10)

مولانا سیالکوٹی نے اپنی تصنیفات و رسائل مختلف موضوعات پر لکھے ہیں۔ ان میں سے چند اہم کتب کا مختصر تعارف پیش کیا جاتا ہے ''واضح البیان'' مولانا کی تفسیری تصنیفات میں بڑی اہمیت و شہرت کی حامل تفسیر ہے۔ اس کا مکمل نام ''واضح البیان فی تفسیر اُم القرآن'' ہے۔ یہ سورت الفاتحہ کی طویل و مفصل تفسیر ہے۔ سورہ الفاتحہ کی آیات صرف سات ہیں مگر یہ مختصر آیات تمام مضامین قرآن پر مشتمل ہیں۔ مولانا کی تفسیر سے ثابت ہوتا ہے کہ سورت الفاتحہ تمام قرآنی مباحث کا مجموعہ اور حقیقتاً اُم القرآن ہے۔ اس تفسیر میں مولانا نے ۳۹۰ عنوانات پر بحث کی ہے۔ یہ تفسیر پہلی مرتبہ ۱۹۳۳ء میں ''الھادی'' سیالکوٹ سے مولانا نے خود شائع کی جو ۴۴۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ ۱۹۳۱ء میں مولانا ابوالکلام آزاد نے اسی انداز سے سورۃ الفاتحہ کی تفسیر شائع کی۔ حسن عبارت اور ادبی چاشنی کے ساتھ ساتھ اس تفسیر میں بعض مقامات پر ایسی مبہم عبارات تھیں۔ جن کی غلط فہمی سے عقائد کی گمراہی کا خدشہ تھا۔ چنانچہ مولانا سیالکوٹی نے عالمانہ و محققانہ انداز میں ایسی واضح تفسیر بیان کی کہ کسی قسم کا ابہام باقی نہیں رہتا۔

مولانا حنیف ندوی مولانا ابوالکلام آزاد اور مولوی ابراہیم میر سیالکوٹی کی تفسیر قرآن کا موازنہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ابوالکلام کی تفسیر میں الفاظ ہیں اور یہاں (مولانا سیالکوٹی کی

تفسیر میں) شروع سے آخر تک علم ہی علم ہے۔(11)

مولانا سیالکوٹی ساری عمر تفسیر قرآن کی زبانی و تدریسی خدمات سرانجام دیتے رہے مگر انھوں نے قرآن کی مکمل تفسیر تالیف نہیں کی ، البتہ زندگی کے آخری سالوں میں احباب کے اصرار پر قرآن کی بعض سورتوں کی تفاسیر لکھیں ۔مولانا نے اپنی زندگی کے آخری چند سالوں میں قرآن کی مکمل تفسیر لکھنے کا ارادہ کیا۔اس سلسلے میں وہ صرف تین اجزا ہی مکمل کر پائے تھے کہ انتقال فرما گئے اور ''تبصیر الرحمن'' کا جز سوم ان کی وفات کے بعد زیور طباعت سے آراستہ ہوا۔تفسیر کا ہر ایک جُز ایک پارہ پر مشتمل ہے جن کی ضخامت ۲۵۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ تفسیر شیخ علی مہائمی کی تفسیر رحمانی کی طرز پر لکھی گئی ہے۔تفسیر میں ربطِ عبارت اس کی خصوصیت ہے۔ترجمہ اور تفسیر کی اردو عبارت کے ساتھ قرآن کے عربی الفاظ کو ایسے جمع کیا ہے کہ یہ تسلسل ٹوٹتا نہیں بلکہ ہر کلمہ دوسرے سے جُڑا ہوا معلوم ہوتا ہے۔جس سے کمالِ حظِ قلبی حاصل ہوتا ہے۔ یہ تفسیر مسلمان کمپنی سوہدرہ سے شائع ہوئی۔''احجاف اللھف فی تفسیر سورۃ الکہف'' سورۃ الکہف کی تفسیر مولانا سیالکوٹی کیتیسری کتاب ہے جو''تبصیر الرحمن'' کے انداز سے لکھی گئی ہے۔ یہ تفسیر علمی و تحقیقی اسلوب میں تفصیل کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔اس میں بہت سے اہم مباحث کما حقہ بیان کیے گئے ہیں۔ مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام،حضرت خضر علیہ السلام اور اصحاب کہف کے قصے کے اہم نکات پر گہری تحقیق پیش کی گئی ہے۔ یہ تفسیر پہلی مرتبہ ستمبر ۱۹۳۹ء میں مولانا نے خود شائع کی۔تقریباً نصف صدی کے بعد دوبارہ مکتبہ ثنائیہ سرگودھا سے شائع کی گئی۔

''الدرالنظیم فی تفسیر سورۃ القرآن العظیم'' قرآن مجید کی آٹھ سورتوں کی تفسیر کا مجموعہ ہے۔جن میں سورہ الحجرات،سورۂ ق،سورۂ البلد،سورۂ البینہ،سورۂ العصر،سورۂ الفیل،سورۂ القریش ،سورۂ الکوثر شامل ہیں۔ یہ تفسیر ۱۲۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب مولانا نے اپنے دفتر تبلیغ سنت سیالکوٹ سے ۱۹۴۶ء میں شائع کی۔ یہ تفسیر اگرچہ آٹھ سورتوں پر مشتمل ہے لیکن تحقیقی لحاظ سے سوا سو صفحے کییہ تفسیر بلاشبہ ایک علمی شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے۔اس میں بعض ایسے نکات ہیں جو دیگر اُردو تفاسیر میں بالکل نظر نہیں آتے۔

''تفسیر سورہ ثلاثہ'' مولانا کی تفسیری تصنیف ہے۔ یہ''سورۂ نجم''،''سورۂ الرحمن'' اور'' سورۃ الواقعہ'' کی تفسیر پر مشتمل ہے۔ یہ بیاسی صفحات پر مشتمل تفسیر ۱۹۴۰ء میں مولانا نے خود شائع کی۔" ریاض الحسنات" پانچ سورتوں السجدہ ،یٰسین ،الملک ،نوح اور المزمل کے ترجمہ اور اہم

حواشی کے ساتھ پہلی مرتبہ ۱۹۴۶ء میں ''پنجسورہ محشیٰ'' کے نام سے شائع ہوئی۔مولانا کیتصنیف '' حلاوۃ الایمان بتلاوۃ القرآن'' ایک رسالے پر مشتمل ہے۔ یہ رسالہ قرآن کے فضائل و آداب ،قرات وتجوید اور مخارج حروف کا بیان ہے۔ یہ رسالہ ۱۹۴۰ء میں شائع ہوا۔مولانا سیالکوٹی کی تصنیف ''تفسیر القرآن'' میں تفسیر قرآن کے متقدمین کے بیان کردہ تمام اصول وضوابط کو جمع کر دیا گیا ہے۔بعض دیگر قرآنی مباحث بھی ہیں۔''تائید القرآن'' مولانا کی تصنیف کتاب عیسائی اکبر مسیح کی کتاب ''تاویل القرآن'' کے جواب میں لکھی گئی۔جس میں اکبر مسیح نے قرآن کو ہدف اعتراض قرار دیا ہے۔آپ نے اس کا عالمانہ ومحققانہ جواب ''تائید القرآن'' کے نام سے لکھا جو رسالہ ''الھادی'' سیالکوٹ میں ۱۹۰۵ء سے مسلسل بالاقساط چھپتا رہا اور مسٹر اکبر مسیح کی زندگی میں چھپا اور مسیحی رسالہ ''ترقی وتجلی'' کے تبادلہ میں عیسائیوں کو پہنچایا جاتا رہا۔ بعد میں یہ کتاب باقاعدہ ۲۹۹ صفحات میں شائع ہوئی۔جمع وتالیف قرآن کے متعلق یہ ہندوستان کی سب سے پہلی کتاب ہے۔(12)

''اعجاز القرآن'' میں مولانا سیالکوٹی نے اکبر مسیح کی کتاب ''تنویر الاذہان فی فصاحۃ القرآن'' کا جواب دیا ہے۔ ۱۴۸ صفحات پر مشتمل یہ کتاب ۱۹۰۸ء میں شائع ہوئی۔''تعلیم القرآن'' میں قرآن مجید کی تعلیمات بیان کی گئی ہیں۔ یہ کتاب ۱۹۱۰ء میں شائع ہوئی۔

''اربعین نبویہ'' مولانا سیالکوٹی کی چالیس صفحات پر مشتمل تصنیف ہے۔ یہ کتاب چالیس احادیث نبویہ کا مجموعہ بمع ترجمہ وتشریح ہے۔ یہ پہلی دفعہ ۱۹۳۵ء میں مولانا نے خود شائع کی۔''گلدستہ سنت'' مولانا کی کتاب سات حصوں پر مشتمل ہے۔جن میں سنت نبویہ کا بیان ہے۔ مولانا کی کتاب ''نماز مسنونہ مترجم'' ہے۔جس میں نمازِ مسنونہ کا طریقہ،طہارت کے مسائل،نماز عیدین کے مسائل،قربانی کے مسائل، جمعہ ونمازِ جنازہ کے مسائل بڑی وضاحت سے بیان کیے گئے ہیں۔''الحج والنحج'' رسالہ مولانا سیالکوٹی نے حج اور قربانی کے مسائل کے بارے میں لکھا۔

''فرقہ ناجیہ'' رسالہ مولانا نے اہلِ حدیث اور حضرات حنفیہ میں طریقِ اعتدال پیدا کرنے کے لیے تصنیف کیا۔اس میں فرقہ ناجیہ کی تحقیق ہے کہ وہ کون سا ہے؟ اور اجتہاد وتقلید کی حقیقت اور ان کی حدود کیا ہیں؟ یہ رسالہ مولانا نے انگریزی ترجمہ کے ساتھ بھی شائع کیا۔ان کی تصنیف ''قرۃ العین بمسرۃ العیدین'' میں عیدین کے مسائل بیان کیے گئے ہیں۔''خطبہ رمضان'' میں مولانا سیالکوٹی نے حضرت سلمان فارسیؓ کے ایک مشہور خطبہ حدیث کی تشریح کی ہے۔اور

اس میں بہت سے مسائل بیان کیے ہیں۔

''تاریخ نبویؐ'' سیرت النبیؐ پر اختصار کے ساتھ لکھی گئی ہے اور اردو زبان میں لکھی جانے والی اولین کتاب ہے۔" رحمۃ اللعالمین''، ''سیرت النبی'' اور ''سیرت خیر البشرؐ'' سب اس کے بعد کی تصانیف ہیں۔ مولانا کی تصنیف ''سیرت مصطفیٰ'' دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ دونوں جلدوں کے ۵۵۱ صفحات ہیں۔ یہ کتاب پہلی مرتبہ ۱۹۴۴ء میں شائع ہوئی۔ مولانا نے سیرت ؐطیبہ کو چار جلدوں میں مکمل کرنے کا ارادہ کیا تھا لیکن وہ صرف دو جلدیں ہی مکمل کر پائے اور وہ دونوں جلدیں شائع ہوگئیں۔ اس کتاب میں سیرت النبیؐ کے ان پہلوؤں پر خصوصاً روشنی ڈالی گئی ہے۔ مثلاً رسولؐ اللہ کے اجداد، مذہب، حضرت حلیمہؓ کے حالات اور حضرت ابو طالب کی بیوی کا نبی کریمؐ سے شفیق رویہ۔ سیرت النبیؐ کی تحریر سادہ زبان میں ہے۔ مولانا نے اپنی تمام تصانیف میں عام فہم اور سادہ اسلوب و بیان اختیار کیا ہے تا کہ قارئین کو بات سمجھنے میں دقت کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ ان کے اسلوب میں رنگین بیانی اور تکلف و تصنع کہیں بھی نہیں ملتا۔ مولانا ابراہیم میر سیالکوٹی کی طرزِ تحریر و طریق بیان اور اسلوب کے حوالے سے سیرت مصطفیٰؐ کی ایک مختصر تحریر ملاحظہ ہو:

> سیرت و تاریخ کی کتابوں میں عبارت سادہ ہونی چاہیے تا کہ واقعہ اپنی صورت و نوعیت سے خود اثر ڈالے، اگر مضمون کو عبارت آرائی سے رنگین کیا جائے تو اس میں مصنف کے تکلف و تصنع کا وہم ہو سکتا ہے۔ کہ اس نے اپنی صنعت سے واقعہ کو ایسے سانچے میں ڈھال دیا ہے جیسا کہ بہت سے ہمعصر اس رنگ میں رنگے ہوئے ہیں، ہاں طرز بیان دلکش اور عبارت شستہ اور معنی خیز اور مناسب موقع ہونی چاہیے جس طرح سے پڑھنے والے کے دماغ میں واقعہ کی اصل صورت کا فوٹو اُتر سکے۔ (13)

مولوی ابراہیم میر سیالکوٹی کے سادہ اسلوب کے حوالے سے ''سیرتِ مصطفیٰؐ'' کے باب دوم سے ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے:

> آنحضرتؐ کی ولادت کی خبر آپؐ کے ضعیف العمر دادا کو پہنچائی گئی جس پر وہ از حد خوش ہوئے کیونکہ آپؐ ان کے پیارے اور فوت شدہ بیٹے کے یادگار تھے۔ ۱۸ سالہ نوجوان بیٹے کی موت سے ضعیف العمر باپ کے دل پر جو زخم لگا تھا۔ آپؐ کی ولادت اس کے لیے مرہم اندمالی ثابت ہوئی۔ اس طرح عبدالمطلب کے

دوسرے بیٹوں کے گھروں میں نہایت خوشی ہوئی۔ قدرتی طور پر آپؐ کا حلیہ خدوخال اور حسنِ خداداد اپنے والد کے حلیہ اور حسن کا جواب تھا۔(14)

مولانا سیالکوٹیؒ ''سیرتِ مصطفیٰؐ'' میں واقعات پر رائے زنی کے وقت علل واسباب پر بحث کرتے ہوئے حالات واجزائے واقعہ کے خلاف محض خودساختہ وجوہ پر فیصلہ نہیں دیتے۔ جیسا کہ یورپ کے بعض متعصب مصنفین خصوصاً سر ولیم میور کی روش تھی۔ مولانا نے واقعات کے بیان میں طوالت مخل اور اختصار مخل سے پرہیز کیا ہے۔ بعض مورخین نے تاریخ وسیرت کو بعض شخصی حالات اور بعض حروب وفتوحات اور بعض اہم انقلابات کے بیان میں محصور کر دیا ہے۔ اور ان امور کے متعلق بعض طویل و بے سروپا قصے اور کہانیاں بھی بھر دی ہیں۔ مولانا کی سیرت پر لکھی کتاب مذکورہ بالا خامیوں سے پاک ہے۔ بعض مصنفین سیرت نے فن سیرت کو آنحضرتؐ کے فضائل وخصائل اور اہم تاریخی واقعات کے بیان تک محدود رکھا ہے۔ لیکن ''سیرت مصطفیٰؐ'' ایک ایسی کتاب ہے۔ کہ اس میں فضائل وخصائل اور سیاسی وتاریخی واقعات کے ساتھ ساتھ اشاعت اسلام اور اس کے مناسب حال آیاتِ قرآنیہ کا نزول سب کچھ مذکورہ ملتا ہے۔ کیونکہ آنحضرتؐ کی بعثت کا اصل مقصود اعلائے کلمۃ اللہ ہے گویا اس کتاب کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس میں ضمناً قرآن شریف کے بعض مقامات کی تفسیر بھی ملتی ہے۔ جس طرح کہ ''سیرت ابنِ ہشام'' اور امام ابن قیمؒ کی ''زادالمعاد'' میں ہے۔

''حبیب خداؐ'' مولانا سیالکوٹی کی سیرت پر مختصر تصنیف ہے۔ اس کا مکمل نام ''اوجز السیر فی احوال سید البشرؐ'' ہے۔ ''اخلاقِ محمدیؐ'' اور ''اصلاحِ عرب'' تصنیفات مقاصد نبوت میں کامیاب ہونے کے بارے میں ہیں۔ اصلاح عرب میں رسولؐ کی بعثت سے قبل کی حالت بیان کی گئی ہے اور پھر آپؐ کے بعد عربوں میں جو زبردست اصلاحی انقلاب آیا اس کی تفصیل معرضِ تحریر لائی گئی ہے۔ ''سراجاً منیرا'' تصنیف میں نبیؐ کے فیوض روحانیہ بیان کیے گئے ہیں۔ یہ کتاب پہلی دفعہ ۱۹۴۴ء میں طبع ہوئی۔ ''علمائے اسلام'' رسالہ مولانا سیالکوٹی کے رسالہ ''الھادی'' میں شائع شدہ ان مضامین کا مجموعہ ہے جن میں علمائے اسلام کی دینی خدمات کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ دراصل اس رسالہ کا مقصد رسولؐ اللہ کے فیوض کی بقا کو بیان کرنا ہے۔

''سیرتِ محمدیہؐ'' مولانا کا ۲۴ صفحات کا رسالہ ہے جو اکتوبر ۱۹۳۱ء کو چھپا۔ یہ رسالہ ایک غیر مسلم معترض کے جواب میں لکھا گیا جس نے لکھا تھا کہ آپؐ بیس برس تک بھیڑ بکریاں

چراتے رہے۔ یہ اعتراض مولانا کو انگریزی زبان میں ملا۔ مولانا نے اس کا جواب بنام ''سیرتِ محمدیہؐ'' لکھا اور اس کا ترجمہ کروا کر انگریزی میں بھی چھپوایا۔ اسے ملایا اور ڈچ زبانوں میں بھی پچپن ہزار کی تعداد میں طبع کیا گیا۔

''بشارتِ محمدیہؐ'' تصنیف اثباتِ نبوت کے ضمن میں بہت اہم ہے۔ اس میں دیگر مذہبی کتابوں سے رسولؐ کے بارے میں دی گئی بشارتوں کا ذکر ہے۔ اس میں الہامی مذاہب کے علاوہ ہندو مذہب کی کتاب سام وید سے بھی ایک بشارت کا ذکر ہے۔ جس کا جواب کسی ہندو نے نہیں دیا۔(15) ''وہ نبیؐ اور عہد کا رسول'' تصنیف بائبل کی بشارات پر مبنی ہے جو رسول اللہ کے بارے میں آئی ہیں۔ یہ کتاب تاریخی اور جغرافیائی حوالہ جات سے مزین کی گئی ہے۔ یہ کتاب مولانا نے تبلیغ سنت کے دفتر سے ۱۹۴۶ء میں شائع کی۔ ''اسوہ حسنہ'' مولانا کا سیرت رسولؐ کے حوالے سے سولہ صفحات پر مشتمل رسالہ ہے۔ جو اکتوبر ۱۹۳۷ء میں چھپا۔ اس میں مولانا نے قرآن مجید کی روشنی میں مسلمانوں کو اتباعِ سنت کی تلقین کی ہے۔

''احکام المرام باحیاء آثر علما الاسلام'' میں بائیس فقہا و محدثین کے حالات بیان کے گئے ہیں۔ یہ کتاب ۱۵۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ پہلی مرتبہ ۱۹۰۶ء میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب دراصل مولانا میر کی ادارت میں نکلنے والے رسالہ ''الھادی'' سیالکوٹ کی جلد اشمارہ ۴ تا ۱۲ اور جلد ۲ کے شمارہ ۱ تا ۱۱ میں شائع ہونے والے مضامین پر مشتمل ہے۔ ''زاد المتقین'' رسالہ میں مولانا نے ازدواج مطہرات کے حالات پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ رسالہ مولانا نے ''الھادی'' کے دفتر سے ۱۹۴۲ء میں شائع کیا۔

''تاریخ اہلِ حدیث'' کتاب مولانا نے اہلِ حدیث فکر کے بارے میں پیدا شدہ غلط فہمیوں کے ازالہ کے لیے تحریر کی۔ جس کے حصہ اول میں رسولؐ کے بعد ملت اسلامیہ میں مختلف فرقوں کا ظہور اس کی وجوہات اور ان کے عقائد بیان کیے گئے ہیں۔ دوسرے حصے میں علم حدیث کی تدوین کا تاریخی جائزہ لیا گیا ہے اور تیسرے حصے میں ہندوستان کے علمائے اہل حدیث کی خدمات و حالات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ''خیر الخلائق والخصائل'' رسالہ مولانا نے ۱۹۴۳ء میں تحریر کیا۔ جس کو ''سیرت مصطفیٰؐ'' جلد دوم کے تتمے کی حیثیت حاصل ہے۔ ''تحفتہ الاذکیاء وطرفتہ الاصفیاء فی الاعتبار والاقتباس باحوال الانبیاء'' رسالے میں مولانا نے وضاحت کی ہے کہ انبیا کرام کو دین و دنیا کے ہر معاملے میں ہادی و رہنما ماننا چاہیے۔ یہ رسالہ غیر مطبوعہ ہے۔

''انارۃ المصابیح لا داء صلواۃ التراویح ،فضائل شعبان''، ''برکات الصلوۃ''، ''نمازِ تہجد''، ''ثبوت جنازہ''، ''رسالہ یک روزہ''، ''نمازہ غائب برائے جنازہ غائب'' اور ''انہتر خصائل ایمان'' مولانا سیالکوٹی کی فضائل وعبادات سے متعلقہ تالیفات ہیں جو ۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۵ء تک سیالکوٹ سے طبع ہوئیں۔ ''شہادت القرآن'' حصہ اول کتاب میں مولانا نے حضرت عیسیٰؑ کی حیات اور رفع آسمانی کا ذکر کیا ہے۔ مرزا قادیانی نے حضرت عیسیٰ علیہ اسلام کی حیات اور ارفع آسمانی سے انکار کیا اور خود مسیح موعود ہونے کا دعویٰ کیا۔ مولانا سیالکوٹی نے مذکورہ کتاب میں حضرت عیسیٰؑ کے رفع جسمانی کو قرآن کی نو آیات سے ثابت کیا ہے۔ یہ بحث مکمل، مدلل اور سیر حاصل ہے ۔ یہ کتاب پہلی بار ۱۹۰۳ء میں شائع ہوئی۔

''شہادت القرآن'' حصہ دوم میں مولانا میر نے ان تیس دلائل کا جواب دیا ہے جو مرزا غلام احمد قادیانی نے حضرت عیسیٰؑ کی وفات قبل النزول پر بزعم خود قرآن سے پیش کیے۔ یہ حصہ مرزا قادیانی کی زندگی ہی میں ۱۹۰۵ء میں طبع ہوا۔ مگر وہ اس کا جواب نہ لکھ سکا۔ "عصمتِ انبیا" تصنیف مولانا نے عیسائی مصنف کی کتاب ''بے گناہ نبی'' اور پادری اکبر مسیح کی کتاب ''انکارِ عصمت انبیا'' کے جواب میں لکھی کیونکہ ان کتب میں حضرت عیسیٰؑ کے علاوہ اکثر انبیا کو گناہ گار لکھا گیا تھا۔ مولانا نے تمام انبیا کو معصوم ثابت کیا ہے۔ ''عصمت النبیؐ''، ''عصمتِ نبوتؐ'' اور ''کسر الصلیب'' تینوں کتب مولانا نے عیسائیت کے رد میں لکھی ہیں۔ ان میں ان کے اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے اور ثابت کیا گیا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کو صلیب نہیں دی گئی تھی۔ ''آئینہ قادیانیت'' اور ''مرقع قادیانیت'' مولانا نے قادیانیت کے حوالے سے لکھی ہیں۔

''پیغامِ ہدایت در تائید مسلم لیگ'' مولانا سیالکوٹی کے گیارہ مضامین کا مجموعہ ہے جو ''الھادی'' میں شائع ہوئے۔ مولانا سیالکوٹی مسلم لیگ کے سرگرم کارکن تھے اور یہ مضامین کانگریس کی مخالفت اور مسلم لیگ کے حق میں لکھے جو ایک مجموعے کی صورت میں بھی شائع ہوئے۔ ''تائید مودودی در مخاطبت مودودی'' مولانا سیالکوٹی کے خطوط کا مجموعہ ہے۔ بعض مسائل میں مولانا سیالکوٹی کو مولانا مودودیؒ سے اختلاف تھا۔ انھوں نے ۱۹۴۶ء میں مولانا مودودی سے خط وکتاب کی۔ اس مجموعہ میں وہ تمام خطوط جمع ہیں۔ یہ مجموعہ غیر مطبوعہ ہے۔ ''فلسفہ ارکانِ اسلام'' تصنیف میں مولانا سیالکوٹی نے ارکانِ اسلام کا فلسفہ بیان کیا ہے۔ ''توحید الٰہی اور مسنون زندگی'' میں مولانا نے بتایا ہے کہ توحید یہ ہے کہ اپنی زندگی کو نبی کریمؐ کے تابع کیا جائے۔ ''احیاء

المیت''، کتاب مولانا سیالکوٹی نے آئمہ اہل سنت اور آئمہ اہلِ بیت کی تعظیم وتکریم کے موضوع پر لکھی ہے۔

"سلم الوصول الی اسرار اسراء الرسولؐ"، "الخبر الصیح عن قبر المسیح"، "نزول الملائکۃ والروح الی الارض"، "رسائل ثلاثہ"، "صدائے حق"، "تردید مغالطاتِ مرزائیہ"، "ختم نبوتؐ"، "ختم نبوتؐ اور مرزا قادیانی"، "قادیانی مذہب"، "خلاصہ مسائل قادیانیہ"، "فیصلہ ربانی"، "برمرگِ قادیانی"، "رحلت قادیانی بمرگِ ناگہانی"، "تبصیر بخواب اشتہار تنویر"، "الکواکب المضیئۃ لازالۃ شبہات الشعیہ"، "خلافت راشدہ"، "قوم و مذہب"، "الخیر الجاری"، "نعم الرقیم فی مولد النبیؐ"، "افتراق اُمت اور طریق سنت"، "المحقق ھو الاوّل اور العجالۃ الخضریۃ فی جمع الرسالۃ والبشریۃ" مولانا ابراہیم میر سیالکوٹی کی مناظرانہ اور عقائد سے متعلقہ تصانیف ہیں۔

مولانا ابراہیم میرؒ سیالکوٹی کا تفسیر قرآن مجید کا اسلوب یہ ہے کہ ہر آیت کا ایک الگ باب الگ نام سے قائم کرتے ہیں۔جس میں ہر لفظ کی خطی ترکیب اور اس کی لغوی تحقیق وتشریح کرتے ہیں اور اکثر لغوی بحوث میں عربی شاعری سے استشہاد بھی کرتے ہیں،صرفی ونحوی تحقیق اور ابلاغی نکات کا بیان کرنے کے بعد الفاظ کی تقدیم وتاخیر کے اسرار وحکم کی وضاحت اور ضروری فقہی نکات پر مدلل بحث کرتے ہیں۔ جہاں کہیں عربی عبارت بطور اقتباس درج کی ہے۔اس کے اُردو ترجمہ کا بھی التزام کیا ہے اور اس کا حوالہ بھی متن کے اندر ہی درج کیا ہے۔مولانا پنجابی زبان کے شاعر تھے چنانچہ اس ادبی ذوق کا رنگ ان کی تفسیر میں بھی جھلکتا ہے اور اکثر مقامات پر بحث کے خاتمہ پر فارسی اور اردو اشعار نظر آتے ہیں۔

ہر مفسر اپنے ذوق ورجحان کے مطابق تفسیر کرتا ہے۔اس لیے ہمیں تفاسیر کے اسلوب میں تنوع نظر آتا ہے۔کہیں محدثانہ رنگ غالب ہے تو کہیں ادیبانہ اسلوب اور کہیں متکلمانہ انداز نظر آتا ہے۔لیکن مولانا سیالکوٹی نے کسی ایک منہج ورجحان کو نہیں اپنایا بلکہ تمام مسالک کی تفسیر کو ملحوظِ خاطر رکھا ہے۔اسی لیے اس میں حدیث وسنت سے استدلال بھی ہے اور بلاغت کی ابحاث بھی ،صرفی ونحوی نکات کا بیان بھی ہے اور متکلمانہ مجادلہ بھی،سلف کے مقرر کردہ تفسیر قرآن کے اُصول مد نظر رکھتے ہوئے تفسیر بالرائے سے گریز کیا ہے۔مگر تفسیر کو متقدمین کے بیان تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ اپنے زمانے کی ذہنیت وروش کا پورا لحاظ رکھا ہے۔ براہین منقولہ ومعقولہ دونوں کی مدد سے اپنے دور میں پیدا ہونے والے انکارِ حدیث اور ختم نبوت جیسے فتنوں سے پیدا ہونے والے شکوک

وشبہات کا ازالہ کیا ہے۔

مولانا سیالکوٹی کی تفسیر قرآن میں جہاں کہیں علمی بحث طویل ہو جاتی ہے وہاں بحث کے آخر میں تتمہ بحث کے عنوان سے تمام بحث کا خلاصہ اور نچوڑ بیان کر دیتے ہیں۔ تا کہ قاری کا ذہن اصل موضوع تک آسانی سے رسائی حاصل کر سکے۔ نیز مقصودِ مخاطب کو طوالت بحث ذہن سے محو نہ کر دے۔ مثلاً سورہ فاتحہ کی تفسیر کے چوتھے جز میں (مالک یوم الدین) کی تفسیر میں اُخروی جزا وسزا کی بحث صفحہ ۱۸۴ سے ۲۲۷ تک چلتی ہے۔ اس کا لب لباب آخر میں انھوں نے ایک صفحہ میں بیان کر دیا ہے۔ اس طرح دوسرے جز میں (الحمداللہ) کی تفسیر صفحہ ۱۱۶ تا ۱۶۸ تک ۵۲ صفحات پر محتوی ہے۔ چنانچہ جز کے آغاز میں اس آیت کا سادہ اردو ترجمہ تو دیتے ہیں۔ تفسیر کے خاتمے پر ''الاجمال بعد التفصیل'' کے عنوان سے ترجمہ کو یوں جامع کلمات میں دیا ہے کہ ہر آیت کا مفہوم بھی واضح ہو جائے اور آیات کا باہمی ربط ونظم بھی اور باعث اختصار حفظ میں سہولت بھی ہو۔ تفسیر میں مولانا جہاں کہیں عربی اقتباس دیتے ہیں۔ اس کا ترجمہ اُردو مع حوالہ متن کے اندر ہی درج کرتے ہیں۔ قرآنی آیات کے حوالہ میں صرف سورت کا نام اور پارہ کا نمبر ذکر کرتے ہیں۔ آیت یا رکوع کا نمبر درج نہیں کرتے۔ جہاں تک احادیث نبویہؐ کے حوالہ کا تعلق ہے کبھی صرف کتاب کا نام ذکر کرتے ہیں اور کبھی جلد نمبر ا اور صفحہ نمبر بھی دے دیتے ہیں اور بعض اوقات تو مؤلف کا نام بھی ذکر کر دیتے ہیں جب کہ کچھ مقامات پر پورا نام بھی نہیں لکھتے مثلاً حصن الحصین کو صرف الحصن یا تیسیر الوصول کی بجائے صرف تیسر ہی لکھنے پر اکتفا کیا ہے۔(16)

مولانا سیالکوٹی تفاسیر سے بالواسطہ اور براہ راست ہر دو طرح سے اقتباس لیتے ہیں، براہ راست اقتباس لینے کی صورت میں اقتباس سے پہلے مفسر کا نام ذکر کرتے ہیں۔ جبکہ اقتباس کے بعد حوالہ میں تفسیر کا نام جلد نمبر اور صفحہ نمبر درج کرتے ہیں۔ بعض مقامات پر براہ راست اقتباس کی بجائے صرف مفہوم ہی کو اپنے لفظوں میں بیان کرتے ہیں۔ اس صورت میں فٹ نوٹ پر مآخذ کا ذکر کرتے ہیں۔ جب ایک ہی مضمون ومفہوم ایک سے زیادہ تفاسیر میں پاتے ہیں تو ایک معروف تفسیر سے اقتباس لے کر حاشیہ میں دیگر تفاسیر کا ذکر کر دیتے ہیں۔ مثلاً (غیر المغضوبِ علیھم) کی تفسیر میں علامہ زمخشریؒ کی ''تفسیر الکشاف'' سے اقتباس لیتے ہیں۔(17)

جہاں تک شروحات کتب احادیث وکتب فقہ وغیرہ کا تعلق ہے تو مصنف کا نام اقتباس سے پہلے ذکر کرتے ہیں جب کہ اقتباس کے بعد حوالہ دیتے ہوئے جلد نمبر اور صفحہ نمبر لازماً درج

کرتے ہیں اور بعض مقامات پر مطبوعہ دہلی یا مصر بھی لکھا ہے۔ مگر سالِ اشاعت کا کہیں ذکر نہیں ،مثلاً ''فتح الباری'' کا حوالہ میں یوں اندراج ہے۔ فتح الباری مطبوعہ دہلی جز ۳،ص:۴۲۶۔(18) ،اسی طرح ابن قیمؒ کی '' اعلام الموقعین'' سے اقتباس لینے کے بعد حوالہ یوں درج کرتے ہیں۔ اعلام الموقعین ،جلد ۲،ص: ۴۔(19) جہاں ضروری سمجھتے ہیں تشریح کو صفحہ کے آخر پر حاشیہ میں بیان کر دیتے ہیں۔ مثلاً قرات فاتحہ خلف الامام کی دلیل کے طور پر پیش کی جانے والی حدیث عبادہ بن صامتؓ (20) کے متعلق امام بیہقیؒ کی توضیح بیان کرنے کے بعد حاشیہ میں اس توضیحی عبارت سے متعلقہ ضروری تشریح بھی دیتے ہیں۔(21)

مولانا ابراہیم میرؒ کی تمام تفاسیر قرآن میں منطقی ترتیب اور نظم موجود ہے۔ بیانِ مقصود میں تدریج کو ملحوظ رکھا گیا ہے اور تمام عبارت باہم مربوط و منظم ہے۔ بے ساختگی کے باوجود جملوں اور الفاظ میں عدم تکرار ہے۔ اگرچہ تسہیل عبارت کو پیش نظر رکھا گیا ہے اور اکثر عبارت آسان اور عام فہم ہے۔ مگر بعض مقامات پر عبارت میں قدرے مشکل الفاظ کا انتخاب بھی نظر آتا ہے۔ اس حوالے سے ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے:

> خداوند! میں کس دل اور کس زبان سے تیرا شکر کروں کہ باوجود ہجوم ہموم وغموم، تواتر امراض و احزان، کثرت اشغال و اسفار، وفور تکاسل و تانی اور عموم تسویف و تعویق جو اکثر میرے شامل حال رہتے ہیں تو نے محض اپنے فضل و کرم سے مجھ ناتواں کو توفیق بخشی اور ہمت دی کہ میں اس تفسیر کو انجام دے سکا۔(22)

مولانا ابراہیم میر سیالکوٹیؒ کا علمی و مذہبی کام محاسن و معائب کا بہترین نمونہ ہے۔ ان کے اندازِ تحریر کی خاص بات یہ ہے کہ ان کی نگارشات میں روایتی انداز سے ہٹ کر سادہ، سہل اور آسان اسلوبِ بیان دکھائی دیتا ہے۔ ان کا علمی و تحقیقی کام سلفی نظریات کی منہ بولتی تصویر ہے ۔مولانا سیالکوٹیؒ کا علمی سرمایہ زیادہ تر تفسیر القرآن ،سیرت النبیؐ اور تقابل ادیان پر مشتمل ہے۔ تفسیر قرآن میں مولانا سیالکوٹیؒ نے کسی ایک منہج و رجحان اپنانے کی بجائے تمام مسالک کی تفسیر کو ملحوظِ خاطر رکھا ہے۔ اسی لیے انہوں نے حدیث وسنت، ابلاغی ابحاث ،صرفی ونحوی نکات کا بیان کرتے ہیں اور متکلمانہ مجادلہ بھی کرتے ہیں لیکن اسلاف کے مقرر کردہ تفسیر قرآن کے اُصول مدنظر رکھتے ہین اور تفسیر بالرائے سے گریز کرتے ہیں۔ آپؒ نے تفسیر کو متقدمین کے بیان تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ اپنے زمانے کی ذہنیت و روش کا پورا لحاظ رکھا ہے۔ براہین منقولہ و معقولہ دونوں کی مدد سے اپنے دور میں پیدا ہونے والے انکارِ حدیث اور ختم نبوت جیسے فتنوں سے پیدا ہونے

والے شکوک وشبہات کا ازالہ کیا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ آپؒ کے علمی وادبی سرمایے میں موجودہ اہل فکر ودانش کی رہنمائی کے لئے بہت سے علمی وفکری نکات پوشیدہ ہیں۔

حواشی وحوالہ جات

1۔ عبدالرشید عراقی، النبلاء فی تراجم العلماء، بیت الحکمت، لاہور، ۲۰۰۴ء، ص: ۲۸۴
2۔ اسحاق بھٹی، برصغیر کے اہل حدیث خدام قرآن، مکتبہ قدوسیہ، لاہور، ۲۰۰۵ء، ص: ۴۷
3۔ عبدالرشید عراقی، ''النبلاء فی تراجم العلماء''، ص: ۲۸۴
4۔ مولوی ابراہیم میر سیالکوٹی، شہادت القرآن، مکتبہ ثنائیہ، سرگودھا، ۱۴۲۲ھ، ص: ۱۰
5۔ مولوی ابراہیم میر ''النبلاء فی تراجم العلماء''، ص: ۲۸۴
6۔ مولانا محمد عبدہ الفلاح، مولانا ابراہیم میر سیالکوٹی، مشمولہ سوانح حیات مولانا ابراہیم میر، جامع تعلیم القرآن، فیصل آباد، ۱۹۹۴ء، ص: ۴۲
7۔ اشفاق حسین، فیض احمد فیض۔شخصیت اور فن، مقالہ برائے ایم۔اے اردو، جامعہ کراچی، کراچی، ۱۹۷۴ء، ص: ۶
8۔ ڈاکٹر وحید قریشی ''پیش لفظ''، مشمولہ ''باقیاتِ تاثیر''، از مجید احمد تاثیر سیالکوٹی، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۰ء، ص: ۵
9۔ عبدالرشید عراقی، تذکرہ النبلاء، ص: ۲۸۴
10۔ مولانا اسحاق بھٹی، ''برصغیر کے اہلِ حدیث خدام القرآن، ص: 481
11۔ مولانا محمد اسحاق بھٹی، مولانا حافظ محمد ابراہیم میر سیالکوٹی مشمولہ سیرت المصطفیٰؐ از مولوی ابراہیم میر، سیالکوٹ، مرکزی جمعیت اہلِ حدیث سیالکوٹ، ۲۰۰۲ء، ص: ۱۴، ۱۵
12۔ مولوی ابراہیم میر، تبصیر الرحمن، ص: ۱۸۸
13۔ مولوی ابراہیم میر، طرزِ تحریر وطریق بیان، مشمولہ سیرت مصطفیٰؐ، ص: ۲۳
14۔ مولوی ابراہیم میر، سیرت مصطفیٰؐ، ص: ۱۵۴
15۔ ایضاً، ص: ۲۲۳
16۔ مولوی ابراہیم میر، تفسیر واضح البیان، ص: ۱۳۲
17۔ ایضاً، ص: ۴۲۶
18۔ ایضاً، ص: ۴۹۲
19۔ ایضاً، ص: ۴۹۴
20۔ مولوی ابراہیم، لاصلاۃ لمن لم یقر ابفاتحۃ الکتاب، ص: ۱۰
21۔ تفسیر واضح البیان، ص: ۵۳۱
22۔ ایضاً، ص: ۶۱۵

مولوی فیروز الدین ڈسکوی کی ادبی خدمات

مولوی فیروز الدین (۱۸۶۴ء۔۱۹۰۷ء) سیالکوٹ کے شہر ڈسکہ میں پیدا ہوئے۔ان کی شاعری کے ساتھ ساتھ نثری و دینی ادب میں بھی نمایاں خدمات ہیں۔نثر میں وہ بہترین سوانح نگاروں میں شامل ہیں۔سوانح نگاری کی صنف باقی اصنافِ نثر کے مقابلے میں اپنے ماحول اور اس کے رجحانات کی عکاسی زیادہ بہتر انداز میں کرتی ہے۔اُردو میں سوانح نگاری کا آغاز عہد سر سید سے ہوتا ہے۔سر سید کا دور مذہبی مناظرے اور بحث و مباحثے کا دور ہے لہٰذا اس دور کی سوانح عمریاں اپنے عہد کی عکاس ہیں۔اس دور کے مشہور سوانح نگاروں میں مرزا حیرت دہلوی، احمد حسن خان، عبدالحلیم شرر، منشی محمد الدین فوق، مولوی احمد دین، احمد حسین الہٰ آباد، مولوی ذکاءاللہ، سراجدین احمد، نذیر احمد، قاضی سلیمان، عبدالرزاق کانپوری اور مولوی فیروز الدین ڈسکوی اہم ہیں۔

مولوی فیروز الدین متعدد دینی و ادبی کتب کے مصنف ہیں۔فضائل اسلام فی ذکر خیر الانام المعروف سیرت النبیؐ یا تاریخ نبویؐ مولوی فیروز الدین کی پہلی باقاعدہ تالیف ہے۔اس کتاب کا پہلا ایڈیشن مفید عام پریس لاہور سے 1886ء میں شائع ہوا۔''نماز اور اس کی حقیقت'' ان کی اہم تالیف ہے جو منشی فیض علی نے پنجاب پریس سیالکوٹ سے ۱۸۹۰ء میں شائع کی۔''تفسیر فیروزی پارہ اول'' 1890ء میں سیالکوٹ مفید عام پریس سے شائع ہوئی۔''تکذیب و ید'' 1890ء میں پنجاب پریس سیالکوٹ سے شائع ہوئی۔''تصدیق الا لہام'' ان کی مناظراتی تصنیف ہے۔جو 1890ء میں پنجاب پریس سیالکوٹ سے طبع ہوئی۔''دعائے گنج العرش و تعویز گنج العرش'' 1891ء میں شائع ہوئی۔''عشرہ کاملہ'' 1891ء میں مفید عام پریس سیالکوٹ سے شائع ہوئی۔''سورت رحمن کی نادر تفسیر'' مولوی صاحب کی اہم تصنیف ہے۔جو 1892ء میں مطبع مفید عام پریس سیالکوٹ سے شائع ہوئی۔''اسم اعظم'' مولانا موصوف کی کتاب ہے جس میں پیرانِ پیر شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی سوانح عمری، تعلیمات اور کرامات کا بیان ہے۔یہ کتاب مفید عام پریس سیالکوٹ سے 1892ء میں شائع ہوئی۔''طریقت الحقیقت'' 1892ء میں مفید عام پریس سیالکوٹ سے شائع ہوئی۔''رسالہ ہدایت القاری'' بھی 1892ء میں مفید

عام پریس سیالکوٹ سے شائع ہوئی۔

''روزہ اور اس کی حقیقت'' مولوی صاحب کی تصنیف ہے جو مفید عام پریس سیالکوٹ سے 1893ء میں شائع ہوئی۔ الوہیت مسیح اور تثلیث کا رد'' مولوی صاحب کی کتاب ہے جو مفید عام پریس سے شائع ہوئی۔ ان کی یہ کتاب 1893ء میں شائع ہوئی۔ ''عصمت النبی عن الشرک الجلسی ''مولوی فیروز کی تصنیف ہے جو 1893ء میں شائع ہوئی۔ ''تقدیس الرسول عن طعن الجہول'' مفید عام پریس سے شائع ہوئی۔ ''برآت الرسولؐ العرب عن طعن نکاح زینبؓ المعروف بہ دفع طن نکاح زینبؓ'' 1893ء میں مفید عام پریس سیالکوٹ سے شائع ہوئی۔ ''اسرار التنزیل'' مقالہ مولوی صاحب موصوف کا مقالہ ہے جسے انجمن حمایت اسلام لاہور نے 1896ء میں شائع کیا۔ ''ضمیمہ آریہ مت کی عکسی تصویر'' مولوی فیروز کی تقابل ادیان پر تصنیف ہے۔ جو ۱۸۹۸ء میں مفید عام پریس سیالکوٹ سے شائع ہوئی۔ ''پچاس مذہبی سوالات کے جواب''1899ء میں شائع ہوئی ''نماز کی خوبیاں'' مفید عام پریس سیالکوٹ سے 1900ء میں شائع ہوئی۔ ''نماز حضوری'' مولوی صاحب موصوف کیکتاب ہے جو 1900ء میں شائع ہوئی۔ ''سورہ فاتحہ کی تفسیر'' مولوی صاحب کی کتاب ہے جو مفید عام پریس سیالکوٹ سے 1900ء میں شائع ہوئی۔ ''پیارے نبیؐ کے پیارے حالات جلد اول'' مولوی فیروز کی کتاب ہے جو مفید عام پریس سیالکوٹ سے شائع ہوئی۔

''مجموعہ خطبہ فیروزی'' مولوی صاحب کی تصنیف ہے جو 1901ء میں مفید عام پریس سیالکوٹ سے شائع ہوئی۔ ''اسلام اور اس کی حقیقت'' مولوی صاحب کی تصنیف ہے جو ۱۹۰۱ء میں مفید عام پریس سیالکوٹ سے شائع ہوئی۔ ''اسلام کی پہلی کتاب'' جو 1902ء کو مفید عام پریس سیالکوٹ سے شائع ہوئی۔ ''اسلام کی دوسری کتاب'' اور ''اسلام کی تیسری کتاب'' 1904ء کو مفید عام پریس سیالکوٹ سے شائع ہوئی۔ ''اسلام کی پانچویں کتاب'' مولوی صاحب کیکتاب ہے جو مفید عام پریس سیالکوٹ سے شائع ہوئی۔ ''انسان اور اس کی تقدیر''1902ء کو مفید عام پریس سیالکوٹ سے شائع ہوئی۔ ''قرآن مجید کے کلام الٰہی ہونے کا ثبوت" مفید عام پریس سیالکوٹ سے شائع ہوئی ہے۔

''تفسیر فیروزی سورہ عمّ'' مولوی صاحب کی کتاب ہے جو 1902ء میں مفید عام پریس سیالکوٹ سے شائع ہوئی۔ ''اسلام اور عیسائیت کا قطعی فیصلہ'' مولوی صاحب کی تقابل ادیان کے موضوع پر نایاب کتاب ہے۔ جو سیالکوٹ مفید عام پریس سے 1903ء میں شائع ہوئی۔''

قرآن شریف کی قسمیں اور ان کی فلاسفی'' 1904ء میں مفید عام پریس سیالکوٹ سے شائع ہوئی۔ ''تفسیر فیروزی تیسواں پارہ''، ''تفسیر فیروزی پارہ دوم'' مفید عام پریس سیالکوٹ سے شائع ہوئی۔ ''تفسیر فیروزی پارہ چہارم'' مولوی صاحب کی تصنیف ہے جو پنجاب پریس سیالکوٹ سے 1907ء میں شائع ہوئی۔

''گلزار یوسفی'' لاہور سے ۱۹۰۷ء میں اور ''پیارے نبی کے پیارے حالات (جلد سوم)'' مفید عام پریس سیالکوٹ سے ۱۹۰۸ء میں شائع ہوئی۔ ''مختصر قانونی اصطلاحات'' کا پہلا ایڈیشن مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد سے ۱۹۸۵ء میں شائع ہوا۔ مذکورہ بالا تصانیف کے علاوہ مولانا ڈسکوی کی لغات، لسانیات اور قواعد کے حوالے سے شہرہ آفاق کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ مذکورہ بالا کتب کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مولوی صاحب موصوف علمی، ادبی، دینی، تفسیری، سیرت نگاری، تقابل ادیان اور دیگر علوم پر کس قدر دسترس رکھتے تھے۔

اُنیسویں صدی کے نصف آخر کو استدلال اور مناظرے کی صدی کہا جا سکتا ہے اور ہر قسم کے ادب کی تخلیق انھی پہلوؤں کو پیشِ نظر رکھ کر کی جا رہی تھی۔ سوانح نگاری کو بھی انھی مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کیا گیا۔ سرسید کی ''خطباتِ احمدیہ'' کے بعد اردو میں رسول کریمؐ کی سوانح عمریاں لکھنے کا رواج شروع ہو گیا۔ اس زمانے اور اس سے قبل لکھنے والوں میں ایک قابل ذکر نام مولوی فیروز الدین کا بھی ہے۔(1) ذیل میں مولوی صاحب موصوف کی سوانحی تصانیف ''فضائل اسلام فی ذکر خیر الانام'' المعروف ''بہ سیرت النبیؐ'' یا ''پیارے نبیؐ کے پیارے حالات''، سیرت پر لکھی ہوئی کتاب سات ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں مقدس انبیا کے حالات بابرکات، تیسرے میں حضورؐ کے اخلاق وعادات، چوتھے میں تورات و انجیل کی بشارات، پانچویں میں آنحضرتؐ کے معجزات، چھٹے میں حضورؐ کی مختصر تعلیمات اور ساتویں باب میں حضورؐ کی زندگی کے مقاصد بیان کیے گئے ہیں۔ پہلے باب میں مولوی صاحب موصوف نے ان بائیس انبیا کے اجمالی حالات بیان کیے ہیں جن کا ذکر قرآن میں پایا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے انبیاء کے حالات کے وہی پہلو اُجاگر کیے ہیں جن کا تعلق ثبوت نبوت، ثبوت قرآن یا کسی اور صداقت سے ہے۔ مثال کے طور پر حضرت صالحؑ کے حالات لکھنے کے بعد انھوں نے آخر پر لکھا ہے:

> حضرت رسول کریمؐ کے ساتھ اس قصہ کا تعلق، بہ حیثیت اثبات نبوت کے یہ ہے کہ جس طرح یہ قوم اپنے پیغمبر کی تکذیب کی وجہ سے تباہ اور ہلاک ہوئی۔

اسی طرح مکہ کے کفار اور اسلام کے مخالف ہلاک ہوں گے۔(2)

مولوی موصوف نے صرف انبیا کے قصے ہی بیان نہیں کیے، بلکہ واقعات سے نتائج اخذ کر کے قارئین کو اخلاقی سبق بھی دیا ہے:

> جب کوئی خلیفہ کسی خاص خدمت کے انجام دینے کے لیے خدا کی طرف سے مامور ہوا۔شیطان اور شیطانی لشکر بھی پوری قوت اور پورے زور کے ساتھ مقابلے کے لیے سامنے آن کھڑا ہوا۔ان کی مخالفت میں یہ سر ہوتا ہے کہ اہلِ بصیرت کو معلوم ہو جائے کہ وہ کسی زمینی بھروسے سے کامیاب نہیں ہوتے بلکہ صرف تائید الہیٰ اور آسمانی ہتھیاروں سے۔(3)

پیارے نبیؐ کے پیارے حالات کے سلسلے میں مولوی صاحب نے بائبل کی خاص بشارات بھی درج کی ہیں۔آپؐ کے معجزات، نشانات، خوراک، عادات اور پیش گوئیاں درج کی ہیں۔مولوی صاحب نے وہ پیش گوئیاں درج کی ہیں جن کی صداقت کی گواہی متعصب سے متعصب آدمی بھی دینے پر مجبور ہے۔واقعات نبویؐ کے بیان کے بعد حضورؐ کے اخلاق و عادات خصوصاً عقل و کمال، حسن و جمال، فصاحت و بلاغت، سخاوت، شجاعت، حلم و عفو، رحم و تحمل، سادہ اور بے تکلف زندگی کی عملی مثالیں بیان کی ہیں۔ظرافت کے سلسلے میں ایک مثال ملاحظہ فرمائیں:

> ایک اعرابی آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کچھ کہنا چاہا۔اس وقت آپؐ اُداس تھے۔صحابہؓ نے اسے منع کیا۔اس نے کہا قسم ہے اس ذات پاک کی جس نے آپؐ کو نبی برحق بنا کے بھیجا۔میں آپؐ کو بے ہنسائے نہیں چھوڑوں گا۔پھر یوں بولا کہ یارسول اللہ! ہم نے سنا ہے کہ دجال لوگوں کے لیے ثرید لائے گا۔میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں کیا آپ مجھے حکم دیتے ہیں کہ میں اس ثرید سے محروم رہوں اور نہ مانگوں؟ یہاں تک کہ لاغری سے مر جاؤں یا یہ حکم دیتے ہیں کہ اس کو ثرید پر ہتے لگا دوں اور جب خوب سیر ہو جاؤں تو اللہ پر ایمان لاؤں اور اس کا منکر ہو جاؤں؟ یہ سن کر آپؐ کی کچلیاں کھل گئیں اور بہت زیادہ ہنسے اور فرمایا کہ جس چیز سے اللہ تعالیٰ مومنوں کو غنی کر دے گا۔اس سے تجھ کو بھی اس کی پروا نہ رہے گی۔(4)

آخر پر آپؐ کی بعثت اور زندگی کے مقاصد بیان کیے گئے ہیں جن میں گہری حکمت ہے۔اس سے الہیات کے بہت سے اصول حل ہو جاتے ہیں۔ان مقاصد پر غور کرنے سے آنحضرتؐ کی نبوت کی صداقت میں کوئی شک نہیں رہتا۔آنحضرتؐ کا دنیا میں عملی توحید قائم کرنا، اخلاق حسنہ کی تکمیل، حق کی ظاہری اور باطنی فتح، بطلان کی ہلاکت، احکام الٰہی میں سطوت و

جبروت، عقبیٰ کی جزا وسزا اور قیامت کا آنحضرتؐ کے واقعات عصری سے قطعی ثبوت اور حضورؐ کی عملی زندگی سے آپؐ کی نبوت کا ثبوت سب کچھ بین طور پر بیان کیا گیا ہے۔

''پیارے نبیؐ کے پیارے حالات'' میں تذکرہ نگاری، سیرت نگاری اور تاریخ نگاری سے مدد لی گئی ہے۔ اختصار اور جمال اس کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ تمام تاریخی واقعات نبویؐ جن کو آپؐ کی زندگی میں زبردست اہمیت حاصل ہے۔ نہایت اختصار سے بیان کر دیے گئے ہیں۔ اس کتاب میں لمبی چوڑی عبارت آرائی نہیں کی گئی بلکہ سادہ اور عام فہم الفاظ میں حضورؐ کے حالات بیان کر دیے گئے ہیں۔ مولوی موصوف نے سادگی اور اختصار کو حد درجہ ملحوظ خاطر رکھا ہے۔ ان کا اسلوب تحریر سلیس واضح اور منطقی ہے۔ جملے چھوٹے چھوٹے اور خطِ مستقیم میں آگے بڑھتے ہیں اور مفہوم ادا کرنے میں کسی قسم کی دشواری کا احساس نہیں دلاتے۔

پادری عماد الدین پانی پتی نے ۱۸۷۲ء میں ''تواریخ محمدیؐ'' امرتسر سے شائع کی۔ پادری نے اس کتاب میں نبی اکرم ﷺ کی ذات اقدس پر نہایت رکیک الزامات لگائے۔ اگرچہ علمائے اسلام نے اپنے اپنے انداز میں پادری کی ہرزہ گوئی کا جواب دیا۔ مولانا حالی کی ''تواریخِ محمدیؐ'' پر منصفانہ رائے اور مولوی چراغ علی کی تعلیمات اس سلسلے میں عمدہ جواب ہیں لیکن مولوی موصوف کی ''فضائل اسلام فی ذکر خیر الانام المعروف بہ سیرت النبیؐ''، ''کتاب تواریخ محمدیؐ'' کا دندانِ شکن جواب ہے۔ ''فضائل اسلام فی ذکر خیر الانام'' میں حضورؐ کا قریباً کل حال ترتیب وار، مفصل، معتبر عیسائی علما کے اقوال انتخاب کر کے مرتب کیا گیا ہے اور جو جو اعتراضات عیسائی آنحضرتؐ کی سیرت پر کرتے ہیں ان کا جواب انھیں کے علما سے لایا گیا ہے۔ ''فضائل اسلام فی ذکر خیر الانام'' کی خاص خوبی یہ ہے کہ ساری کتاب مستند مخالفین ہی کی کتب سے اقتباسات انتخاب کر کے مرتب کی گئی ہے۔ اور عماد الدین کے اعتراضات کا انھیں کے بڑے بڑے ثقہ اور معتمد علما و فضلا کے اقوال سے جواب دیا گیا ہے۔ جس امر کو وہ اعتراض کی صورت میں پیش کرتا ہے۔ ان کا جواب اسی طرح دیا گیا ہے کہ جب آپ ہی کے بڑے بڑے علما آنحضرتؐ کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ آپ کے شبہات کیا وقعت رکھتے ہیں؟

ساری کتاب محض اقتباسات کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ اکثر مقامات پر مؤلف نے اقوال کی تائید اور بطورِ حاشیہ یا ضمیمہ اقوال کی تشریح اور توضیح بھی کی ہے۔ یہ اضافے انھوں نے اس طرح کیے ہیں کہ عام قاری کو بھی اندازہ ہو جاتا ہے۔ کہ کونسا بیان مؤلف کا ہے اور کونسا علمائے نصاریٰ

کا؟ ''فضائل اسلام فی ذکرِ خیر الانام'' چار ابواب پر مشتمل ہے۔ مقدمے میں رسولؐ خدا سے پیشتر عرب کا جو حال تھا وہ مخالفین ہی کی زبان میں مندرج ہے۔ اس میں رسومات، جاہلیت، دستورات عرب اور طرزِ حکومت وغیرہ کا حال درج ہے۔ پہلے باب میں آنحضرتؐ کی ولادت سے آغاز نبوت تک کا حال اور تمام اعتراضات کی تردید مخالفین کے اقوال سے ہی کی گئی ہے۔ دوسرے باب میں آغاز نبوت سے ہجرت تک کا حال علمائے نصاریٰ کے اقوال کی صورت میں درج کیا گیا ہے۔ تیسرے باب میں ہجرت سے وفات تک کا حال معہ غزوات، ترتیب وار، سال بہ سال ،اعتراضات کے جواب کے ساتھ درج کیا گیا ہے۔ اس باب میں جہاد، تحویل قبلہ، کثرت ازدواج اور تقدیر پر خصوصی بحث کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں عیسائی علما کے اقوال درج کیے گئے ہیں۔ چوتھا اور آخری باب نہایت اہم ہے جس میں اسلام کی فضیلتیں، مسلمانوں کے علوم اور کارہائے نمایاں، پیغمبر اسلامؐ کے کارنامے اور جانفشانیاں، اسلام کی صداقتیں اور اس کی تعلیمات ،وحدانیت اور امر و نہی مستند اور معتبر علمائے نصاری کے اقوال کے بموجب درج کیے گئے ہیں۔ چونکہ مخالفین کا اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کے بارے میں اس قسم کی شہادت دینا اسلام اور اس کی کمال عظمت اور فضیلت کا بین ثبوت ہے۔ اس لیے اس تالیف کا نام ''فضائل اسلام فی ذکر خیر الانام المعروف سیرت النبیؐ '' یا ''تاریخ محمدیؐ '' رکھا گیا ہے۔

مولوی صاحب موصوف نے اس تالیف کو جن مستشرقین کے اقوال اور آرا سے مزین کیا ہے۔ ان کے اسما اور تصانیف و تالیفات مندرجہ ذیل ہیں: ایڈورڈ گبن، جارج سیل (ترجمہ قرآن)، پادری فانڈر (تواریخ محمدیؐ) بشپ مڈلٹن، جارج ڈیپورپ (اپالوجی فار محمد اینڈ قرآن) (اردو ترجمہ)، عطاالحق یا موید الاسلام، ریورینڈ رراڈ ویل (ترجمہ قرآن)، مسٹر طامس کارلائل (ہیروز اینڈ ہیروز شپ)، ماسٹر رامچندر (تحریف القرآن) جے ولسن، سر ولیم میور (لائف آف محمد (ife of Mahomet)، اُردو تواریخ کلیسا، تاریخ محمدیؐ) پادری صفدر علی، ڈاکٹر اے سپرنگر (سیرت محمدیؐ)، پادری رجب علی، ہارن صاحب (تفسیر قرآن) پادری باس ورتھ سمتھ اور ایزک ٹیلر علاوہ ازیں اناجیل مروجہ اور چیمبرس انسائیکلو پیڈیا سے بھی مدد لی گئی ہے۔

اس تالیف کا اسلوب مولوی صاحب کی باقی تصانیف کے اسلوب سے قدرے مختلف ہے کیونکہ یہ مولوی صاحب کی پہلی تالیف ہے اور اس وقت تک ان کا قلم اتنی روانی سے نہیں چلتا تھا ۔اگرچہ اس میں زیادہ تر مستشرقین کے اقوال ہی درج ہیں۔ تاہم اقوال پر تبصرے کی صورت میں

ان کا اسلوب نمایاں نظر آجاتا ہے۔ یہاں بھی انھوں نے سادہ اور چھوٹے چھوٹے جملے اور آسان الفاظ کا استعمال کیا ہے۔ قائل کرنے کا انداز منطقی ہے۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی مولوی فیروز الدین کے اسلوب کے بارے میں لکھتے ہیں:

> مولانا ڈسکوی کا طریق استدلال منطقی ہے۔ لیکن ان کی عام فہم اور دلچسپ عبارت، مطالب کو بوجھل نہیں ہونے دیتی۔(5)

سیرت النبیؐ کے سلسلے میں مولوی فیروز الدین ڈسکوی کی تیسری تصنیف ''سیرت المصطفیٰؐ'' ہے۔ اس میں مؤلف نے آنحضرتؐ کے اخلاق فاضلہ اور اوصاف جمیلہ کا بیان کیا ہے مگر شروع میں آپؐ کی مختصر سوانح عمری بھی دی گئی ہے۔ جس کے پڑھنے سے حضورؐ کی صداقت رسالتؐ کی حقیقت آفتاب نصف النہار کی طرح منکشف ہو جاتی ہے۔ اس سوانح عمری میں آنحضرتؐ کی زندگی کے اہم واقعات: نبوت و شریعت کا عطا ہونا، اعلانیہ دعوتِ اسلام، ہجرتِ حبشہ، حضرت عمرؓ اور حضرت حمزہؓ کا اسلام لانا، شعبِ ابی طالب میں محصور ہونا، سفر طائف، ہجرتِ مدینہ، مدینہ کے حالات، مدینہ میں آپؐ کی تشریف آوری، مسجد نبویؐ کی تعمیر، اذان کا تقرر، جہاد کی ابتدا، جنگِ بدر کا معرکہ، غزوہ اُحد، غزوہ خندق، صلح حدیبیہ، بادشاہوں کو دعوتِ اسلام، فتح خیبر، فتح مکہ، جنگِ تبوک، مسجد ضرار، نصارائے نجران سے مباہلہ، حجۃ الوداع اور آپؐ کا حلیہ مبارک نہایت اختصار سے بیان کیا ہے۔ اس کے بعد آپؐ کے اخلاق و اوصاف کا حصہ شروع ہوتا ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے آپؐ کی بے تکلفی و ظرافت، عقل و دانائی، حلم و ملائمت، عفو و رحم، شجاعت و مردانگی، جود و سخاوت، خوش بیانی، صحابہؓ پر آپؐ کی تعلیم کا اثر، دوسروں کی عزت و تکریم، عبادت و ریاضت تقوی، زہد، دنیا سے بے رغبتی، رسالتؐ، خدا کے لیے تبلیغ، توحید الٰہی کے خیال سے اپنی تعظیم کی ممانعت، سادہ گزران، فقر و فاقہ، راست بازی، صداقت، کتاب الٰہی کی تعلیم، حکمت اور تہذیب کی باتوں کو عقیدت مندانہ اسلوب میں بیان کیا ہے۔ اس کے بعد دو سو منتخب احادیث نبویؐ کا منظوم اردو ترجمہ دیا ہے۔ آپ کی تعلیمات کا خلاصہ بیان کرنے کے بعد خلفائے راشدینؓ اور حضرت حسنینؓ کی مختصر سوانح عمری اور کارنامے بھی بیان کیے گئے ہیں۔

اس مختصر کتاب میں حالات نبویؐ کا ذخیرہ اس قدر جمع ہے کہ بڑی بڑی کتابوں سے بے نیاز کر دیتا ہے۔ اس میں اخلاق محمدؐ کا ہی بیان نہیں ہے بلکہ سرکارِ دو عالمؐ کی زندگی سے مثالوں سے اس کتاب کو آراستہ کیا ہے۔ آنحضرتؐ کے اخلاق فاضلہ کا بیان اس طرح کیا ہے کہ اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ آپؐ صرف اعتقادی طور پر ہی نہیں بلکہ عملی طور پر بھی سید المرسلینؐ، افضل البشرؐ، خاتم

الانبیاؑ ہیں۔اس کتاب کا اسلوب بہت سادہ ہے۔اس میں عبارت آرائی سے پرہیز کیا گیا ہے۔ ہر جملے سے نبی کریم ﷺ سے عقیدت اور محبت ٹپکتی ہے۔اس کتاب میں بھی مولانا موصوف نے ضمناً عیسائیوں اور آریاؤں کے اسلام اور قرآن پر اعتراصات کا جواب دیا ہے۔اس کتاب سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو جس سے ان کے اسلوب کی خصوصیات واضح ہو جائیں گی:

> آپؐ پڑھے لکھے نہ تھے، مگر عالم و جاہل دونوں کو ہی تعلیم دیتے تھے۔آپؐ کے چہرے پر ایسا عظمت و جلال کا نور برستا تھا کہ اس کا اثر ہر شخص کو پہنچتا تھا۔آپؐ حیا میں ناکتخدا یعنی بن بیاہی لڑکی سے بڑھ کر تھے۔آپؐ اپنے ماتحتوں پر بہت مہربان تھے۔اپنے خادم کو کبھی نہ جھڑکتے۔آپؐ کے خادم انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ میں دس برس تک آپؐ کی خدمت میں سرفراز رہا۔ اس درمیان میں آپ ﷺ نے کبھی اُف تک نہیں کہا۔آپؐ اپنے عزیزوں سے بہت محبت رکھتے۔(6)

مولوی فیروز الدین کی تصنیف ''الوہیت مسیح اور تثلیث کا ردّ'' کے تقابل ادیان پر عمدہ کتاب ہے جو دو حصوں پر مشتمل ہے۔پہلے حصے میں فاضل مصنف نے اللہ تعالیٰ کی صفات قرآن اور خصوصاً سورۃ اخلاص کی روشنی میں بیان کر کے عیسائیوں کے تصورِ خدا اور عقیدہ تثلیث پر روشنی ڈالی ہے۔براہین عقلی سے ان کے تضادات کے خلافِ عقل اور خلافِ فطرت ہونا ثابت کیا ہے۔ اور کہا ہے کہ عیسائیوں کے یہ اعتقادات خودتراشیدہ خیالات ہیں جن پر نہ کوئی عقلی دلیل قائم ہوتی ہے اور نہ نقلی بلکہ اصل تورات اور انجیل سے ان کے ان اعتقادات کی نفی ہوتی ہے۔مولانا موصوف کا طرزِ استدلال ملاحظہ ہو:

> باپ، بیٹے کا عمر، درجہ اور ہر بات میں مساوی ہونا کس قدر قابل تمسخر اور واہیات ہے۔مسیح اگر خدا کا بیٹا ہے تو ازلی نہیں جو ازلی ہے تو خدا کا بیٹا نہیں۔یہ دونوں صفات متضاد وجود واحد میں جمع نہیں ہو سکتیں۔مسیح اگر خدا کا بیٹا ہے تو ازلی نہ ہونے کی وجہ سے خدائیکے لائق اور خدا نہیں۔دونوں باتیں نہیں ہو سکتیں۔چوپڑی اور دو دو، ایسا ٹھیک نہیں۔خدا کا بیٹا قرار دو تو ازلی نہ ہونے کی وجہ سے خدامت سمجھو ازلی قرار دو تو بیٹے کا مفہوم بعدیت کو چاہتا ہے۔بیٹا مت کہو یہ کیا بات ہے کہ تم بیٹے کا وجود باپ سے ۱۰۔۱۵ برس بھی موخر نہیں سمجھتے ہو اور پھر بیٹا کہتے ہو، ایسا بیٹا کہاں سے آگیا؟(7)

مولوی صاحب نے عیسائیوں کے عقائد کا بطلان اور اسلامی عقائد کو برحق ثابت کرنے کے لیے قرآن مجید، تورات، انجیل دیگر آسمانی کتابوں سے آیات اور مستشرقین کے اقوال

کو بھی بطور دلیل درج کیا ہے۔ ''الوہیت مسیح اور تثلیث کا رد'' کے دوسرے حصے میں مولوی صاحب نے یہ ثابت کیا ہے کہ انجیل میں جہاں کہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تثلیث کا ذکر ہے وہ جعلی اور الحاقی ہے۔ انھوں نے یہ لکھا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش محض امر الٰہی سے ہوئی۔ وہ کہتے ہیں کہ اصل تورات اور انجیل سے خالص توحید کا ثبوت ملتا ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے عیسائی علما کے اقوال کو ہی سند کے طور پر پیش کیا ہے۔ مثلاً لکھتے ہیں:

> ایک نہایت مشہور انگریز ،مسٹر جان ڈینپورٹ صاحب اپنی کتاب ''اپالوجی فار محامٹ اینڈ قرآن'' میں لکھتے ہیں کہ نیٹن صاحب، افضل حکما انگلستان اور گبن صاحب اور علما و مورخین نصاریٰ نے بڑی کوشش سے ثابت کیا ہے کہ جن آیات انجیل سے مسئلہ توحید مستنبط کیا گیا ہے۔ یعنی یوحنا کا پہلا خط ۵ باب اور ۷ وہ آیات اختراعی ہیں۔(8)

اس کتاب کا اسلوب نہایت سادہ ہے۔ چھوٹے چھوٹے جملے ہیں اور ان میں لفظی مناسبت کا بھی خیال رکھا گیا ہے۔ مثلاً لکھتے ہیں:

> پادری عماد الدین پانی پتی، جو اپنی پت پرانے پادریوں سے بڑھ کر سمجھتے ہیں۔ ہدایت المسلمین کے صفحہ نمبر ۱۰۳ میں مقر ہو گئے کہ ضرور آیت نامہ اول یوحنا کی ۵ باب اور ۷ آیت مشکوک ہے یعنی نہیں معلوم مصنف کی ہے یا حاشیہ ہے۔(9)

''عیسائیوں کی دینداری کا نمونہ'' تصنیف میں مولانا ڈسکوی نے مختلف دلائل کے ساتھ یہ ثابت کیا ہے کہ انجیل مروجہ محرف ہیں اور اس کے مقابلے میں قرآن از اول تا ابد اپنی اصل حالت میں موجود ہے:

> عیسائیوں کی کتاب مقدس پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں اس قدر الحاق و اختلاف تبدیل و تحرف کو دخل ہوا ہے کہ عیسائی علما مجبوراً قائل ہو گئے ہیں کہ اس میں اس حد تک اختلاف عبارت یا الفاظ ہیں جسے وہ سہواً کاتب کے نام سے منسوب کرتے ہیں کہ ہر حال میں تمام یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ صحیح کون ہے؟(10)

مولوی فیروز الدین ڈسکوی نے یہ بھی لکھا ہے کہ جب ان کی کتاب ہی اصلی حالت میں نہیں ہے تو اس سے عقائد کیسے اخذ کیے جا سکتے ہیں؟ وہ اپنی اس تصنیف کا مقصد یوں بیان کرتے ہیں:

> میں چاہتا ہوں کہ عیسائیوں کی مقدس کتاب کا مشتبہ اور محرف ہونا، بطور نمونہ اس رسالہ میں درج کروں تا کہ تمام دنیا پر آشکار ہو جائے کہ عیسائی صاحبان کی کتاب میں یہاں تک تبدیل و تحریف اور الحاق و اختلاف کو دخل ہوا ہے۔ اور ہو رہا ہے۔ تو وہ کیسے قابل استشنا ہو سکتی ہے۔ اور اس پر عیسائی مذہب کی بنیاد گویا ریت

پر بنیاد ہے یا نہیں؟(11)

مولانا موصوف نے انجیل کے مختلف چھپے ہوئے نسخوں کا موازنہ کر کے مثالوں، دلیلوں سے ثابت کیا ہے کہ اناجیل مروجہ محرف ہیں لیکن عیسائی بڑی چالاکی سے اس تحریف کا انکار کرتے ہیں۔ مولوی صاحب نے صرف چھے نمونے دینے پر ہی اکتفا کیا ہے۔ انھوں نے اناجیل کے محرف اور قرآن کے غیر محرف ہونے کی نسبت مندرجہ ذیل علمائے نصاریٰ کے اقوال کو بطور دلیل درج کیا ہے۔ گاڈفری ہیگنس، مسٹر جان ڈینیورٹ، مسٹر لارڈنر صاحب، ہارن صاحب، پادری فانڈر، سر ولیم میور، پلوس صاحب، فاسٹس صاحب اور پادری دیر صاحب۔ مولوی فیروز الدین نے ایک مقالہ ''اسرار التنزیل'' ۲۴ جنوری ۱۸۹۶ء میں انجمن حمایت اسلام کے گیارہویں سالانہ جلسے منعقدہ ۲۴ جنوری کے لیے تحریر کیا۔ مگر اچانک طبیعت علیل ہو جانے کی وجہ سے وہ جلسے میں نہ جا سکے۔ خلیفہ عبدالرحیم نے ان کی طرف سے یہ مقالہ پڑھا(12) ''نماز اور اس کی حقیقت'' تصنیف میں مولانا نے نماز کی فضیلت کو معترضین اسلام کا جواب دیتے ہوئے بیان کیا ہے۔ مضامین کی فہرست میں ۳۸ مطالب شامل ہیں۔ نماز کی فضیلت کے بارے میں لکھتے ہیں:

> اگر غور و فکر اور تامل سے تمام خدا کی بنائی ہوئی چیزوں پر نگاہ کرے تو سب کی سب اپنے اپنے طور پر خدا کی عبادت کر رہے ہیں۔ چوپائے اور طیور اسی کے آگے سر تسلیم خم کیے ہوئے ہیں۔ رینگنے والے جانور اس کے سامنے سجدہ کر رہے ہیں۔ افلاک اور کواکب اس کے ولولہ عشق میں گھوم رہے ہیں اور حرکت دوری سے نماز ادا کر رہے ہیں۔ اگر اس کی عبارت میں یہ سب مخلوقات کے طریق عبادت جمع ہو جائیں تو کیا ہی افضل بات ہے۔(13)

مولانا فیروز الدین کی تصنیف ''سلسلہ جدید فیروزی'' اسلام کے بارے میں پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ جس میں اسلام کے بنیادی مسائل نہایت آسان اور سلیس زبان میں سمجھائے گئے ہیں۔ یہ کتابیں بچوں کے لیے لکھی گئی ہیں اور زبان بھی بچوں کی استعداد کے مطابق استعمال کی گئی ہیں۔ ہر ایک کتاب میں نثر کے ساتھ ساتھ نظم کا کچھ حصہ بھی شامل ہے۔ ہر کتاب کا تعلق اسلام کے کسی رکن کے ساتھ ہے۔ ان کی ایک کتاب نماز پر دوسری روزہ پر، تیسری حج پر، چوتھی زکوۃ پر اور پانچویں ایمان کے موضوع پر ہے۔ یہ تصانیف اس اعتبار سے اہم ہیں کہ آج سے تقریباً ایک صدی پہلے جب کہ برصغیر پر کفر و الحاد اور اسلام کے خلاف شکوک و شبہات کے بادل منڈلا رہے تھے۔ مولانا ڈسکوی نے نہ صرف پختہ عمر کے لوگوں کے لیے اسلام کی تعلیم عام کی بلکہ بچوں کے لیے بھی مذہبی تعلیم کا ان کتابوں کے ذریعے اہتمام کیا۔ مولوی صاحب نے

قرآن مجید کا ترجمہ، اُردو نثر، اردو نظم اور پنجابی نظم میں کیا ہے۔ تفسیر طلب امور کی تفسیر حاشیے میں دی گئی ہے۔ اس تفسیر میں مسائلِ اسلام کو مفصل بیان کیا گیا ہے۔ ضمناً عیسائیوں اور آریہ مت والوں کے اعتراضات کا جواب بھی دیا گیا ہے۔ انھوں نے سورہ یٰسین، سورۂ رحمن، سورہ ملک، سورہ مزمل اور سورہ نبا کا اُردو نثر میں ترجمہ ''پنجسورہ بے نظیر'' کے نام سے کیا ہے۔ آخری چار سورتوں کی تفسیر ''ربع اخیر کی نادر تفسیر'' کے نام سے کی ہے۔ مولوی صاحب کے اُردو ترجمے کی زبان سادہ اور عام فہم ہے۔ ترجمے کی خاص خوبی یہ ہے کہ قوسین میں مطلب کی ادائی اس طرح کر جاتے ہیں کہ تفسیر خود بخود ہی ہو جاتی ہے۔

سورۂ یٰسین کی ابتدائی آیات کا ترجمہ ملاحظہ ہو:

> اے سرورِ عالم قرآن کی قسم، جس میں سراسر حکمت کی باتیں ہیں کہ یقیناً تو پیغمبروں کے سلسلے میں ایک ہے اور دین کی سیدھی راہ پر قائم ہے۔ یہ قرآن زبردست اور مہربان خدا نے اتارا ہے تاکہ تو ان لوگوں کو قہرِ الٰہی سے ڈرائے جن کے باپ دادا مدت سے نہیں ڈرائے گئے اور اس لیے وہ دین سے غافل ہیں۔(14)

مولوی صاحب کے بیان میں زور دکھائی دیتا ہے۔ سورہ رحمٰن کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> اللہ اکبر، اس سورہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنی ظاہری باطنی، دینی اور دنیاوی نعمتوں کو کس شان و شوکت اور دھوم دھام سے بیان کیا ہے اور کس اعلیٰ ترین فصاحت اور بلاغت کے ساتھ اپنے احسانات و انعامات کو ظاہر کیا ہے۔ فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے تو پورا قرآن مجید یکساں واقع ہے۔ کہیں تفاوت نہیں، مگر طرز اور اسلوب ہر سورت کا ایک دوسرے سے نرالا ہے۔ اور اس سورت کا ڈھنگ اور نظم بیان تمام سورتوں سے نادر اور عجیب تر ہے۔(15)

نتیجہ بحث

اُنیسویں صدی کے نصف آخر کو استدلال اور مناظرے کی صدی کہا جاتا ہے اور ہر قسم کے ادب کی تخلیق انھی پہلوؤں کو پیشِ نظر رکھ کر کی جا رہی تھی۔ سرسید کی ''خطباتِ احمدیہ'' کے بعد اردو ادب میں رسول کریمؐ کی سوانح عمریاں لکھنے کا رواج شروع ہو گیا۔ اس زمانے اور اس سے قبل لکھنے والوں میں ایک قابل ذکر نام مولوی فیروز الدین کا بھی ہے۔ مولوی فیروز نے مستشرقین کے اعتراضات کا جواب بھی دیا۔ مولانا ڈسکوی نے مختلف دلائل کے ساتھ یہ ثابت

کیا ہے کہ انجیل مروجہ محرف ہیں اور اس کے مقابلے میں قرآن از اول تا ابد اپنی اصل حالت میں موجود ہے۔ مولوی صاحب نے عیسائیوں کے عقائد کا بطلان اور اسلامی عقائد کو برحق کرنے کے لیے قرآن مجید، تورات، انجیل دیگر آسمانی کتابوں سے آیات اور مستشرقین کے اقوال کو بھی بطور دلیل درج کیا ہے۔ مولوی صاحب نے یہ ثابت کیا ہے کہ انجیل میں جہاں کہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تثلیث کا ذکر ہے وہ جعلی اور الحاقی ہے۔ انھوں نے یہ لکھا ہے کہ اصل تورات اور انجیل سے خالص توحید کا ثبوت ملتا ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے عیسائی علما کے اقوال کو ہی سند کے طور پر پیش کیا ہے۔ ان کی تصانیف و تالیفات کا عمیق مطالعہ سے کوئی بھی مسلمان کامل مناظر اور تقابل ادیان کا ماہر بن سکتا ہے۔

حواشی و حوالہ جات

1۔ الطاف فاطمہ، اردو میں فنِ سوانح نگاری کا ارتقا، لاہور، عشرت پبلشنگ ہاؤس، س۔ن، ص: ۶۷

2۔ مولوی فیروز الدین، پیارے نبیؐ کے پیارے حالات، سیالکوٹ، مفید عام پریس، بار اول، ۱۳۱۸ھ، ص: ۶۷

3۔ ایضاً، ص: ۲۷

4۔ ایضاً، جلد دوم، ص: ۳۱

5۔ تحقیقی زاویے، ص: ۲۶۲

6۔ مولوی فیروز الدین، سیرت المصطفیٰؐ، سیالکوٹ، مفید عام پریس، ۱۹۰۱ء ص: ۴۱

7۔ مولوی فیروز الدین، الوہیت مسیح اور تثلیث کا رد، سیالکوٹ، مفید عام پریس، س ن، ص: ۱۱

8۔ ایضاً، ص: ۱۵۱

9۔ ایضاً، ص: ۱۱۶

10۔ مولوی فیروز الدین، عیسائیوں کی دینداری کا نمونہ، سیالکوٹ، مفید عام پریس، ۱۸۹۵، ۹۶ء، ص: ۱

11۔ ایضاً، ص: ۲

12۔ 'رسالہ انجمن حمایت اسلام، مارچ، اپریل ۱۸۹۶ء، ص: ۳

13۔ مولوی فیروز الدین، نماز اور اس کی حقیقت، سیالکوٹ، مفید عام پریس، بار اول، ۱۸۹۰ء، ص: ۲

14۔ مولوی فیروز الدین، پنجسورہ بے نظیر، سیالکوٹ، مفید عام پریس ۱۹۰۲ء، ص: ۳

15۔ مولوی فیروز الدین، سورہ رحمن کی نادر تفسیر، سیالکوٹ، مفید عام پریس، ۱۹۰۳ء، ص: ۳

علامہ اقبال اور دیگر ادبی مشاہیر کی شاعری میں نعتیہ عناصر

نعت گوئی اساسی طور پر مدحت ہے۔مدحت کی روایت دنیا کے ہر قدیم ادب میں موجود ہے۔نعتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدحت ہے جو دنیا کی ہر بڑی زبان میں کہی گئی ہے۔سیرت طیبہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جس کثرت اور تنوع کے ساتھ اردو زبان میں لکھا گیا ہے اس کی مثال کسی اور زبان میں مشکل سے ہی ملے گی۔اردو زبان وادب میں نعت گوئی کی روایت ایک بلند مقام ومرتبہ رکھتی ہے۔اردو کے ہر بڑے شاعر نے نعت گوئی میں اپنے جوہر دکھا کر عشق مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اپنے ایمان کو منور کیا ہے۔ہندوستان کے بڑے بڑے اردو دبستانوں کے ساتھ ساتھ چھوٹے خطوں میں بھی نعتیہ شاعری کی روایت کا اپنا مقام ہے۔چھوٹے خطوں میں بھی اردو ادب کے بڑے بڑے مشاہیر پیدا ہوئے اور نعتیہ شاعری میں اہم کردار ادا کیا۔ان خطوں میں سیالکوٹ ایک اہم خطہ ہے۔زیرِ نظر ریسرچ آرٹیکل میں خطہ سیالکوٹ کے اہم نعت گو شعرا کی نعتیہ شاعری کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

علامہ محمد اقبالؒ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات سے ذہنی وقلبی وابستگی اور نعت نگاری میں معنویت واثر انگیزی کے اعتبار سے دوسرے نعت گو شعرا سے منفرد دکھائی دیتے ہیں۔کلامِ اقبال کا بہت بڑا حصہ نعتیہ مفاہیم کا حامل ہے۔اقبالؒ بظاہر روایتی نعت گو شاعر نہیں ہیں البتہ ان کا شعری ادب فکری وذہنی تاثیر کے لحاظ سے بذاتِ خود نعت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے۔اقبالؒ سیرتِ طیبہ کا غائر مطالعہ کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ گرامی تمام کمالاتِ ظاہر وباطن اور حقیقت ومجاز کی جامع ہے۔اقبالؒ اپنے اشعار کے ذریعے باور کراتے ہیں کہ اگر تم ذات مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک رسائی حاصل نہ کر سکے تو سمجھ لینا کہ تم دین سے دور ہو۔کیونکہ ذاتِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی دین کا مرکز ومحور ہے۔اقبالؒ کے ہاں بہت سارے متفرق اشعار بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔یہ متفرق اشعار اپنی نوعیت واہمیت کے اعتبار سے لاجواب وبے مثال ہیں۔

کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں(1)
لوح بھی تو قلم بھی تو تیرا وجود الکتاب
گنبدِ آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب!
عالمِ آب و خاک میں تیرے ظہور سے فروغ
ذرّۂ ریگ کو دیا تُو نے طلوعِ آفتاب
شوکتِ سنجر و سلیم تیرے جلال کی نمود
فقرِ جُنیدؒ و بایزیدؒ تیرا جمالِ بے نقاب
شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام
میرا قیام بھی حجاب، میرا سجود بھی حجاب
تیری نگاہ ناز سے دونوں مراد پا گئے
عقل غیاب و جستجو، عشق حضور و اضطراب(2)
قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کردے
دہر میں اسمِ محمدؐ سے اجالا کردے(3)

اقبالؒ کے ہاں نعت کا روایتی انداز نہیں ملتا بلکہ روایت کے تتبع میں کبھی نعت نگاری کبھی نہیں کرتے ۔ان کی فارسی شاعری میں بھی نعتیہ شاعری کے دلنشین نمونے ملاحظہ کئے جا سکتے ہیں۔فارسی کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

بمصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است(4)
ہر کہ از سرِّ نبیؐ گیرد نصیب
ہم بہ جبریل امیں گردو قریب(5)
درِ دل مسلم مقام مصطفیٰؐ است
آبروئے ماز نام مصطفیٰؐ است(6)
زندہ ء تا سوز او،درجان تست
این نگہ دارند ایمان تست(7)

بہ منزل کوش مانند مہ نو
دریں نیلی فضا ہر دم فزوں شو
مقام خویش اگر خواہی دریں دیر
بحق دل بند و راہ مصطفیؐ رو(8)

غازی علم الدین شہید اور غازی عبدالقیوم شہید کی محبتِ رسول ﷺ میں سرفروشی کے واقعات سے اقبالؒ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اور لاہور اور کراچی کے عنوان سے ایک قطعہ کہا جس میں ان غازیوں کی سرفروشی کی طرف بلیغ اشارہ ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

نظر اللہ پہ رکھتا ہے مسلمان غیور
موت کیا شے ہے ؟ فقط عالم معنی کا سفر
ان شہیدوں کی دیت اہل کلیسا سے نہ مانگ
قدر و قیمت میں ہے خون جن کا حرم سے بڑھ کر
آہ! اے مرد مسلمان تجھے کیا یاد نہیں؟
حرفِ لا تدع مع اللہ الھاً آخر(9)

علامہ اقبال رسول کریم ﷺ کے دیدار سے مشرف ہونے بے انتہا عمدہ تفسیر و توجیہ کرتے ہیں۔ ان کے ہاں اتباع رسولؐ میں ڈوب جانے کا نام دیدارِ رسولؐ ہے۔ اگر کوئی فرد رسول کریم ﷺ کے اسوہ حسنہ کی روشنی میں زندگی کے شب و روز بسر کرتا ہے تو وہ جن و انس میں مقبول و معروف ہو جائے گا۔ سنتِ رسول ﷺ کی اتباع میں ڈوب کر خود شناسی حاصل کرنا ہی اصل میں دیدارِ رسولؐ ہے۔ اس سلسلے میں چند اشعار ملاحظہ ہوں:

معنی دیدار آں آخر زماںؐ
حکم او بر خویشتن کردن رواں
در جہاں زی چوں رسولؐ انس و جاں
تا چو او باشی قبول انس و جاں
باز خود را بیں ہمیں دیدار او ست
سنت او سرّ ے از اسرار اوست(10)

مولوی فیروزالدین (11) قادرالکلام شاعر تھے۔ وہ غزل اور نظم کے روایتی شاعر نہیں تھے۔ انہوں نے شاعری کو تبلیغی وسیلے کے طور پر اختیار کیا۔ حمدیہ اور نعتیہ شاعری ان کی شاعری کا اہم موضوع ہے۔ وہ مناجات میں بھی اللہ سے نعت کہنے کا سلیقہ مانگتے ہیں۔ انہیں اس بات کا احساس ہے کہ وہ بہترین لفظوں کے انتخاب کے باوجود بھی نعت کہنے کا حق ادا نہیں کر سکتے۔ ذیل کے قطعے میں اسی بات کا اظہار یوں کرتے ہیں:

کیونکر ہو ثنائے ذات سرمد تحریر
کس طرح ہو نعت پاک احمد تحریر
فیروز یہ منزل ہے بعید اس کو چھوڑ
بہتر ہے کہ کیجیے اپنا مقصد تحریر (12)

ایک نعتیہ مسدس سے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

وہ تو سچا مثل موسیٰ تھا
جو جو اس کے خلاف میں اٹھا
اس کو پکڑا خدا نے پر پکڑا
پھر جہاں میں ملا نہ اس کا پتہ
وہ نبیؐ اک خدا کی قوت تھی
سامنے آئے کس کو جرات تھی۔ (13)

نعت نگاری ظفر علی خان کا محبوب موضوع ہے۔ نعت اور تاریخِ اسلام کے روشن ماضی کے اخلاق آموز واقعات کا بیان ظفر علی خان کی شاعری کا مرکزی موضوع ہے جہاں ان کا قلم عقیدت و محبت کی پنہائیوں میں ڈوب کر گوہر آبدار تلاش کرتا ہے اور عالم انسانی کی رہنمائی کیلئے پیش کرتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

مرے مضمون ہیں جب سے شعر کہنے کا شعور آیا
خدا کی حمد، پیغمبرؐ کی مدح، اسلام کے قصے

ظفر علی خان نے نعت میں متقدمین کی روایت کو بڑے جذبہ وشوق، فکر و احساس کے علاوہ اپنے پرشکوہ لہجے اور دلآویز انداز میں آگے بڑھایا ہے۔ خدائے بزرگ و برتر کی حمد کے ساتھ ساتھ ظفر علی خان نے سرورِ کون و مکانؐ کی نعت کے سلسلے کو بھی جاری رکھا اور اعلیٰ پائے کی نعت

گوئی میں بلند مقام و مرتبے پر فائز رہے۔ اس حوالے سے ظفر علی خان کا ایک نعتیہ مخمس ''نذر محقر بحضور خواجۂ دو جہاں سرور کون و مکان محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰؐ'' کا ایک بند ملاحظہ ہو:

اے کہ ترا شہود ہے وجۂ کائنات
اے کہ ترا فسانہ ہے زینت محفل حیات
اے کہ تیری ذات میں جمع زمانہ کے صفات
سب ملکی تصرفات سب فلکی تجلیات
سلطنت اک جہاں کی ہے تیری نگاہ التفات(14)

ظفر کے نعتیہ کلام میں ان کی مشہور نعت ''شمع وحرا'' بڑی دل آویز اور معنوی رفعت میں بے مثال ہے۔ اس نعت کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

وہ شمع اجالا جس نے کیا چالیس برس تک غاروں میں
اک روز جھلکنے والی تھی سب دنیا کے درباروں میں
رحمت کی گھٹائیں پھیل گئیں افلاک کے گنبد گنبد پر
وحدت کی تجلی کوند گئی آفاق کے سینہ زاروں میں(15)

جب ظفر علی خاں امتِ مسلمہ کو ذلت و رسوائی سے دوچار دیکھتے ہیں تو وہ بے چین ہو جاتے ہیں۔ اسلام دشمن عناصر جب سلطنت عثمانیہ کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے ہیں۔ تو اس کے ساتھ ہی عظیم خلافتِ عثمانیہ کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ ان حالات میں ظفر خاموش تماشائی نہیں بن سکتے۔ وہ رسولِ مکرمؐ کے دربار میں اپنی نظم ''التجا بحضور سرورِ کائناتؐ'' میں یوں فریاد کناں ہوتے ہیں:

جاگ او یثرب کے میٹھی نیند کے ماتے کہ آج
لٹ رہا ہے آنکھوں آنکھوں میں تیری امت کا راج
سر چھپانے کا ٹھکانہ بھی انہیں ملتا نہیں
جب کہ ہیبت لے چکی ہے ایک عالم سے خراج
تیرے بچے ہو رہے ہیں ساری دنیا میں ذلیل
کیا نہیں اے قبلہ عالم تجھے بچوں کی لاج
ہم ہیں ننگے سر اٹھ اے شانِ عرب آنِ عجم
اور پہنا دے ہمیں پھر سطوتِ کبریٰ کا تاج

تشنہ کا مانِ خلافت کو خود اپنے ہاتھ سے
بھر کے وہ ساغر پلا ہے انگبیں جس کا مزاج
اب دوا سے کام کچھ چلتا نہیں بیمار کا
اب تو ہے تیری دعا ہی تیری امت کا علاج (16)

داغ دہلوی کے شاگرد شجر طہرانی ایک پختہ گو سخن ور تھے جنہیں شعر گوئی میں استاد ہونے کا مرتبہ حاصل تھا۔ انہوں نے اردو ہی نہیں فارسی میں بھی نعت گوئی میں فنِ شاعری کے خوب جوہر دکھائے۔ ان کے ہاں عشقِ رسول ﷺ کے جذبات و احساسات درجہ کمال کو پہنچے نظر آتے ہیں۔ کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

خرامِ ناز پر تیرے یہ عرش و فرش نازاں ہیں
تیرے قدموں کو چھو کر خاک بھی اکسیر بنتی ہے
یہ بزمِ کن فکاں ہے پیش خیمہ ان کی آمد کا
شجر اسمِ محمدؐ کی یہی تفسیر بنتی ہے (17)
بھر لوں بچھا کے چادرِ سجدہ اگر مجھے
بخت جبیں سے خاکِ درِ مصطفیٰؐ ملے (18)
رحمتِ عام نام کن کا ہے
شافع محشر مقام کن کا ہے
کیوں نہ جنت شجر کا مسکن ہو
جانتے ہو غلام کن کا ہے ! (19)

علامہ اقبال کے معنوی شاگرد امینِ حزیں سیالکوٹی مذہبی آدمی ہیں۔ انہیں مذہب سے بہت محبت ہے۔ اپنی شاعری سے وہ رشد و ہدایت کا کام بھی لیتے ہیں۔ ان کی شاعری میں جا بجا نعتیہ عناصر بھی موجود ہیں۔ عشقِ مصطفےٰ ﷺ ہر مومن کے ایمان کا حصہ ہے۔ اقبال کی طرح امینِ حزیں بھی ایک سچے عاشق رسولؐ ہیں۔ ان کی غزلیات اور نظموں میں نعتیہ رنگ دیکھا جا سکتا ہے:

دو عالم سے بالا ہے شانِ محمدؐ
بہ روح محمدؐ بہ جانِ محمدؐ

کلامِ خدا تو ہے وحدت کا دریا
مگر رہگذر ہے زبانِ محمدؐ
وہی شاخِ طوبیٰ پہ ہیں چہچہاتے
جو بلبل کہ ہیں مدح خوانِ محمدؐ
امین کو ہے ''نور علیٰ نور مشعل''
کلامِ خدا و بیانِ محمدؐ (20)

عشقِ مصطفےٰؐ ہر مسلمان کے ایمان کا لازمی جزو ہے۔ سید صادق حسین بھی عاشق رسولؐ ہیں اور وہ اپنے اس عشق کا اظہار اپنی نعتیہ شاعری میں کرتے نظر آتے ہیں۔ ''صحرا کا نبیؐ'' ان کی ایک طویل نعتیہ نظم ہے۔ جس میں صادقؔ نے حضورؐ کی سیرت کی تصویر کشی کی ہے۔ انہوں نے آپؐ کے آباؤ اجداد، عرب کا ماحول، آپؐ کے بچپن، جوانی اور نبوت کے دور کی عکاسی حقیقت پسندانہ انداز میں کی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

نمونہ تھا وہ خود بھی پاکبازی کا شرافت کا
دھیاں رہتا تھا اس کو رات دن حق کی عبادت کا
خدا کیباد میں اک غار میں مصروف رہتا تھا
ہدایت کی توقع میں وہ ہر تکلیف سہتا تھا
یونہی وہ کر رہا تھا ایک دن یادِ خداوندی
کہ آیا اک فرشتہ لے کر ارشادِ خداوندی
سنا اس نے نہایت غور سے جو کچھ کہا اس نے
کیا یہ ذکر آ کر پھر چچا سے اور بیوی سے
نبیؐ ہونے کی دونوں نے، اسے فوراً بشارت دی
بڑھایا حوصلہ اس کا، تسلی دی، اعانت کی (21)

سید صادق حسین کی نعت نگاری کے حوالے سے ''معراج رسولؐ'' کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں۔ جن میں صادق کا اپنا منفرد اسلوب دیکھا جا سکتا ہے:

رفعتِ اخلاق لے جائے تجھے بھی آن میں
خواہشاتِ نفس سے آلودہ گرداماں نہ ہو

مشکلیں پیدا ہوئیں تیرے خیالِ خام سے
ورنہ کوئی بھی نہیں ہے کام جو آساں نہ ہو(22)

اردو کے دوسرے تمام شاعروں کی طرح اثر صہبائی (خواجہ عبدالسمیع پال) نے بھی نعتیہ شاعری کہی ہے۔ اثرؔ صفاتِ نبویؐ کو بڑے خوبصورت انداز میں پیش کرتے ہیں۔ اثرؔ کا نعتیہ رنگ ملاحظہ ہو:

تیرے سوزِ عشق سے پیغامِ حق
زندہ تر، تابندہ تر، پائندہ تر
تو نے صہبائی کو کیا کچھ دے دیا
عشقِ حق، جوشِ جنوں، حسنِ نظر(23)

نعتوں میں معجزات، صفات اور اخلاقِ حسنہ کے متعلق لکھتے ہوئے اپنے جذبات دلی اور عشقِ رسولؐ کو بھی پیش کرتے ہیں۔ انہیں رسول کریمؐ کے دیدار کی بے حد تمنا تھی جس کا اظہار اپنے نعتیہ شعری مجموعے ''بحضور سرورِ کائناتؐ'' کے پسِ منظر میں کرتے ہیں:

میں اکثر سونے سے پہلے اس خدا نما انسان کی
زیارت کے لیے دعائیں مانگتا ہوں(24)

خدا بخش مضطر نظامی کی شاعری بھی عشقِ رسول ﷺ کی آئینہ دار ہے۔ انہیں سرورِ کونین سے خاص عشق تھا۔ جس کا اظہار انہوں نے تمام اصنافِ سخن میں کیا ہے۔ عشقِ رسول ﷺ ان کی شاعری کی مرکزی روح ہے۔ ان کی نعت گوئی بھی اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اس حوالے سے چند اشعار درج ذیل ہیں:

جمالِ پاک کو دیکھے بشر کی تاب نہیں
وہ بے نقاب ہوئے پر بھی بے نقاب نہیں
دامنِ امروز میں ہے ہی دولتِ کونین ﷺ
خوش بخت وہ لوگ ہیں جو غمِ فردا نہیں رکھتے(25)

مضطر کے مزید نعتیہ اشعار ملاحظہ ہوں:

حرم پاک کی طرف ہے مری جان مضطر
شمع کی طرف سے کیا مانع ہے پروانے کو

مل ہی جائے گا کبھی مضطر حضوری کا شرف
گھر درِ محبوب پر اپنا بناتے جایئے(26)

ساغر جعفری سچے اور کھرے عاشق رسولؐ تھے۔ ان کی نعتیہ شاعری سے ان کی شمع رسالتؐ سے محبت وعقیدت کا اظہار ہوتا ہے۔ اپنی نعتیہ شاعری میں ساغر نے حضورؐ کی صداقت و شجاعت اور مقام ومرتبہ کا ذکر کیا ہے۔ انھوں نے نہایت عجز وانکساری سے بارہ گاہِ رسالتؐ میں اپنے جذبات کا نذرانہ پیش کیا ہے۔ اور حضورؐ کی انسانیت کے لیے تڑپ اور ان تھک کاوشوں پر خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ نعت نگاری کے حوالے سے ساغر کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

تخلیق کائنات کا باعث ترا وجود
رونق فزائے عالم امکاں ہے تیرا نام
تاریکیوں میں نور کی قندیل تیریاد
ظلمت کدے میں سرو چراغاں ہے تیرانام(27)

طاہر شادانی کی شاعری کا بیشتر حصہ نعت گوئی پر مشتمل ہے۔ شادانی نے حالی کی طرح نعت کو مقصدی رنگ دیا ہے۔ انھوں نے عصری مسائل کو نعت میں بیان کر کے اور حضورؐ کی اُمت کی زبوں حالی سے بے چین ہو کر اصلاح حال کی التجا پیش کرنے کی بھرپور کوشش کیہے :

پھر آپؐ کی اُمت پہ مصائب کی ہے یورش
پھر دشمنِ جاں اس کی ہوئی گردش دوراں
دیکھی نہیں جاتی ہے زبوں حالی اُمت
ہو اس پہ نگاہ کرم اے رحمت یزداں(28)

شادانی نے اپنی نعتیہ شاعری میں حالی کے اشعار کے مصرعوں کو تضمین کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے:

طوفانِ حوادث میں گھرا ہے یہ سفینہ
فریاد ہے اے کشتی امت کے نگہباں(29)
اے خاصۂ خاصانِ رسل وقت دعا ہے
سنگینی حالات سے دل ڈوب رہا ہے(30)

شادانی کی نعت نگاری میں عشق رسولؐ کا جذبہ جگہ جگہ دکھائی دیتا ہے۔ وہ عشق رسول

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خون رگ جاں میں شامل کر لیتے ہیں۔ اور عاشق رسول بن جاتے ہی۔ ایک عاشق کے لیے اپنے محبوب کیبا دمیں ہی ایسی چیز ہوتی ہے۔ جس میں وہ سکون محسوس کرتا ہے:

یاد آپؐ کی مرے لیے وجہ قرار جاں
میرا سکون دل مری سرکار آپؐ ہیں(31)

طاہر شادانی کی نعت میں عشق رسولؐ کے جذبے کے بارے میں حفیظ صدیقی رقم طراز ہیں:

طاہر شادانی کا دل حضورؐ سے محبت وعقیدت سے معمور ہے وہ اس محبت کا اظہار جگہ جگہ کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنے دل میں حضورؐ کی محبت کے چراغ روشن کر رکھے ہیں اور اس سعادت کے عطا ہونے کے لیے بھی آپ کے ممنون احسان رہتے ہیں۔(32)

شادانی کی نعتوں میں زبان و بیان کا پختہ شعور ملتا ہے۔ انھیں زبان پر اتنا شعور حاصل ہے کہ ان کا ہر شعر زبان و بیان کے استعمال کا عمدہ نمونہ ہے۔

اس حوالے سے جعفر بلوچ لکھتے ہیں:

انھیں زبان و بیان کے مختلف اسالیب پر اطمینان بخش عبور حاصل ہے۔(33)

ڈاکٹر انور سدید شادانی کی الفاظ پر قدرت رکھنے کا اعتراف اس طرح کرتے ہیں:

سیارہ کے وسیلے سے میں نے ان کی شاعری کے سب رنگ دیکھے ہیں اور ان سے یوں فیض اُٹھایا ہے کہ جب کسی لفظ کے استعمال پر شک پیدا ہوا تو میں نے شادانی صاحب کے کلام سے راہنمائی حاصل کی وہ میری ہر مشکل میں کام آئے۔ انھوں نے ہر مرحلے پر میری دستگیری کی۔(34)

سعیدہ صبا سیالکوٹی نے بھی حضورؐ سے سچی محبت کی وجہ سے متعدد نعتیں لکھیں۔ ایک وقت ایسا تھا جب ان کا مقصود شاعری سے کہیں زیادہ مدحتِ رسول عربیؐ تھا۔

ان کی شاعری کے بارے میں احسان اللہ ثاقب رقم طراز ہیں:

آپ اپنے منفرد اسلوب میں الفاظ کا جادو جگاتی ہیں اور مشکل سے مشکل مضامین کو بھی آسانی سے ادا کرنے کی مہارت رکھتی ہیں۔ حمد، مناجات، نعت، سلام، قومی واقعات اور گھریلو تقریبات آپ کے دل پسند موضوعات سخن ہیں۔ صبا کی شاعری رضائے الٰہی کے حصول، رسولؐ خدا کی خوشنودی، ملی احساس اور معاشرتی فلاح و بہبود کے جذبات سے لبریز ہے۔(35)

صبا کا نعتیہ کلام ان کے دل سے نکلی ہوئی آواز ہے۔ انھوں نے آیات قرآنی کا سلیس اور سادہ زبان میں منظوم ترجمہ بھی کیا ہے۔ وہ قرآن اور خالق قرآن سے محبت کرتی ہیں۔ وہ عشقِ رسولؐ کا مجسمہ ہیں۔ وہ اس بات کا شعور رکھتی ہیں کہ روح کے سکون کے لیے عشقِ حقیقی اور عشقِ رسولؐ کا ہونا ضروری ہے کچھ نعتیہ اشعار ملاحظہ ہوں:

وہ دل جو دور ہیں تجھ سے ترے قریب نہیں
کہیں بھی ان کو حقیقی خوشی نصیب نہیں
تمہارے چاہنے والے اک ایک سے بڑھ کر
کمال یہ ہے کہ کسی کا کوئی رقیب نہیں(36)

آسی ضیائی رامپوری نے اعلیٰ پائے کی نعت گوئی کی ہے۔ ان کی نعتیہ نظموں میں منفرد اسلوب اظہار، ندرت بیان اور فکری و جذباتی اپیل پائی جاتی ہے۔ ایک سچے عاشق رسولؐ ہونے کے ناطے آپ کی تب و تاب اور سوز و ساز سے ہم سب کے لیے عمل کا پیغام ہے۔ آپ کی تین نعتیہ نظمیں معذرت نعت، دکھائی اور احتجاج بڑی شہرت کی حامل ہیں۔ آسی محبت کے ساتھ اطاعت رسولؐ کے قائل ہیں کیونکہ اطاعت کے بغیر محبت کی کوئی حقیقت نہیں:

نعت گو کے لیے لازم ہے محبت اُنؐ کی
اور معیارِ محبت ہے اطاعت اُنؐ کی
جان سے بڑھ کر عزیز اس کو ہو سنت اُنؐ کی
روح تا جسم پہ چلتی ہو حکومت اُنؐ کی
یوں سدا اُنؐ کی رضا جوئی کو بے تاب رہے
جیسے پانی کے لیے ماہی بے آب رہے(37)

اصغر سودائی نے غزل گوئی اور نظم گوئی کے ساتھ ساتھ کافی تعداد میں نعتیں بھی لکھی ہیں۔ وہ اردو شاعری میں بطور نعت گو ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔ ان کا نعتیہ مجموعہ ''شہِ دوسرا'' تعجب انگیز اور تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ اصغر سودائی نے نعت کہنے کے لیے غزل کا پیرایہ استعمال کیا ہے۔ ان کی نعت گوئی میں ملی درد جھلکتا ہے۔ ان کے لیے معاشرتی بگاڑ ناقابل برداشت ہے۔ وہ موجودہ اخلاقی قدروں کی پامالی کی ذمہ داری تعلیمات نبوی سے دوری کو قرار دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں ملت اسلامیہ جس اخلاقی اور تہذیبی زوال سے دوچار ہیں۔ وہ سب آنحضرت کی اتباع

نہ کرنے کے وجہ سے ہے۔انھوں نے اپنی نعتوں سے مسلمانوں کی اصلاح اور تبلیغ کا کام بھی کیا ہے۔ان کی نعت کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ نبی کریم ﷺ کی شخصیت کے جلال و جمال اور سیرت مطہرہ کے بیان کے ساتھ ساتھ ان کے الہامی پیغام درخشاں تعلیمات کو بھی شامل کرتے چلے جاتے ہیں۔نعت کے لیے پہلی اور بنیادی شرط یہ ہے کہ حضورؐ کے ساتھ والہانہ محبت ہو۔اصغر سودائی نبی اکرمؐ کے ساتھ ہر سچے مسلمان کی طرح غیر معمولی محبت رکھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کی نعتوں میں والہیت اور سپردگی بدرجہ اتم موجود ہے۔چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ازل کے نور کی تابندگی حسن بدن میں ہے
ابد کے ساز کی آواز ان کے ہر سخن میں ہے
جھلک شاید کہیں دیکھ لی جاتی ہے تجلی کی
کہ بے چینی ہے سورج میں تو بے تابی کرن میں ہے(38)

اصغر کی نعت میں انفرادیت یہ ہے کہ انھوں نے نعت کو وصف رسولؐ کے ساتھ ساتھ تاریخ وعمرانیات سے بھی ہم آہنگ کر دیا ہے۔عربی زبان سے بھی انھیں شغف ہے۔عربی الفاظ اور بعض جگہوں پر انھوں نے پورے مصرعے عربی میں استعمال کیے ہیں۔ڈاکٹر تحسین فراقی سودائی کی اس خصوصیت کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> ان کی نعت کا اہم پہلو یہ ہے کہ انھیں زبان و بیان پر بڑی قدرت حاصل ہے۔چند مقامات پر انھوں نے بعض قرآنی آیات ان کے معنی ومفاہیم کو بڑے فنکارانہ انداز میں اپنی نعت میں سمویا ہے۔اس قدرت کلام نے ان کی نعت کو اردو کی نعتیہ شاعری میں ایک ممتاز مقام بخشا ہے۔(39)

اصغر سودائی کے اسلوب نعت میں عربی لفظوں اور آیتوں کے ساتھ ساتھ تلمیحات اور حوالے بھی بڑی تعداد میں موجود ہیں۔تاریخی قدیم قصوں کے بیان میں اصغر ان افراد کا بھی ذکر کرتے ہیں۔جن کا آپ کی حیات مبارکہ سے کسی نہ کسی حوالے سے تعلق بنتا ہے۔ان کی نعتوں کا ایک اہم عنصر ان کی تراکیب بھی ہیں۔جن کا انھوں نے بہت استعمال کیا ہے۔یہ ترکیبیں ان کے کلام میں پھولوں کی طرح بکھری ہیں۔

آثم فردوسی کی شاعری میں بھی نعتیہ عناصر بدرجہ اتم موجود ہیں۔ان کے چار شعری مجموعے نعت نگاری پر مشتمل ہیں۔آثم فردوسی نے اپنے ادبی سفر میں بچوں کے لیے شاعری کی، پھر

غزل کی وادیوں میں گھومتے رہے۔کبھی کبھار حمد و نعت بھی کہہ لیتے لیکن پھر ایک ایسا وقت بھی آیا جب ان کی طبیعت نعت مصطفیٰؐ پر یکسو ہوگئی اور غزل سے ان کی رغبت نہ ہونے کے برابر رہ گئی۔ان کی نعتیہ شعری مجموعے ''مہمان معلیٰؐ'' سے ''عرشِ رسا'' تک پہنچتے پہنچتے ان کی عقیدت شیفتگی بہت گہری ہو جاتی ہے۔پھر ان کی تمام تر عقیدتیں عمل میں ڈھلتی نظر آتی ہیں۔وہ اللہ تعالیٰ کے بعد حضرت محمدؐ کی ذات کے معتقد ہیں۔وہ حضورؐ کو اپنا راہبر اور راہنما تصور کرتے ہیں۔ان کے نزدیک حضورؐ کی ذات ساری انسانیت کی محسن ہستی ہیں کیونکہ انھوں نے انسان کو دنیا میں اعلیٰ مقام پر فائز کیا۔انھوں نے انسان کو دنیا میں مساوات اور انصاف جیسے حقوق بھی عطا کیے۔کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

کب تک میں خواہشوں کے قفس میں پڑا رہوں
اپنا اسیر کر کے مجھے بھی رہائی دے
نقش ہو جائے اگر اسمِ نبیؐ ہر سانس پر
دل مرا روشن رہے چہرہ مرا روشن رہے(40)
محمدؐ کے نقوش پا کے صدقے
سفر دنیا کا آسان ہو گیا(41)

نعت کے توسط سے آثم مرزا عشق و سرمستی کی کیفیات رقم کرتا ہے۔نعت اس کا اظہار فن بھی ہے اور سرمایہ حیات بھی، نمود عجز بھی ہے اور افتخار عشق بھی، آثم مرزا نے بھی اس قافلے میں شامل ہو کر گدائے مصطفیٰؐ بننے کا شرف حاصل کیا ہے۔آثم نے نعت کے لیے بھی آزاد نظم کا اسلوب اپنایا ہے۔حضورؐ سے عقیدت و محبت کا اظہار ملاحظہ کیجیے کہ شاعری نعت رسول کہنے کی خواہش رکھتے ہوئے لکھتے وقت کس طرح اپنے آپ کو بے بس محسوس کر رہا ہے اور کس طرح اس ادراک کا حوالہ دے رہا ہے کہ انسان مدح رسولؐ کر ہی نہیں سکتا۔چند نعتیہ اشعار ملاحظہ ہوں:

میں اک قطرہ
وہ بحر بیکراں سے بھی فزوں تر ہیں
وہ تخلیق جہاں کے مقصد اعلیٰ کا ہیں شفاف آئینہ
مرے سرکار کا رُتبہ
بیاں ہو کس طرح مجھ سے(42)

حضورؐ کی سیرت کی جھلکیاں آپ کی نعتیہ نظموں میں بھی ہیں اور ان نظموں میں بھی ہیں

جو میلاد النبیؐ کے حوالے سے لکھی گئی ہیں۔ انھوں نے جگہ جگہ حضورؐ کی اس دنیا میں تشریف آوری کو انسانیت کو صدیوں کے جبر و استبداد کے چنگل سے نکلنے کی بشارت اور گرداب کے تھپیڑوں کی ماری ہوئی قوم کے لیے زندگی کی نوید قرار دیا ہے۔ کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

یہ آج کا دن
وہ دن ہے یارو
غلام صدیوں کے جبر کی تیرہ دستیوں سے
نجات پا کر
بنے تھے سردار لشکروں کے
بھڑک رہی تھی جو آگ نفرت کے معبدوں میں
وہ آج کے دن بنی تھی گلزار کامرانی
جہان کہنہ کی ظلمتوں کے مہیب زنداں کی سرحدوں سے
بلکتی انسانیت کو پھر سے اماں ملی تھی (43)

نعت نگاری بھی حفیظ صدیقی کی شاعری کا ایک بہت بڑا موضوع ہے۔ ان کے چار شعری مجموعے نعت گوئی پر مشتمل ہیں۔ حفیظ صدیقی کے نعتیہ کلام میں ہیئتی اعتبار سے تنوع پایا جاتا ہے۔ ابتدائی مجموعہ ''لازوال'' غزل کی ہیئت، دوسرا مجموعہ ''لامثال'' غزل اور آزاد نظم کی ہیئت میں تیسرا مجموعہ ''لافانی'' فردیات اور چوتھا نعتیہ مجموعہ ''لاثانی'' یک مصرعی نظموں کی صورت میں لکھا ہے۔ نعت گوئی کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے قرآنی افکار، احادیث اور سیرت النبیؐ سے روشناس ہونا بہت ضروری ہے تاکہ معلومات میں کوئی ابہام نہ رہے۔ حفیظ صدیقی کے کلام میں یہ تمام عناصر بدرجہ اتم موجود ہیں۔ خدا اور رسولؐ سے جو محبت ان کے دل میں اُمڈتی ہے۔ وہ اسے الفاظ کی صورت میں عطا کر کے کاغذ پر اتار دیتے ہیں۔ اسی وجہ سے ان کے کلام میں صداقت اور تاثیر ہے۔ علاوہ ازیں ان کی نعتوں میں محبت، عقیدت، خلوص اور تخیل کی بلندی بھی پائی جاتی ہے:

کبھی نہ آیا جگ میں کوئی تیرےؐ جیسا
صورت میں بے مثل تو سیرت میں بھیکتا
نہیں ہے کوئی جہاں میں جو تیرےؐ جیسا ہو
زمانے بھر میں نہیں کوئی بھی مثال تریؐ

شعر کہنے کا ہُنر اس نے دیا جو مجھ کو
کام لیتا تھا محمدؐ کی ثنا خوانی کا(44)

حفیظ الرحمٰن احسن کو بھی نعتیہ شاعری سے خاص شغف ہے۔انہوں نے نعتیہ شاعری زیادہ تر غزل کی ہیئت میں کی ہے۔ان کے چند نعتیہ اشعار ملاحظہ ہوں:

تیریؐ رحمت کا آسرا چاہوں
اور اس کے بعد کیا چاہوں
تیری چوکھٹ پہ جا کے بیٹھ رہوں
قرب کا تیرے سلسلہ چاہوں(45)

رشید آفریں نے بھی نعتیہ اشعار کہے ہیں۔نعت ان کا محبوب موضوع ہے۔فخر دو عالم ﷺ ان کا باقاعدہ شعری مجموعہ ہے۔جس میں رشید آفریں کی حضور ﷺ سے محبت دیکھی جا سکتی ہے۔ان کے نظمیہ اور غزلیہ شعری مجموعوں میں بھی نعتیہ کلام موجود ہے۔جب ہم رشید کی نعتیہ شاعری کا جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ رشید کی جدید نعت جدید شعور سے بہرہ ور ہے۔رشید کی نعت کی اس کیفیت کا نمونہ کچھ اشعار میں ملاحظہ ہو:

دل میں ہے موجزن شہِ کونینؐ کی ولا
جچتا نہیں نگاہ میں کوئی بھی کج کلاہ
مدحت سے آپؐ کی ملا مجھ کو وہ حوصلہ
آسان ہوا ہے جس سے ہر دشوار مرحلہ(46)

اطہر سلیمی کی شاعری کا اہم موضوع بھی نعت گوئی ہے۔ان کی غزلوں اور نظموں میں متعدد نعتیہ اشعار دیکھے جا سکتے ہیں جو نعت نگاری اور عشقِ رسول ﷺ کا بہترین نمونہ ہیں۔کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

دل کو خیالِ گلشنِ بطحا ہے آج کل
پیش نظر ہے حضورؐ کا روضہ ہے آج کل
ہر گام مل رہی ہے نئی زندگی مجھے
ہر پل خیالِ گنبدِ خضرا ہے آج کل (47)

اکرام سانبوی کے ہاں بھی عشق رسول ﷺ کے عناصر موجود ہیں۔اکرام ایک سچے

اور کھرے عاشق رسول ﷺ ہیں۔ان کی نظموں اور غزلوں میں بھی نعتیہ شاعری جابجا ملتی ہے۔انہوں نے بہت سی نعتیہ نظمیں بھی تخلیق کی ہیں۔جن میں حضرت محمد ﷺ کے عشق میں بھیگے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔چند اشعار ملاحظہ ہوں:

شاہِؐ شاہانِ اُمم نورِ ازل کی قندیل
تیرا ہر تار نفس ذاتِ احد کی دلیل
تیرا اِک ایک عمل تابع فرمانِ خدا
تیرا اِک ایک قدم جنبشِ بالِ جبریلؑ
ناصیہ سا تیرے در پہ ہوں اٹھا لیجئے مجھے
میں ہوں اکرام تیرا ،تو میرا آقا وکفیل(48)

اسلم ملک کے شعری مجموعوں میں بھی نعتیہ شاعری کے عناصر دیکھے جا سکتے ہیں۔ حضور ﷺ کی ذات اوران کی صفات سے عشق ومحبت اسلم ملک کی شاعری کا مرکزی موضوع ہے۔عشقِ رسول ﷺ کی موجزن لہریں جابجاان کی نعتیہ شاعری میں نظر آتی ہیں۔کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

شہِ دوجہاں کا کرم چاہتا ہوں
سفر اپنا سوئے حرم چاہتا ہوں
دیا ان کا روشن رہے تاکہ دل پر
میں الفت میں ان کا بھرم چاہتا ہوں(49)

شاہد شاذ کی غزلوں اور نظموں میں بھی نعت اور عشقِ رسول ﷺ کے موضوعات دیکھے جاسکتے ہیں۔چند اشعار ملاحظہ ہوں:

جب سے تیریؐ نعت میں لفظ میں نے لکھے ہیں
تب سے یہ حرف سیاہ پُرنور ہوتے جاتے ہیں(50)

صدارتی ایوارڈ یافتہ نعت گو شاعر ریاض حسین چودھری دس نعتیہ شعری مجموعوں کے خالق ہیں۔ان کا شمار ان بلند ذکر شعرا میں ہوتا ہے جن کا آغاز غزل سے ہوا مگر جب نعت کے چمن زاروں میں پہنچے تو نعت کی صورت میں اپنے عہد کو معتبر کر گئے۔ان کی نعت کے تمام استعاروں کا خمیر دین وآئینِ رسالتؐ کے ساتھ ساتھ عہد جدید کے معتبر حوالوں سے اٹھا ہے اور

ان میں تقدس اور تازہ کاری بھی ہے۔انہوں نے نعتیہ شاعری کو آزاد اور پابند نظموں کے وسیع امکانات کے ذریعے نئے آفاق دکھائے ہیں اور غزلیہ انداز کی نعتوں کو جدید اسالیب سے ہم آہنگ کر کے نیا وقار عطا کیا ہے۔ریاض کی نعت گوئی میں استغاثے کا انداز نمایاں ہے۔وہ اپنے انفرادی اور اجتماعی دکھ حضور ﷺ کی عدالتِ عظمیٰ میں پیش کر کے نظرِ کرم کا ملتجی ہے۔ریاض کا اسلوب اردو شاعری میں تمام تر جمالیات سے مستیّز ہے اور اسے جدت و شائستگی کا معیار قرار دیا جا سکتا ہے۔ان کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

مرنے کے بعد بھی ہے عشقِ نبیؐ کا موسم
مری لحد میں اترے یہ روشنی کا موسم(51)

میں ہر ساعت کے ہونٹوں پر گلابِ نعت رکھتا ہوں
بہارِ جاوداں میرے مقدر میں ثنا لکھے(52)

چھپا کر آپؐ کا اسمِ گرامی اپنے سینے میں
میں شہرِ ہجر میں ہوں اور رہتا ہوں مدینے میں(53)

میں اجالوں کا مسافر ہوں کہاں جاؤں حضورؐ
ہر طرف دیوارِ شب ہے راستہ کوئی نہیں

رستہ کسی سے پوچھنا توہین ہے مری
ہر راہ گزر شہرِ پیمبرؐ کو جائے ہے(54)

حواشی و حوالہ جات

1 ڈاکٹر محمد اقبال،کلیاتِ اقبال،اقبال اکادمی پاکستان،لاہور،2001ء،ص۔237
2 ایضاً،ص۔8
3 ایضاً،ص۔233
4 ایضاً،ارمغانِ حجاز،ص۔62
5 ڈاکٹر محمد اقبال،کلیاتِ اقبال(فارسی)،شیخ غلام علی اینڈ سنز،لاہور،1990ء،ص۔32
6 ایضاً،اسرار و رموز،ص۔19
7 ایضاً،،پس چہ باید کرد،ص۔68
8 ایضاً،ارمغانِ حجاز،ص۔65
9 ایضاً ضربِ کلیم،ص۔68،69

10 ایضاً، جاوید نامہ، ص۔128
11 مولوی فیروز الدین (1824۔1907) کا عرصہ حیات انیسویں صدی عیسوی کے نصف آخر اور بیسویں صدی کے پہلے عشرے پر مشتمل ہے۔ آپ سیالکوٹ کی تحصیل ڈسکہ میں پیدا ہوئے۔ وہ بیک وقت مفسر قرآن مجید، قواعد نویس، لغات نویس، سیرت و سوانح نگار، معلم، مذہبی عالم، ماہر تقابل ادیان، نعت گو شاعر، اردو اور پنجابی کے قادر الکلام شاعر تھے۔ مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ کیجیے: پنجاب ٹیچر گزٹیئر 1905، سیریل نمبر 2414
12 مولوی فیروز الدین، پیارے نبیؐ کے پیارے حالات، جلد دوم، مفید عام پریس سیالکوٹ، باراول، 1318ھ، ص۔1
13 رسالہ انجمن حمایتِ اسلام، جون 1894ء، ص۔6
14 ظفر علی خان، کلیات ظفر علی خان (بہارستان)، الفیصل ناشران، لاہور، 2007ء، ص۔24
15 ایضاً، ص۔13
16 مولانا ظفر علی خان، بہارستان، مولانا ظفر علی خان ٹرسٹ، لاہور، 2008ء، ص۔23
17 حکیم عبدالنبی شجر طہرانی، نطق مدحت، منہاج پرنٹنگ پریس، لاہور، 2018ء، ص، 23
18 ایضاً، ص، 26
19 ایضاً، ص، 27
20 امین حزیں، سرورِ سرمدی، الفیصل ناشران وتاجران، لاہور، 2006ء، ص۔32
21 صادق حسین، برگ سبز، لاہور 1977ء، ص۔11۔12
22 ایضاً، ص۔8
23 اثر صہبائی، بحضور سرورِ کائنات ﷺ، انجمن حمایتِ اسلام، لاہور، س۔ن، ص۔35
24 ایضاً، ص۔39
25 مضطر نظامی، مسودہ نقش حیات، ص۔182
26 ایضاً، ص۔187
27 ساغر جعفری، جامِ مودت، اردو ادب اکیڈمی، سیالکوٹ، 1997ء، ص۔36
28 طاہر شادانی، شعلہ نمناک، ایوانِ ادب، لاہور، 2000ء، ص۔48
29 ایضاً، ص۔48
30 ایضاً، ص۔49
31 ایضاً، ص۔40
32 پروفیسر حفیظ صدیقی، "طاہر شادانی کی نعتیہ شاعری" مشمولہ "تحریریں"، نعت نمبر، 17، اگست 1997ء، ص۔41
33 جعفر بلوچ، "شادانی اور ان کا کلام" مشمولہ، "شعلہ نمناک" ص۔44
34 ڈاکٹر انور سدید، "ارضِ سدید" مشمولہ، "شعلہ نمناک" ص۔16

35 احسان اللہ ثاقب، "پاکیزہ افکار کا آفتاب"، مشمولہ، "گلدستہ صبا"، از سعیدہ صبا سیالکوٹی، لاہور، 1996ء، ص۔12
36 سعیدہ صبا سیالکوٹی، "گلدستہ صبا"، ص۔35
37 آسی ضیائی رامپوری، مشمولہ "ماہنامہ صبح نو"، لاہور، جولائی 1969ء، ص۔18
38 اصغر سودائی، شہ دوسرا، بزم رومی و اقبال، سیالکوٹ، 1989ء، ص۔15
39 تحسین فراقی، "اصغر سودائی کی نعت گوئی"، مشمولہ، "شہِ دوسرا"، ص۔5
40 آثم فردوسی، "عرش رسا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم"، حلقہ حروفِ ارباب، لاہور، 1996ء، ص۔31، 32
41 ایضاً، ص۔48
42 آثم مرزا، "نعت"، مشمولہ، "ماہنامہ اظہار"، کراچی شمارہ جولائی 1983ء، ص۔4
43 آثم مرزا، "نعت"، مشمولہ، "روزنامہ جسارت"، کراچی، 31 جنوری 1988ء، ص۔5
44 حفیظ صدیقی، "لافانی"، (مسودہ)، ص۔42
45 حفیظ الرحمٰن احسن، "موجِ سلسبیل"، (مسودہ)، ص۔19
46 رشید آفریں، دامنِ احسان، الرزاق پبلی کیشنز، لاہور، 2009ء، ص۔25
47 اطہر سلیمی، "مسودہ نمبر 1"، ص۔75
48 اکرام سانبوی، "مسودہ نمبر 1"، ص، 88
49 اسلم ملک، خواب اور خوشبو، اکبر امین پریس، لاہور، س۔ن، ص۔49
50 شاہد شاذ، "مسودہ نمبر 1"، ص۔10
51 ریاض حسین چودھری، خلدِ سخن، القمر انٹر پرائزز، لاہور، 2009ء، ص۔141
52 ایضاً، ص۔138
53 ایضاً، ص۔148
54 ریاض حسین چودھری، "زرِ معتبر"، خزینہ علم و ادب، لاہور، 2000ء، ص۔59